علما اور دینی مدارِس

دورِ جدید کے چیلنجز اور امکانات

مولانا وحید الدّین خاں

علما اور دینی مدارس

دورِ جدید کے چیلنجز اور امکانات

مولانا وحید الدین خاں

First Published 2026
This book is copyright free.

Ulama aur Deeni Madaris:
Daur-e-jadeed ke challenges aur imkanaat
By Maulana Wahiduddin Khan

Compiled by:
Dr. Farida Khanam
Maulana Farhad Ahmad
Maulana Syed Iqbal Ahmed Umari

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301
Delhi NCR, India
e-mail: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Centre for Peace and Spirituality International
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
e-mail : info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Centre for Peace and Spirituality USA
391 Totten Pond Road,
Suite 402, Waltham Ma 02451, USA
Mob. +1 617 960 7156
e-mail : info@cpsglobal.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

تمہید	6	صدیقی اسپرٹ	33
علم اور علما		حقیقی عالم	35
		تعلیم کی اہمیت	36
علم کی اہمیت	12	اسلامی تحریک کا ہدف	37
علم	13	پہلا اسکول	38
علم کا مقصد	14	مدرسہ کے طلبہ کے نام	39
علم اور تقویٰ	15	دین کی عصری تفہیم	41
صحابہ کا علم	16	بصیرِ زمانہ	42
علما کا مقام	17	ایک نوجوان عالم دین کا تجربہ	43
علم کا اٹھ جانا	18	تعارف اسلام	43
علما کم، خطبا زیادہ	19	عصر حاضر میں تعمیری کام	45
سائنٹفک مزاج	20	مسلّمہ دلیل	47
صلحائے امت	22	عصری اسلوب کی اہمیت	48
ٹیم کے ذریعے مدد	23	عظیم انقلابی رہنمائی	48
عالم کی صفت	24	شعوری ایمان	49
ذہین لوگوں کا قبرستان	25	آج کی نوجوان نسلیں	51
ذہنی ارتقا کی اہمیت	26	کرنے کا کام	52
مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت	27	مخالفت یا غلط فہمی	52
دور صحابہ کے طرز کے مدرسے	28	جدید افکار اور مسلم علما	54
نائبِ رسول	31	جمہوریت کا دور	55
ہم کہاں ہیں	31	نقصان در نقصان	56

ٹیم ورک کی اہمیت 58
جاننا کافی نہیں 60
اختلاف کو نظر انداز کیجیے 62
غلط معیارِ حق 65
اسٹیج کا فتنہ 66
زیادہ بڑی طاقت 67
فتووں کی شریعت 68
تنگ ذہنی نہیں 69
دو آپشن کے درمیان 70
اصلاحِ نصاب، یا اصلاحِ ماحول 71
مدرسہ کلچر 73
دینی مدارس 74
ہر چیز ایک پروفیشن 75
ذہنی جمود کا نقصان 76
دو دنیاؤں کا فرق 77
موجودہ دینی مدارس 80
ہمارے مدارس 81
ایک سبق آموز واقعہ 82
اعتراف 83
فرد کی اصلاح 84
اسلامی تربیت 85
جائز حدود کے اندر 86
نقصان میں فائدہ 87
ایک لفظ کا فرق 88
ایک نوجوان عالم دین کو نصیحت 89
تربیتِ شعور 90
مثبت لٹریچر کی ضرورت 90
سیکھنے کی اہمیت 92
جانا ہے بہت دور 93
امام ابوحنیفہ کا معاشی مسلک 95
ناموافق حالات ترقی کا زینہ بن گئے 95
یہ احترام نہیں، ناقدری ہے 97
تعمیر شعور 98
ناکامی کا سبب 99
دعوتی ذہن 99
ایک عالم دین کی قربانی 100
صحیح سبق 101
شکر کا موقع 103
داعی نہ کہ ادیب 104
میں پڑھ کر پڑھاؤں گا 105
ایک کردار ادا کرنے کے لیے 106
عزم و استقلال 107
مثبت اثر لینا 108
سچائی کی فتح 109
’انا‘ کی دیوار 112
ایک تجربہ 113
امام کبھی جھوٹ نہیں بولتا 116
امن کا فائدہ 117
دار العلوم دیوبند کا ایک واقعہ 117
دینی درسگاہ 119
عقل کی آنکھ سے 120
موت کے عقیدے نے زندگی دے دی 121

تعصب کی حد 123
علم کا حصول 124
شبلی اور علی گڑھ 125
اقرب الاسلام 142
ذہاب العلما 143
فقہ کا مطلب 146
رجل موھوب 147
ایک قابل تقلید مثال 150
زندگی کا ایک اصول 151
ایک سبق آموز واقعہ 152
مجھے آخر تک جانا ہے 153
کامیابی بھی ناکامی ہوسکتی ہے! 154
زمانے سے بے خبری 155
تعلیمی پیغام 156
پیغام 157
اسلام کا نیا دور 158

اسفارِ مدارس

اعظم گڑھ کا سفر 160
دارالعلوم دیوبند کا سفر 180
دشمنی یا چیلنج 184
ایک طالبِ علم کو نصیحت 185
ترقی کا زینہ 185
مدرسہ قادریہ کا سفر 186
استقلال کا کرشمہ 212
جامعہ دارالسلام کا سفر 213
اسلامی تمنا 254
مدرسہ صدیقیہ کا سفر 255
اسلام کی خدمت 261
ایک ہفتہ بہار میں 262
اتھم گیت 286
ایک سفر (کلکتہ) 287
مزاج کا فرق 290
الجامعۃ الاسلامیۃ 291
ریاض 302
المعہد العالی الاسلامی 309
اختلاف ایک علمی روش 311
ایک سفر (راجستھان) 312
ذہنی صلاحیت 315

انٹرویو، سوال و جواب

مطالعہ کے بغیر انسانی شخصیت کی تکمیل ممکن نہیں 318
ایک انٹرویو 323
فقہا کون ہیں 333
ایک ملاقات 334
الحادی فکر اور اسلام 341
سوال و جواب 349

خاتمہ

جدید انسان کی تلاش 370
اصل کام 372
اعلائے کلمۃ الاسلام 377

تمہید

پہلی بار جب میں ایک بڑے مدرسہ میں گیا تو اس کو دیکھ کر اچانک میری زبان سے نکلا مدینۃ العلم (علم کا شہر)۔ ہر مدرسہ گویا علم کا ایک شہر ہے، اس واحد فرق کے ساتھ کہ ان میں سے کوئی بڑا شہر ہے اور کوئی چھوٹا شہر۔

دور اوّل میں جب مسلمان مختلف ملکوں میں پھیلے تو ہر جگہ انہوں نے اس قسم کے علمی شہر قائم کیے۔ یہ تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔ قدیم زمانے میں عمارت کے نام سے یا تو بڑے بڑے عبادت خانے (temples) بنائے جاتے تھے یا محل اور قلعے اور مقبرے۔ جدید معنوں میں تعلیم گاہیں بنانے کا کوئی رواج ہی قدیم زمانے میں نہ تھا۔ ایک مغربی محقق نے بجا طور پر لکھا ہے کہ صد فی صد تعلیم (hundred percent literacy) کا تصور پہلی بار مسلمانوں نے تاریخ میں پیدا کیا۔

مسلمانوں کے اندر یہ علمی مزاج کہاں سے آیا۔ یہ براہ راست قرآن کا نتیجہ تھا۔ قرآن کو کھلے ذہن کے ساتھ پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن میں سب سے زیادہ زور علم اور تعلیم وتعلّم پر دیا گیا ہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن پہلی کتاب ہے جس نے علم کو محدود دائرہ سے نکالا اور تاریخ انسانی کو عمومی تعلیم (mass education) کے تصور سے آشنا کیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ 570ء میں عرب کے شہر مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ پر پہلی وحی 610ء میں اتری جب کہ آپ غار حرا میں تھے۔ وحی کا پہلا لفظ یہ تھا: اقرأ (پڑھو)۔ روایات میں آتا ہے کہ خدا کے فرشتہ جبریل نے آپ کے پاس آ کر کہا کہ اقرأ (پڑھو) آپ نے فرمایا کہ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ (مجھے پڑھنا نہیں آتا)۔ جبریل نے دوبارہ کہا کہ اقرأ۔ آپ نے فرمایا کہ مَا أَنَا بِقَارِئٍ۔ جبریل نے تیسری بار کہا کہ اقرأ۔ اس کے بعد آپ نے سورۃ العلق کے وہ کلمات اپنی

زبان سے دہرائے جو جبریل پہلی وحی کے طور پر آپ کے پاس لائے تھے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3)۔ ابتدائی وحی کے اس واقعے پر غور کیجیے۔ پیغمبر اسلام ثابت شدہ طور پر ایک اُمّی تھے۔ اس کے باوجود کیوں خدا کا فرشتہ بار بار کہہ رہا ہے کہ اقرأ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پڑھنا نہیں آتا تب بھی پڑھو۔ لکھنا نہیں جانتے تب بھی لکھو۔ اس اعتبار سے اسلامی کلچر گویا اقرأ کلچر کا دوسرا نام ہے۔

یہ ایک انتہائی انقلابی تعلیم تھی جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور بالواسطہ طور پر آپ کے پیروؤں کو آغاز رسالت میں اللہ کی طرف سے ملی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم آپ کے پیروؤں کی سرگرمی کا ایک مستقل حصہ بن گیا۔ پڑھنے اور لکھنے کا رواج اتنا بڑھا کہ وہ وقت آیا جب کہ مسلمان تمام قوموں کے معلم بن گئے۔ اہل اسلام جب عرب سے نکلے اور دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے تو ہر جگہ انہوں نے پڑھنے اور پڑھانے کو اپنا خصوصی مشن بنا لیا۔ یہ لہر مکہ سے اٹھی۔ پھر وہ مدینہ پہنچی۔ اس کے بعد وہ دمشق پہنچی۔ اس کے بعد بغداد اور قاہرہ اس کا مرکز بنا۔ اس کے بعد وہ قرطبہ اور غرناطہ میں داخل ہوئی۔ وہاں سے مزید پھیل کر وہ سارے عالم میں پہنچ گئی۔ اس زمانے میں مسلم دنیا کے تمام شہر تعلیم وتعلّم کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

اہل اسلام کے اس مزاج کا نتیجہ تھا کہ جب ان کے قافلے برصغیر ہند میں داخل ہوئے تو یہاں بھی انہوں نے کثرت سے شخصی اور اجتماعی طور پر مدرسے اور تعلیم گاہیں قائم کیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ برصغیر ہند میں علم کی عمومی اشاعت بھی پہلی بار مسلمانوں کے ذریعہ ہوئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اعتراف کیا ہے کہ عرب مسلمان انڈیا میں ایک شاندار کلچر (brilliant culture) لے کر آئے۔ (ڈسکوری آف انڈیا، 1944، صفحہ 231)

انیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں جب برصغیر ہند میں انگریزوں کا غلبہ بڑھا تو اس کے ساتھ مسلم تعلیم گاہوں کا زوال شروع ہو گیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف ابتدائی سیاسی مزاحمت زیادہ تر علمائے اسلام کی قیادت میں ہوئی تھی۔ اس سے انگریزوں نے یہ

تصور قائم کیا کہ اسلامی مدرسے انگریز مخالف تحریک کے فکری مرکز ہیں۔ چنانچہ وہ مدارس کے دشمن ہو گئے۔ انھوں نے طرح طرح سے مدارس پر روک لگانے کی کوشش کی۔ مثلاً انھوں نے مدارس کی جاگیریں اور اوقاف ضبط کر کے ان کے ذرائع کو مسدود کر دیا۔ بہت سے علما کو گرفتار کر لیا، وغیرہ۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ بڑی تعداد میں اس ملک کے مدارس بند ہو گئے۔

ہندستان میں انگریزوں کے سیاسی قبضے کے بعد ایک عرصہ تک مسلم رہنما یہ سوچتے رہے کہ پہلے انگریزوں کو ملک سے نکالو۔ اس کے بعد ہی اس ملک میں دوبارہ کسی دینی کام کے مواقع نکلیں گے۔ 1857 کا مسلح اقدام اسی طرز فکر کا نتیجہ تھا جو اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اس تجربے کے بعد علما نے محسوس کیا کہ انگریزوں سے مسلح ٹکراؤ عملی طور پر غیر مفید ہے۔ اب واحد قابل عمل صورت یہ ہے کہ جنگ اور ٹکراؤ کو چھوڑ کر پر امن عمل کے میدان میں کوئی تعمیری کام شروع کیا جائے۔ اسلام کی روشنی میں انھیں نظر آیا کہ یہ کام صرف علم اور تعلیم کا کام ہے۔ چنانچہ علما نے یہ فیصلہ کیا کہ انگریزوں سے ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر وہ قوم کو تعلیم یافتہ بنانے میں اپنی ساری طاقت صرف کریں۔

اس نئے ذہن کے تحت انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں پورے برصغیر ہند میں مدارس کی تحریک پھیل گئی۔ داخلی اور خارجی حالات اس کے موافق ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ تحریک مدارس بڑھتے بڑھتے اب تحریک انقلاب کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

میں اپنی ابتدائی عمر ہی سے علما اور تحریک مدارس سے بہت قریب رہا ہوں۔ میرے والد کا انتقال 1929 میں بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اس لیے میرے عم زاد بھائی مولانا اقبال احمد خاں سہیل ایڈوکیٹ، ایم، اے ایل ایل بی ہی گویا میرے خاندانی سرپرست تھے۔ وہ نہایت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ علما کے بہت عقیدت مند تھے۔ انھوں نے مشہور عالم اور بزرگ مولانا حسین احمد مدنی کی تعریف میں ایک نظم لکھی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا:

وارث انبیاء حسین احمد　　　　که بدیں مستشار مؤتمن است

تقسیم ہند سے پہلے کے دور میں دوقومی نظریے کا ہنگامہ اٹھا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اس کا جواب دیتے ہوئے 1937 میں کہا کہ ''فی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں''۔ اس کے ردّ میں علامہ اقبال نے اپنا مشہور فارسی قطعہ لکھا جس کا پہلا شعر یہ تھا:

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد این چہ بوالعجبی است

اس وقت اقبال احمد سہیل ایڈوکیٹ نے فارسی نظم کی صورت میں اس کا مدلل جواب دیا جس کے دو شعر یہ ہیں:

بہ دیو بند گرا، گر نجات می طلبی — کہ دیو نفس سلح شور و دانش توصبی است

بگیر راہ حسین احمد از خدا خواہی — کہ وارث است نبی را وہم زآل نبی است

برادر بزرگ مولانا اقبال احمد سہیل مرحوم سے مجھے زندگی کی پہلی سوچ ملی۔ چنانچہ نوجوانی کی عمر ہی میں علما اور تحریک مدارس سے میرا رشتہ جڑ چکا تھا جو پھر کبھی ختم نہ ہوا۔

مدرسہ کی دنیا سے مسلسل میرا ربط رہا ہے۔ میری تعلیم مدرسہ ہی میں ہوئی۔ مدارس سے وابستہ افراد سے مسلسل میری ملاقاتیں رہی ہیں۔ میں بار بار مدارس کے اجتماعات اور پروگراموں میں شریک ہوتا رہا، وغیرہ۔ اس موضوع پر میری متفرق تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔

وحید الدین خاں

مئی 2000

(دین و شریعت، صفحہ 77-74)

زیر نظر مجموعہ میں مولانا صاحب کے ان مضامین کو شامل کیا گیا ہے جن کو انھوں نے علما اور دینی مدارس کے حوالے سے ماہنامہ الرسالہ، ڈائری اور سفرناموں میں لکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو دعوتی مقصد کے لیے قبول فرمائے۔ (ناشر)

علم اور علما

علم کی اہمیت

علم کی اہمیت کے بارے میں ایک حدیثِ رسول اِن الفاظ میں آئی ہے: مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْإِسْلَامَ، فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّينَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ (سنن الدارمی، حدیث نمبر 366)۔ یعنی، جس شخص پر اِس حال میں موت آئے کہ وہ علم اِس لیے سیکھ رہا ہوتا کہ وہ اُس کے ذریعے اسلام کا احیا کرے، تو جنت میں اُس کے اور پیغمبروں کے درمیان صرف ایک درجے کا فرق ہوگا۔

اِس حدیث کا مطلب بوقتِ مرگ علم سیکھنا نہیں ہے، بلکہ تا دمِ مرگ علم کی طلب میں مشغول رہنا ہے۔ علم کے معاملے میں اصل تفریق علم دین اور علم دنیا کی نہیں، بلکہ یہ فرق نیت کے اعتبار سے ہے۔ دنیا کا علم بھی عین علمِ دین بن سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص نے اگر دین کو اپنا مقصدِ حیات بنالیا ہو، اُس نے پیغمبرانہ مشن کو اپنی زندگی کا نشانہ بنا رکھا ہو تو اس کا ہر علم پیغمبرانہ مشن کے لیے استعمال ہونے لگے گا۔ ہر علم اُس کے یقین میں اضافہ کرے گا اور ہر علم اس کے لیے اس کے مشن کی تقویت کا ذریعہ بن جائے گا۔

علم کی طلب کوئی وقتی چیز نہیں۔ ایک سچا مومن اپنی پوری عمر کے لیے علم کا طالب بن جاتا ہے۔ اگر آدمی کے اندر صحیح معنوں میں علم کا ذوق ہو تو وہ اپنے ہر تجربے میں علم کا رزق پاتا رہے گا۔ وہ کسی کتاب کا مطالعہ کرے گا تو اس کا ذوق کتاب کے ہر مضمون کو اس کے لیے حصولِ علم کا ذریعہ بنا دے گا۔ وہ کسی سے گفتگو کرے گا تو وہ اپنے جذبۂ تعلُّم (spirit of learning) کی بنا پر اُس سے نئی نئی باتیں اخذ کرلے گا۔ وہ کسی چیز کا مشاہدہ کرے گا تو ہر مشاہدے میں وہ اپنے لیے عبرت کا سامان پالے گا، حتیٰ کہ اگر اس کے اندر علمی ذوق بھرپور طور پر زندہ ہو تو وہ اپنے مثبت ذہن کی بنا پر بے علموں سے بھی علم حاصل کرے گا اور بے ادبوں سے بھی وہ ادب کا کوئی پہلو سیکھ لے گا۔ حصولِ علم کے معاملے میں اصل اہمیت ذوق کی ہے، نہ کہ محض واقفیت کی۔

(الرسالہ، مارچ 2014)

علم

الْعلماوَرَثَۃُ الْأَنْبِيَاءِ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 3641)۔ یعنی، علما پیغمبروں کے وارث ہیں۔

اللَّهُمَّ ارْحَمْ خُلَفَائِي قلنا: يا رسولَ اللّٰه، مَن خُلَفاؤك؟ قال: الَّذِينَ يَرْوُونَ أَحَادِيثِي وَسُنَّتِي وَيُعَلِّمُونَهَا النَّاسَ (المحدث الفاصل للرامهرمزی، صفحہ 136)۔ یعنی، اے اللہ، میرے خلفا پر رحم کر۔ صحابہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کون لوگ آپ کے خلفا ہیں۔ آپ نے کہا کہ وہ لوگ جو میری سنت اور میری احادیث کی روایت کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے۔

قَالَ أَبُو الْأسود الدؤَلِي: ليسَ شيءٌ أَعَزُّ من العلْم؛ وذلك أنَّ الملوكَ حُكَّامٌ على النَّاس، والعلماء حُكَّامٌ على الملوكِ (الوافی بالوفیات للصفدی، جلد 16، صفحہ 307)۔ یعنی، علم سے زیادہ طاقت ور کوئی چیز نہیں۔ بادشاہ عوام پر حکومت کرتے ہیں اور علم والے لوگ بادشاہوں پر حکومت کرتے ہیں۔

عَنْ عَوْنِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: قُلْتُ لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ: يُقَالُ: إِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَكُونَ عَالِمًا فَكُنْ عَالِمًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَكُنْ مُتَعَلِّمًا، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ مُتَعَلِّمًا فَأَحِبَّهُمْ، فَإِنْ لَمْ تُحِبَّهُمْ فَلَا تُبْغِضْهُمْ. فَقَالَ عُمَرُ: سُبْحَانَ اللّٰهِ، لَقَدْ جَعَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لَهُ مَخْرَجًا (کتاب العلم لابی خیثمہ، اثر نمبر 2)۔ یعنی، عون بن عبد اللہ نے حضرت عمر بن عبد العزیز سے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم عالم بن سکتے ہو تو بنو۔ اگر عالم نہیں بن سکتے تو طالب علم بنو۔ اگر تم طالب علم نہیں بن سکتے تو ان سے محبت کرو۔ اگر تم ان سے محبت نہیں کر سکتے تو ان سے بغض نہ رکھو۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے یہ سن کر کہا سبحان اللہ۔ اس کو خدا نے راستہ دے دیا۔

علامہ شاطبی نے لکھا ہے — مستحب، مندوب، فرض، اور مکروہ اور حرام کی جو تقسیمیں ہیں، تقرب الی اللہ اور تزکیۂ نفس کے سلسلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ کیوں کہ اصل مقصود تزکیۂ نفس ہے، جو چیز تزکیۂ نفس میں مدد دے وہی اہم ہے، چاہے وہ مستحب ہو یا فرض۔ اور جو

بُرائی کی طرف لے جائے وہ ممنوع ہے، خواہ وہ مکروہ ہو یا حرام۔ (الموافقات للشاطبی، القاہرہ، جلد 3، صفحہ 241)

عَنْ الْحَسَنِ، قَالَ: أَفْضَلُ الْعِلْمِ الْوَرَعُ وَالتَّفَكُّرُ (کتاب العلم لابی خیثمہ، اثر نمبر 119)۔ یعنی، افضل علم پرہیزگاری اور غور وفکر ہے۔ (الرسالہ، جنوری 1986)

علم کا مقصد

افغانستان کے سفر (1988) میں ایک افغانی عالمِ دین سے ملاقات ہوئی۔ ان کی تعلیم پاکستان کے ایک دار العلوم میں ہوئی ہے اور اچھی اردو جانتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں الرسالہ برابر پڑھتا ہوں۔ وہ مجھے پاکستان کے ایک واقف کار کے ذریعہ مل جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ صاحب پورے رسالہ کی فوٹو کاپی کرکے مجھے روانہ کردیتے ہیں۔

انہوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اکتوبر 1988 کے الرسالہ میں زمین سے محروم (صفحہ 3) کے عنوان سے جنرل ضیاء الحق مرحوم پر جو مضمون ہے وہ لاجواب ہے۔ انہوں نے کہا کہ جنرل ضیاء کی موت پر مسلم دنیا کے تقریباً ہر اخبار اور ہر رسالہ نے مضامین شائع کیے ہیں اور ہر رہنما نے اپنے بیانات دیے ہیں، مگر آپ کا مضمون ان سب میں منفرد تھا۔ دوسرے لوگوں نے عام طور پر صرف ضیاء کی تعریف کی ہے، ان کو ہیرو بنایا ہے۔ مگر آپ نے اس سے سبق کا پہلو نکالا ہے۔ اور مؤمن کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ہر واقعے اور ہر حادثے سے عبرت اور نصیحت لے سکے۔

انہوں نے کہا کہ امت پر اس قسم کا سب سے بڑا واقعہ وہ تھا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی۔ اس وقت صحابہ کرام نے ایسا نہیں کیا کہ ہر ایک آپ کی شان میں تعریفی تقریر کرنے لگے اور آپ کو "شہید" یا اسلامی ہیرو ثابت کرنے میں تمام الفاظ صرف کرڈالے۔ اس کے برعکس، انہوں نے اس واقعے سے موت اور آخرت کی یاد حاصل کی۔ حضرت ابوبکر تشریف

لائے اور آپ کی میت کو دیکھا تو قرآن کی یہ آیت پڑھی: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ۔ اسی طرح حضرت عباس نے فرمایا: وَاللّٰهِ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ، لَقَدْ ذَاقَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم الْمَوْتَ۔ مذکورہ عالم نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ اس دور میں الرسالہ سنتِ رسول کو زندہ کر رہا ہے۔ لوگوں کو قومی دین سے نکال کر خداوندی دین پر لا رہا ہے۔ اس وقت اس سے بڑا کوئی کام نہیں۔ (الرسالہ، مارچ 1989)

علم اور تقویٰ

قرآن (2:282) میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور وہ تم کو علم دے گا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ۔ سورۃ الانفال (8:29) میں کہا گیا ہے کہ اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تم کو فرقان عطا فرمائے گا (إِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَاناً)۔ ایک اور جگہ سورۃ الحدید (57:28) میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے ڈرو... وہ تم کو روشنی عطا فرمائے گا جس میں تم چلو گے (اتَّقُوا اللّٰهَ... يَجْعَلْ لَكُمْ نُوراً تَمْشُونَ بِهِ)۔

امام مالک نے امام شافعی سے ان کی جوانی کی عمر میں نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا: إِنِّي أَرَى اللّٰهَ قَدْ أَلْقَى عَلَى قَلْبِكَ نُورًا، فَلَا تُطْفِئْهُ بِظُلْمَةِ الْمَعْصِيَةِ (الجواب الکافی لابن القیم، صفحہ 52)۔ یعنی، میں دیکھتا ہوں کہ اللہ نے تمہارے دل کو روشنی سے بھر دیا ہے تو تم اس کو گناہ کی تاریکی سے نہ بجھاؤ۔

امام شافعی نے اپنے استاد وکیع بن الجراح سے اپنی ایک گفتگو کا ذکر اس طرح کیا ہے:

شَكَوْتُ إِلَى وَكِيعٍ سُوءَ حِفْظِي   فَأَرْشَدَنِي إِلَى تَرْكِ الْمَعَاصِي
وَأَخْبَرَنِي بِأَنَّ الْعِلْمَ نُورٌ   وَنُورُ اللّٰهِ لَا يُهْدَى لِعَاصِي

میں نے اپنے استاد وکیع سے حافظہ کی خرابی کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ گناہوں کو چھوڑ دو اور انہوں نے مجھے بتایا کہ علم روشنی ہے اور اللہ کی روشنی کسی گناہگار کو راستہ نہیں دکھاتی۔

یہاں علم سے مراد معلومات نہیں، معرفت ہے۔ ایک حقیقی معرفت تک پہنچنے کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی کے پاس الفاظ اور معلومات کا ذخیرہ ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اندر صحت فکر ہو۔ اللہ کا ڈر آدمی کے اندر یہی صحت فکر پیدا کرتا ہے۔ آدمی جتنا زیادہ سنجیدہ ہو اتنا ہی زیادہ اس کے اندر صحت فکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ اللہ کا ڈر آدمی کو سب سے زیادہ سنجیدہ بناتا ہے، اس لیے اللہ کا ڈر آدمی کو سب سے زیادہ اس قابل بناتا ہے کہ وہ صحیح اور درست طریقہ پر سوچ سکے۔

اللہ کا ڈر آدمی کے الفاظ اور معلومات کے لیے ایسا ہی ہے جیسے سانچہ خام اشیا کے لیے۔ سانچہ خام اشیاء کو بامعنی صورت میں تبدیل کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ کا ڈر الفاظ اور معلومات کو معرفت میں ڈھال دیتا ہے — کچھ علوم انسانی مدرسہ میں پڑھائے جاتے ہیں اور کچھ علوم خدا کے مدرسہ میں۔ (الرسالہ، اکتوبر 1984)

صحابہ کا علم

صحابہ کرام کے اقوال جو کتابوں میں آئے ہیں، وہ حد درجہ حکمت کی باتیں ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے کسی بھی صحابی نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ پھر یہ علم ان کے اندر کہاں سے آیا۔ یہ علم ان کے اندر تقویٰ نے پیدا کیا۔ تقویٰ خود علم ہے۔ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اس کا سینہ علم کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ چنانچہ مسروق تابعی نے کہا: كَفَى بِالْمَرْءِ عِلْمًا أَنْ يَخْشَى اللّٰهَ (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 6، صفحہ 142)۔ یعنی، آدمی کے علم کے لیے کافی ہے کہ وہ اللہ سے ڈرے۔ صحابہ کرام اس علم خاص کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔ حضرت عمر فاروق کا ایک قول ہے: مَنْ كَثُرَ ضَحِكُهُ قَلَّتْ هَيْبَتُهُ، مَنْ مَزَحَ اسْتُخِفَّ بِهِ (المعجم الکبیر للطبرانی، اثر نمبر 2259)۔ یعنی، جو آدمی زیادہ ہنسے اس کا رعب کم ہوجائے گا۔ اور جو شخص ہنسی مذاق کرے گا، وہ لوگوں کی نظر میں ہلکا ہوجائے گا۔ حضرت عمر کے اس قول میں جو حکمت ہے اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ (اوراقِ حکمت، ڈائری، 6 جولائی 1985)

علما کا مقام

علما کے بارے میں ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: إِنَّ العُلَمَاءَ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ، إِنَّ الأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا إِنَّمَا وَرَّثُوا العِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَ بِهِ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2682؛ سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 3641)۔ یعنی، بیشک علما انبیاء کے وارث ہیں، انبیاء نے دینار و درہم کی وراثت نہیں چھوڑی، بیشک انھوں نے علم کی وراثت چھوڑی ہے، پس جس نے اس کو لیا، اس نے بڑا حصہ پایا۔

اس حدیث میں علما سے مراد سند یافتہ علما نہیں ہیں۔ بلکہ وہ افراد ہیں، جو حقیقی معنوں میں اہل علم کا درجہ رکھتے ہوں۔ جن کو معرفت کے درجے میں ایمان حاصل ہوا ہو، اور پھر کثرتِ مطالعہ کے ذریعے وہ اس درجے تک پہنچے ہوں، جس کو ایک مشہور قول میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: یک من علم را، دہ من عقل می باید (ایک من علم کے لیے دس من عقل چاہیے)۔ یعنی صاحبِ معرفت وبصیرت انسان۔ اس معنی میں جو لوگ اہلِ علم ہیں، وہ اپنے علم و معرفت کی بنا پر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ دین کا صحیح فہم حاصل کریں، اور دین کو ہر زمانے میں مطلوب انداز میں دنیا کے سامنے پیش کریں۔

اس حدیث میں عالم سے مراد پروفیشنل عالم نہیں ہے، بلکہ عالم سے مراد صاحبِ معرفت عالم ہے۔ یہ وہ علما ہیں، جن کو ان کے علمِ دین نے اس آیتِ قرآن کا مصداق بنا دیا ہو: وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (2:165)۔ یعنی، جو ایمان لائے، وہ اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں۔ اس سے مراد وہ اہلِ علم ہیں، جن کے علم نے ان کا یہ حال کر دیا ہو کہ اللہ رب العالمین ان کا سب سے بڑا کنسرن بن گیا ہو۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں، جو صرف صاحبِ معلومات نہ ہوں، بلکہ گہرے معنی میں صاحبِ بصیرت بن چکے ہوں۔ اس سے مراد وہ عالم ہیں، جو لکھنے اور بولنے سے پہلے سجدے میں گر کر اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں: يَا مُعَلِّمَ إِبْرَاهِيمَ عَلِّمْنِي

(اعلام الموقعین لابن القیم، جلد 4، صفحہ 198)۔ یعنی، اے ابراہیم کو علم عطا کرنے والے، مجھے علم عطا فرما۔ (الرسالہ، اکتوبر 2018)

علم کا اٹھ جانا

صحیحین میں ایک روایت آئی ہے۔ بخاری کے الفاظ یہ ہیں۔ حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يُرْفَعَ الْعِلْمُ، وَيَثْبُتَ الْجَهْلُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 80)۔ یعنی، قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ قیامت سے پہلے علم اٹھ جائے گا اور جہالت پھیل جائے گی۔

اس حدیثِ رسول میں علم سے مراد حکمت ہے۔ علم کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہے، معلومات (information)، اور دوسری چیز ہے، حکمت (wisdom)۔ اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم بمعنی معلومات اٹھ جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر علم تو موجود ہوگا، لیکن اہل علم حکمت و بصیرت سے محروم ہوجائیں گے۔ قرائن بتاتے ہیں کہ موجودہ زمانہ قربِ قیامت کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں وہ واقعہ عملاً پیش آچکا ہے، جس کی پیشین گوئی مذکورہ حدیثِ رسول میں کی گئی تھی۔

جہاں تک علم بمعنی معلومات کا تعلق ہے، موجودہ زمانے میں اس اعتبار سے، بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ موجودہ زمانے میں ایک کمپیوٹر کے اندر اس سے زیادہ علمی ذخیرہ موجود ہوتا ہے، جو اس سے پہلے کسی بڑے کتب خانے میں پایا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں سب سے بڑا محدّث گوگل (Google) ہے۔ کیوں کہ ایک سوئچ دبانے سے گوگل کا سرچ انجن آپ کے سامنے اتنی زیادہ حدیثیں پیش کردیتا ہے، جو اس سے پہلے کسی بڑے سے بڑے محدث کے دماغ میں بھی نہیں ہوتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیثِ رسول میں رفعِ علم سے مراد رفعِ حکمت ہے۔ اس کا سبب

یہ ہے کہ قیامت سے پہلے دنیا میں غیر معمولی مادی ترقیاں ہوں گی۔ لوگ مادیات میں اتنا زیادہ مشغول ہوجائیں گے کہ ان کے پاس حکمت وبصیرت جیسی چیزوں پر غور کرنے کے لیے وقت ہی نہ ہوگا۔ لوگوں کے پاس معلومات تو ہوں گی، لیکن حکمت وبصیرت کے اعتبار سے وہ ذہنی بوناپن (intellectual dwarfism) کا شکار ہوجائیں گے۔ لوگ صاحب معلومات تو ہوں گے، لیکن وہ صاحب بصیرت نہ ہوں گے۔

علما کم، خطبا زیادہ

مشہور صحابی رسول حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: إِنَّكُمْ فِي زَمَانٍ: كَثِيرٌ فُقَهَاؤُهُ، قَلِيلٌ خُطَبَاؤُهُ....وَسَيَأْتِي مِنْ بَعْدِكُمْ زَمَانٌ: قَلِيلٌ فُقَهَاؤُهُ، كَثِيرٌ خُطَبَاؤُهُ (الادب المفرد للبخاری، اثر نمبر 789)۔ یعنی، آج تم ایک ایسے زمانے میں ہو، جب کہ امت میں علما بہت ہیں اور خطبا کم ہیں۔ تمھارے بعد ایک ایسا زمانہ آئے گا، جب کہ امت میں خطبا زیادہ ہوں گے اور علما کم ہوں گے۔

اِس قول میں علما (اور بعض روایت کے مطابق فقہا) سے مراد حقیقی اہلِ علم ہیں، اور خطبا سے مراد عوامی انداز میں بولنے والے مقررین ہیں۔ بعد کے زمانے سے مراد اسٹیج اور میڈیا کا زمانہ ہے۔

یہ بعد کا زمانہ آج پوری طرح ہمارے سامنے آچکا ہے۔ قدیم زمانے میں، جب کہ پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا وجود میں نہیں آیا تھا اور نہ جدید قسم کا اسٹیج بنا تھا، اُس وقت تقریر وخطابت میں کوئی کشش موجود نہ تھی۔ اُس وقت کے حالات میں لوگ زیادہ تر علمی مطالعہ اور علمی کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ اِس بنا پر قدیم زمانے میں یہ ممکن تھا کہ بڑے بڑے اہلِ علم پیدا ہوں۔

موجودہ زمانے میں، اسٹیج اور میڈیا کے ظہور نے صورتِ حال کو بالکل بدل دیا ہے۔ اب

یہ ممکن ہو گیا ہے کہ آدمی پُر جوش تقریریں کر کے اسٹیج پر نمایاں ہو۔ اخباروں میں اس کی تصویریں چھپیں۔ ٹی وی کے پروگراموں میں اس کا شان دار مظاہرہ ہو، وغیرہ۔

اِس طرح کی چیزوں نے آج کے ذہین لوگوں کو علم سے بے رغبت کر دیا ہے۔ اسٹیج اور میڈیا میں نمایاں ہونا، اُن کے لیے زیادہ پرکشش بن گیا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو صحابی رسول نے پیشین گوئی کے انداز میں بیان کیا۔

علم والا آدمی سوچ کر بولتا ہے اور خطابت والا آدمی سوچے سمجھے بغیر اپنی تقریر شروع کر دیتا ہے۔ اِس فرق کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ علم والا آدمی مُصلح کا درجہ پاتا ہے، اور خطابت والا آدمی مفسد کا درجہ۔ مستقبل کی تعمیر کے لیے ہمیشہ صاحب بصیرت اہلِ علم درکار ہوتے ہیں، نہ کہ اہلِ خطابت۔ (الرسالہ، فروری 2009)

سائنٹفک مزاج

سائنٹفک مزاج (scientific temper) علمی اعتبار سے کسی انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ سائنٹفک مزاج اس بات کا ضامن ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے قول یا اپنے عمل میں کوئی ایسی روش اختیار نہ کرے جو حقیقتِ واقعہ کے خلاف ہو۔ کسی انسان کے اندر سائنٹفک مزاج اس وقت بنتا ہے جب کہ آدمی کے اندر کامل معنوں میں موضوعیت (objectivity) پائی جائے۔ وہ اس قابل ہو جائے کہ وہ اپنے ذاتی رجحان سے الگ ہو کر چیزوں کو غیر جانبدارانہ انداز میں دیکھے اور ایز اٹ از (as it is) انداز میں اپنی رائے قائم کرے۔

سائنٹفک اپروچ (scientific approach) اور سائنٹفک ٹمپر دونوں قریبی الفاظ ہیں۔ لیکن دونوں میں ایک فرق پایا جاتا ہے۔ سائنٹفک اپروچ ایک ٹکنیکل اصطلاح ہے۔ جب کہ سائنٹفک ٹمپر آدمی کے نفسیاتی مزاج کو بتاتا ہے۔ سائنٹفک اپروچ کا

مطلب یہ ہے کہ آدمی معلوم سائنسی طریقہ (scientific method) کو اپنائے، وہ متھڈالوجی (methodology) کے اعتبار سے سائنسی اصولوں کی پیروی کرے۔ اس کے مقابلے میں سائنٹفک ٹمپر کا مطلب یہ ہے کہ یہی آدمی کی نفسیات بن جائے۔

سائنٹفک ٹمپر ایک بے حد مشکل چیز ہے۔ اکثر بڑے بڑے لوگوں میں بھی سائنٹفک ٹمپر نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال اسٹیفن ہاکنگ (1942-2018) ہے۔ وہ ایک ماہر نظریاتی سائنسداں کی حیثیت سے معروف ہے۔ لیکن اس نے ایک ایسا بیان دیا جو سائنٹفک ٹمپر سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ایک انٹرویو کے دوران اس نے کہا کہ جنت یا زندگی بعد موت کا کوئی وجود نہیں، یہ سب پریوں کی کہانی ہے:

There is no heaven or afterlife, that is a fairy story.

ایک آدمی جس کے اندر سائنٹفک ٹمپر ہو وہ ایسی بات کہنے کا تحمل نہیں کر سکتا۔ ایک سائنسداں جائز طور پر صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ جنت جیسی کوئی چیز اب تک اس کے مشاہدے میں نہیں۔ مگر یہ بات کہنا کہ جنت جیسی کوئی چیز امرِ واقعہ کے طور پر موجود نہیں، خالص علمی اعتبار سے ایسا کہنے کا حق کسی کو نہیں، نہ سائنس داں کو اور نہ غیر سائنسداں کو۔

اِسی طرح مشہور سائنس داں البرٹ آئن سٹائن نے یہودی فلسفی ایرک (Eric B. Gutkind, 1877-1965) کو ایک خط (3 جنوری 1954) لکھا تھا، جو علمی دنیا میں گاڈ لیٹر (God letter) کے نام سے معروف ہے۔ اس خط میں آئن سٹائن نے لکھا کہ خدا کا لفظ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ صرف انسانی کمزوریوں کی ایک پیداوار ہے:

The word God was nothing more than the expression and product of human weaknesses.

یہ خود اگرچہ ایک معروف سائنسداں کا قول ہے۔ مگر وہ سائنٹفک ٹمپر کے مطابق نہیں۔ ایک مسئلے کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بتاتے ہوئے، یہ ایک ایسا بیان دینا ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک سبجیکٹیو بیان (subjective statement) ہے۔ یہ بات ایک

سائنسداں کے حیثیتِ عرفی کے خلاف ہے۔ کیوں کہ سائنسداں اپنے علمی موقف کے مطابق، صرف آبجیکٹیو بیان (objective statement) کو درست (valid) سمجھتا ہے، نہ کہ سبجیکٹو بیان (subjective statement) کو۔

ڈاکٹر اے وی ہلز (Archibald Vivian Hill, 1886-1977) نے کہا ہے کہ میں آخری شخص ہوں گا جو اس بات کا دعوی کرے کہ ہم سائنسداں دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کے مقابلے میں کم تعصب رکھنے والے ہوتے ہیں:

> I should be the last to claim that we, scientific men, are less liable to prejudice than other educate men.

ایک سائنسی عالم کا مذکورہ قول بالکل درست ہے۔ اس کلیہ میں سائنس دانوں کا بھی کوئی استثنا نہیں۔ سائنسی مزاج کسی آدمی کا سب سے بڑا ذہنی سرمایہ (intellectual asset) ہے۔ ایسا آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کے بارے میں مبنی برحقیقت رائے قائم کرے، وہ جانبدارانہ سوچ سے آخری حد تک خالی ہو، وہ چیزوں کو اپنے ذاتی رجحان کی روشنی میں نہ دیکھے، بلکہ اس طرح دیکھے جیسے کہ وہ حقیقتاً ہیں۔

صلحائے امت

صلحائے امت کے بارے میں جو حالات کتابوں میں ملتے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے بارے میں وہ آخری حد تک بے رغبت ہو گئے تھے۔ دوسری طرف ان میں یہ صفت بھی تھی کہ وہ اپنے آپ کو دین کی اعلیٰ خدمت کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ گویا کہ ان کے اندر بیک وقت دو متضاد صفتیں پائی جاتی تھیں ایک طرف یہ کہ دنیا ان کے لیے ایک غیر مرغوب چیز بن گئی، اور دوسری طرف یہ کہ دین کی کسی اعلیٰ خدمت کے لیے اپنے آپ کو نااہل سمجھنا۔ امت میں اعلیٰ معیار کے جو صلحا پیدا ہوئے، ان میں یہ دونوں صفتیں اعلیٰ درجے میں موجود تھیں۔

اس مزاج کا خلاصہ ایک لفظ میں تواضع (modesty) ہے۔ تواضع کو کچھ لوگ انسان کی انفعالی صفت بتاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کچھ لوگ تو پست ہمتی کا درجہ دیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک محمود صفت کو ایک نامحمود نام دینا ہے۔ تواضع آدمی کے اندر عقلی غور وفکر کی صفت پیدا کرتی ہے۔ تواضع آدمی کے اندر حقیقت پسندانہ سوچ (as it is thinking) پیدا کرتی ہے، اور بلاشبہ اس قسم کی سوچ آدمی کے لیے سب سے بڑا فکری سرمایہ ہے۔ ایسے ہی انسان کو مین کٹ ٹو سائز (man cut to size) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ متواضع آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور مغرور آدمی ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔

انسان کی کامیابی کا ایک راز یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو فخر اور غرور کی نفسیات سے بچائے، وہ اپنے آپ کو ویسے ہی سمجھے جیسا کہ وہ باعتبارِ حقیقت ہے، ایسا آدمی ہمیشہ اپنے آپ کو حد کے اندر رکھتا ہے، وہ کبھی حد سے باہر نہیں جاتا۔ تواضع انسان کو ایک بہادر انسان بناتی ہے۔ تواضع آدمی کو اس سے بچاتی ہے کہ وہ بلاسوچے سمجھے اقدام کرڈالے، اور پھر آخر میں ساری زندگی اس پر پچھتا تا رہے۔ تواضع ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے، حیوان تواضع کو نہیں جانتا۔ یہ صرف انسان ہے، جو تواضع کی حقیقت کو جانتا ہے، اور پھر اس کو شعوری طور پر اختیار کرتا ہے۔

ٹیم کے ذریعے مدد

حضرت موسیٰ قدیم مصر میں پیغمبر تھے۔ ان کو جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بنایا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ میں تنہا یہ کام نہیں کرسکتا، اس لیے میرے بھائی ہارون کو اس کام میں میرا مددگار بنا دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی (طٰہٰ، 20:29-36)۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی کمی کی تلافی کے لیے ان کو مددگار کے طور پر ایک ٹیم دے دی گئی۔ اس ٹیم میں پہلے صرف حضرت ہارون تھے۔ اس کے بعد اس میں اور بہت سے

لوگ شامل ہو گئے ۔مثلاً دربارِ فرعون کا رجلِ مومن حبیب بن شمعون، فرعون کی بیوی آسیہ، مصر کے جادوگر، اور اِسی طرح بنی اسرائیل کے بہت سے لوگ۔

یہ اللہ کی نصرت کا ایک طریقہ ہے۔قرآن میں یہ واقعہ صرف تاریخ کے طور پر ذکر نہیں ہوا ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ نصرت کے طور پر بیان ہوا ہے۔ اللہ کی نصرت کبھی وقتی نہیں ہوتی، وہ ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے۔ آج بھی اگر اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ اللہ کے کام کے لیے اٹھے، وہ اپنے آپ کو خالص اللہ کے کام میں پوری طرح لگا دے، پھر وہ اللہ سے کہے کہ خدایا، میں ایک کمزور انسان ہوں۔ دین کی خدمت جیسے عظیم کار کو انجام دینے کی صلاحیت میرے اندر نہیں۔ تو اپنی خصوصی نصرت سے میری کمزوری کی تلافی فرما۔ اگر اللہ کا ایک بندہ حقیقی طور پر اللہ سے یہ درخواست کرے تو یقینی طور پر اللہ اس کی درخواست کو قبول فرمائے گا اور دوبارہ اس کو ایک ایسی طاقتور ٹیم دے دے گا جو اس کی ذاتی کمیوں کی تلافی کرنے والی ہو۔

اعلیٰ صلاحیت کے لوگ ہمیشہ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن وہ اپنی ذاتی عظمت (personal glory) کے لیے کام کرتے ہیں، خدا کی عظمت کے لیے کام کرنے کا جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے کام کے لیے اکثر ایسے لوگ اٹھتے ہیں جو ہمالیائی شخصیت کے حامل نہ ہوں، لیکن اللہ ان کی خصوصی مدد کرتا ہے۔ ایک طرف وہ ان کو اعلیٰ بصیرت کا سرمایہ دے دیتا ہے، اور دوسری طرف وہ ان کو قابلِ کار افراد کی ایسی ٹیم دے دیتا ہے، جو اپنی متحدہ کوشش سے سارا کام انجام دیتے ہیں۔

عالم کی صفت

ایک عربی مثل ہے: إِنَّ هَذَا الْعِلْمَ لَا يَتَعَلَّمُهُ مُسْتَحْيٍ وَلَا مُتَكَبِّرٍ ۔یعنی، علم نہ شرمانے والا پا سکتا ہے اور نہ تکبر کرنے والا۔ (ڈائری، 10 جولائی 1997)

ذہین لوگوں کا قبرستان

تاریخ ذہین لوگوں کا قبرستان ہے۔ یہ بات اتنی زیادہ عام ہے کہ مشکل ہی سے اس میں کسی کا استثنا (exception) معلوم کیا جاسکتا ہے۔ ایک عرب شیخ نے کہا تھا: السُّعُودِيَّةُ مَقْبَرَةٌ لِعُلَمَاءِ الْمُسْلِمِينَ (سعودی عرب مسلم علما کا مقبرہ ہے)۔ یہی بات عمومی طور پر اس طرح کہی جاسکتی ہے: التَّارِيخُ مَقْبَرَةٌ لِلْأَذْكِيَاءِ (تاریخ، ذہین لوگوں کا قبرستان ہے)۔

یہ معاملہ ان لوگوں کا ہے، جن کو خالق نے ذہین (brilliant) انسان کی حیثیت سے پیدا کیا، یعنی اعلیٰ ذہن والا انسان۔ یہ لوگ گویا کہ خالق کی امید (hope) تھے۔ اپنی اعلیٰ صلاحیت کی وجہ سے وہ بڑے بڑے کام کرسکتے تھے۔ ان کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ وہ پوری تاریخ کو ایک نیا رخ دے سکیں۔ وہ ایک نئی برتر تہذیب پیدا کرسکیں۔ لیکن اِن اعلیٰ صلاحیت کے لوگوں میں سے تقریباً ہر ایک کا حال یہ ہوا کہ وہ اپنے فطری امکانات (potential) کو واقعہ (actual) نہ بنا سکا۔ ایک محدود مدت کے بعد وہ مرکر اِس دنیا سے چلا گیا۔ اس قسم کے غیر معمولی افراد کی مثالیں ماضی میں بھی تھیں اور آج بھی موجود ہیں۔

غیر معمولی ذہانت رکھنے والوں کی اس ناکامی کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ جو آدمی غیر معمولی صلاحیت کے ساتھ پیدا ہوا، اس نے فوراً ہی تواضع (modesty) کھودی۔ وہ ایک مغرور (arrogant) انسان بن گیا۔ اس تاریخی المیہ کا واحد سبب یہی ہے۔ اس دنیا میں کسی انسان کی سب سے بڑی مثبت صفت تواضع ہے، اور سب سے بڑی منفی صفت غرور (arrogance)۔ یہی واحد سبب ہے، جس کی بنا پر اعلیٰ صلاحیت کے لوگ صرف ناکامی کی تاریخ بنا سکے، کامیابی کی تاریخ بنانا، ان سے ممکن نہ ہوسکا۔ فطرت کے قانون کے مطابق، اس دنیا میں تواضع کامیابی کی ضامن ہے اور غرور کسی آدمی کو ناکامی کے سوا کہیں اور نہیں پہنچاتا۔

ذہنی ارتقا کی اہمیت

قرآن کی سورہ طٰہٰ میں ایک دعا کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے: قُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (20:114) یعنی، تم کہو کہ اے میرے رب، میرا علم زیادہ کردے۔ اِس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا ان الفاظ میں آئی ہے: اللَّهُمَّ، انْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي، وَعَلِّمْنِي مَا يَنْفَعُنِي، وَزِدْنِي عِلْمًا (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 251)۔ یعنی، اے اللہ جو علم تو نے مجھے دیا ہے، اس کو تو میرے لیے نافع بنا، اور مجھے وہ علم دے جو میرے لیے نفع بخش ہو، اور میرے علم میں اضافہ کر۔

اِس آیت اور اِس حدیثِ رسول میں جو بات بتائی گئی ہے، اس کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ اِس سے مراد ذہنی ارتقا (intellectual development) ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن میں آدمی کو بنیادی علم دے دیا گیا ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اِس علم کی روشنی میں مزید غور کرے اور اپنے علم میں برابر اضافہ کرتا رہے۔

علم میں اضافے کا مطلب ہے قرآن کے اشارات میں تفصیل کا اضافہ کرنا۔ بدلے ہوئے حالات میں قرآن کے انطباق (application) کو ازسرِ نو دریافت کرنا۔ قرآن میں بتائی ہوئی نشانیوں (signs) کو نئی دریافتوں کے ذریعے مزید واضح کرنا۔ قرآن میں جو کچھ سطور (lines) میں بیان کیا گیا ہے، اُس پر غور کرکے اس کے بین السطور (between the lines) کو دریافت کرنا۔ قرآن میں فکری ارتقا اور تزکیۂ روحانی کے جو اصول بتائے گئے ہیں، اُن کی اِس طرح تعبیر کرنا کہ وہ ہر دور کے ذہنِ انسانی کو ایڈریس کرسکے، وغیرہ۔

علم میں اضافے سے مراد ذہنی ارتقا میں اضافہ ہے، یعنی وہ علم جو آدمی کی معرفت کو بڑھائے، جو آخرت پسندانہ ذہن پیدا کرے، جو غیبی حقائق پر یقین میں مزید اضافہ کرے، جو قرآن کے اندر چھپی ہوئی نئی نئی حقیقتوں کو آدمی کے اوپر کھولنے والا ہو۔ اِس طرح علم میں اضافہ آدمی کے ایمان میں اضافے کا ذریعہ ثابت ہوگا، اور ایمان میں اضافہ ایک ایسی چیز ہے جس کی کبھی کوئی حد نہیں آتی۔ (الرسالہ، اکتوبر 2012)

مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت

عام طور پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ مدرسے کی تعلیم مسلمانوں کی پوری ملی ضرورت کے لیے کافی نہیں۔ مسلمانوں کے لیے اس کے سوا ایک اور متوازن تعلیمی نظام درکار ہے۔ اس فکر کے لوگوں کے نزدیک موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے ملی احیا کے لیے اس قسم کا متوازی نظام ضروری ہے۔ ایک مسلم دانشور نے اس متوازی نظام کو ارتقائی نظامِ تعلیم (progressive educational system) کا نام دیا ہے۔

راقم الحروف کے نزدیک مدارس کا نظام بنیادی طور پر بالکل درست ہے۔ جس مقصد کے لیے یہ نظام بنایا گیا تھا، اس مقصد کو وہ بڑی حد تک پورا کر رہا ہے۔ مدارس کے موجودہ نظام میں کسی بڑی تبدیلی کی ضرورت نہیں، البتہ مدارس کے موجودہ نظام میں ایک اصلاح کی ضرورت یقینی ہے۔ اس اصلاح کا تعلق مزاج سے ہے۔ اس کو ایک لفظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کھلے پن (openness) کا مزاج پیدا کرنا۔

مسلمانوں کی دوسری ضرورت وہ ہے، جس کو ایک حدیثِ رسول میں 'بصیرتِ زمانہ' (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 361) کہا گیا ہے، یعنی زمانۂ حاضر سے واقفیت حاصل کرنا۔ اس معاملے میں مسلم اسکول، مسلم کالج اور مسلم یونیورسٹی کی صورت میں جو ماڈل اختیار کیا گیا، نتیجہ بتاتا ہے کہ وہ درست ماڈل نہ تھا۔

راقم الحروف کے نزدیک اس معاملے میں وہ درست ماڈل ہے، جو مسیحی حضرات نے اختیار کیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، مسیحی حضرات نے بڑی تعداد میں تعلیمی ادارے کھولے ہیں، مگر وہ اپنے تعلیمی اداروں کو کرسچن اسکول، کرسچن کالج اور کرسچن یونیورسٹی نہیں قرار دیتے۔ وہ انھیں اسی قسم کا سیکولر تعلیمی ادارہ قرار دیتے ہیں جیسے کہ دوسرے سیکولر ادارے ہیں۔ اس معاملے میں درست طریقہ یہ ہے کہ ہر مسلم خاندان اپنے بچوں کے اندر اسلامی ذہن پیدا کرے، ہر مسلم گھر

انفارمل ایجوکیشن کا مرکز بن جائے اور جہاں تک عصری تعلیم کی بات ہے، مسلم نوجوانوں کو اس طرح اعلیٰ سیکولر تعلیم دلائی جائے ، جیسا کہ ملک کے دوسرے نوجوان کر رہے ہیں۔

دورِ صحابہ کے طرز کے مدرسے

تعلیمات اسلامی کا ایک ادارہ قائم کرنے کی ضرورت

سر آرتھر کیتھ (1955-1866) نے مصر کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے، ''مصر کو مسلمانوں کی تلوار نے فتح نہیں کیا بلکہ قرآن نے فتح کیا''۔

> The Egyptians were conquered not by the sword, but by the Koran. (Sir Arthur, *A New theory of Human Evolution*, London, p,303)

یہ یہی بات ایشیا اور افریقہ کے اس پورے خطہ کے لیے صحیح ہے جس کو آج ہم اسلامی دنیا کے نام سے جانتے ہیں۔ ایسا کیوں کر ہوا کہ یہ ساری قومیں نہ صرف اپنا مذہب بلکہ زبان تک بدل کر اسلامی برادری میں شامل ہو جائیں۔ جواب یہ ہے کہ مدرسوں کے ذریعہ۔ دورِ اول کے مسلمان عرب سے نکل کر اطراف کے تمام ملکوں میں پھیل گئے۔ انہوں نے اپنی اسلامی مہم کے مرکز کے طور پر جگہ جگہ اسلامی مدرسے قائم کیے۔ ان مدرسوں میں لوگوں کو عربی زبان سکھائی جاتی تھی اور قرآن وحدیث پڑھایا جاتا تھا۔ ان مدرسوں سے جو لوگ پڑھ کر نکلتے، وہ اپنی اپنی بستیوں میں جا کر دوبارہ اسی قسم کے ادارے قائم کرتے۔ مدرسوں کو بنیاد بنا کر کام کرنے کا یہی طریقہ تھا جس نے ایک سو برس کے اندر اندر اس وقت کی آباد دنیا کے بڑے حصے کے مذہب، تہذیب اور زبان کو بدل ڈالا۔

قرآن ایک دائمی معجزہ ہے۔ خالق کائنات نے اس کے ذریعے اپنے بندوں سے کلام کیا ہے۔ وہ اس دنیا میں خدا اور بندہ کا مقام اتصال ہے، وہ دلوں کو گرماتا ہے اور شعور کو بیدار کرتا ہے۔ اس کے اعلیٰ مضامین اور اس کا آسمانی ادب اتنا اثر انگیز ہے کہ جو شخص بھی قرآن کو سمجھ

کر پڑھتا ہے، اس کی صداقت کو ماننے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اسی طرح رسول ﷺ کی زندگی اور آپ کے اصحاب کے حالات انسانی تاریخ کا انتہائی حیرت ناک انقلابی واقعہ ہیں جو زندگیوں کو گرمانے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ دورِ اول کے مدرسے میں انھی چیزوں کو زندہ کرنے کے ادارے تھے۔ وہ سادہ طور پر عربی زبان سکھا کر آدمی کو قرآن وحدیث سے وابستہ کر دیتے تھے۔ اس کے بعد آدمی ایمان اور حرارت کے ان خزانوں سے براہ راست اپنا دین اخذ کرنے لگتا تھا۔ علم دین اس کے لیے صحبت رسول ﷺ اور صحبت صحابہ کے ہم معنی بن جاتا تھا۔ خدا کی کتاب اس کی فطرت کو جگاتی تھی۔ رسول اور آپ کے اصحاب کی انقلابی زندگیاں اس کے سینہ میں عمل کی آگ بھر دیتی تھیں۔ اس طرح زندہ انسانوں کی وہ فوج تیار ہوتی تھی جو خدا کے لیے جینے اور خدا کے لیے مرنے کے سوا کوئی اور بات اس دنیا میں نہ جانتی تھی۔

آج ہمارے یہاں پہلے سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں مدرسے قائم ہیں۔ مگر آج ان مدرسوں کا وہ فائدہ ظاہر نہیں ہورہا ہے، جو دورِ اول میں ظاہر ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مدرسے اپنے ڈھانچے کے اعتبار سے اس سے بالکل مختلف ہیں جو صحابہ وتابعین نے قائم کیے تھے۔ موجودہ زمانہ کے مدرسوں میں تعلیم دین کو ایک فن بنا دیا گیا ہے۔ قرآن اس لیے اترا کہ اس کو پڑھ کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوں اور ان کے دل خدا کی یاد سے دہل اٹھیں (الانفال، 8:2)۔ مگر ان مدرسوں کے نصاب میں قرآن کو صرف ضمنی مقام حاصل ہے۔ احادیث وآثار کا مقام ہمارے مدارس میں صرف یہ ہے کہ ان کو عنوان بنا کر جزئیات فقہ کے کچھ خود ساختہ مسائل پر لامتناہی بحثیں جاری رکھی جاسکیں۔ اسی کے ساتھ ''علوم آلیہ'' کے نام پر جوفنون پڑھائے جاتے ہیں وہ اتنے فرسودہ ہیں کہ ذہن کو جمود اور لایعنی موشگافیوں کا عادی بنانے کے سوا کوئی دوسری خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ اسلامی مدرسہ کی فضا کو اللہ کی بڑائی کے چرچے سے معمور رہنا چاہیے۔ مگر ہمارے موجودہ تعلیمی ادارے اپنے بزرگوں کی کبریائی کا سبق دینے کے لیے وقف رہتی ہیں۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ یہاں لوگوں کو ایمانی حرارت کا سبق ملے، یہاں اعلیٰ انسانی کردار ڈھلیں۔ یہاں خدا اور آخرت کی تڑپ رکھنے والے لوگ پیدا ہوں، یہاں

سے اسلام کا وہ سیلاب اٹھے جو دورِ اول کے مدرسوں سے اٹھا تھا اور ایک عالم پر چھا گیا تھا۔

ضرورت ہے کہ دوبارہ دورِ اول کے طرز کے مدرسے قائم ہوں اور ان کو بنیاد بنا کر اصلاح امت کا کام کیا جائے۔ ان مدارس کا نصاب بالکل سادہ اور غیر فنی ہونا چاہیے۔ موجودہ حالات کے لحاظ سے ہم اس کو چار مرحلوں تقسیم کر سکتے ہیں:

- پہلا مرحلہ: عربی زبان اور قرآن
- دوسرا مرحلہ: حدیث، سیرت رسولؐ، حالات صحابہؓ، اسلامی تاریخ، وغیرہ (عربی زبان میں)
- تیسرا مرحلہ: عالمی زبانیں، دیگر مذاہب اور ان کی تاریخ، فلسفہ جدید اور ضروری سائنسی معلومات
- چوتھا مرحلہ: اختصاصی مطالعہ کسی ایک اسلامی موضوع پر (عربی میں ایک مقالہ تیار کرنا)۔

اس قسم کا ایک مدرسہ اعلیٰ معیار پر قائم ہو جائے تو بلاشبہ وہ دور جدید کا سب سے بڑا کام ہوگا۔ (الرسالہ، اکتوبر 1976)

نائبِ رسول

قرآن میں ہے: مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ (28:65)۔ یعنی، تم نے پیغام پہنچانے والوں کو کیا جواب دیا تھا۔ اس کے تحت ابوالعالیہ رُفَیع بن مہران تابعی (وفات 93ھ) کہتے ہیں کہ دو باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں تمام اگلے اور پچھلے لوگوں سے پوچھا جائے گا۔ ایک یہ کہ تم کس کی عبادت کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا: كلمتان يسْأَل عَنْهُمَا الْأَولونَ وَالْآخرُونَ مَاذَا كُنْتُم تَعْبدُونَ وماذا أجبتم الْمُرْسلين (دقائق التفسیر لابن تیمیہ، جلد 2، صفحہ 225)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر آخرالزماں کے بعد پیدا ہونے والے لوگوں کا امتحان مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ (تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا) کے بارے میں کیا ہے۔ آپ کے بعد کوئی رسول آنے والا نہیں۔ پھر کیا بعد کے لوگوں سے امتحان ساقط کر دیا گیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ امتحان جاری ہے۔ پہلے یہ امتحان رسول کی سطح پر لیا جاتا تھا، اب یہ امتحان ''نائب رسول'' کی سطح پر لیا جائے گا۔ مگر نائب رسول سے مراد رسمی قسم کے علما نہیں ہیں۔ اس سے مراد وہ افراد ہیں جو حقیقی معنوں میں رسول کی دعوت لے کر اٹھیں۔ جو واقعی طور پر اپنے زمانہ میں رسول کی نمائندگی کریں۔ (ڈائری، 12 فروری 1989)

ہم کہاں ہیں

22 ستمبر 1979 کو ایک بڑی اسلامی شخصیت کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس شخصیت سے وابستہ اخبارات و رسائل میں مرحوم کے بارے میں کثرت سے مضامین شائع ہوئے۔ ان مضامین نے بتایا کہ مرحوم کے معتقدین مرحوم کے بارے میں کیسی غیر معمولی شیفتگی اور وارفتگی

اپنے دلوں میں لیے ہوئے تھے۔ مرحوم کی موت نے ان کے دل کے پیمانے کو چھلکا دیا اور انھوں نے مرحوم کے تذکرے انتہائی والہانہ انداز میں بیان کیے۔ ان مضامین کو دیکھ کر میں نے مرحوم کے ایک معتقد سے پوچھا کہ آپ کے یہ اخبارات ورسائل چوتھائی صدی سے بھی زیادہ مدت سے نکل رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان پرچوں میں کبھی خدا کا تذکرہ بھی اس جوش اور وارفتگی کے ساتھ شائع ہوا ہو۔ مومن کی تعریف یہ ہے کہ وہ خدا کے کارناموں سے سرشار ہو اور خدا کے نام سے اس کے قلب وروح میں حرکت پیدا ہو جائے (الانفال، 8:2)۔ پھر کیا آپ کے اخبارات ورسائل کے صفحات میں کبھی خدا کے لیے ان غیر معمولی کیفیات کا مظاہرہ ہوا ہے جو آپ نے اپنے رہنما کے بارے میں ظاہر کیا ہے۔ اس کے جواب میں وہ خاموش ہو گئے۔

یہ صرف کسی ایک اسلامی تحریک کا معاملہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہمارے تمام اداروں اور تحریکوں کا حال یہی ہے۔ ان کی مجلسیں اپنے "اکابر" کے تذکرے سے معمور ہیں۔ ہر ایک نے اپنے کچھ بڑے بنا لیے ہیں اور جب ان بڑوں کا نام آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زبان وقلم پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔ اس کے برعکس، کسی بھی حلقے میں یہ نظر نہیں آتا کہ وہاں خدا کے چرچے میں لوگوں کو لطف ملتا ہو، خدا کا نام آنے پر لوگوں کے اندر والہانہ کیفیت پیدا ہوتی ہو۔ خدا کی حیثیت بس ایک خشک عقیدے کی ہے۔ جب کہ ان کی اپنی محبوب شخصیتوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کا نام آتے ہی ان کی پوری ہستی جھوم جاتی ہے۔ ان کے دل ودماغ کا چمن کھل اٹھتا ہے۔ ان کے تصور سے ان کی یادوں کی دنیا میں بہار آجاتی ہے۔

خدا اپنے سورج کے ذریعے سارے عالم کو روشن کر رہا ہے مگر اس کو دیکھ کر کسی پر غیر معمولی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ البتہ دنیا کو یہ بتانے میں وہ فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی محبوب شخصیت نے سارے عالم کو اپنی تقریروں سے جگمگا دیا ہے۔ ہواؤں کا نظام دیکھ کر انھیں خدا کی کاریگری پر وجد نہیں آتا۔ البتہ اپنے بزرگوں کے کارنامے بتانے کے لیے وہ یہ شان دار الفاظ پا رہے ہیں کہ انھوں نے ساری دنیا میں اپنے فیض کی ہوائیں چلا دی ہیں۔ زمین وآسمان

میں خدا کی بے پایاں حکمتیں ان کی روح پر رقص طاری نہیں کرتیں۔ البتہ اپنے محبوب قائد کے فکر وتدبر کی عظمت کو بتانے کے لیے لغت کے سارے الفاظ بھی ان کو ناکافی معلوم ہوتے ہیں۔ خدا نے اپنی بے پناہ طاقت سے زمین وآسمان کو سنبھال رکھا ہے مگر اس کو دیکھ کر ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے نہیں ہوتے۔ البتہ اپنے بڑے ان کو اس طرح دکھائی دے رہے ہیں جیسے وہ تمام ملکوں اور قوموں کو تھامے ہوئے ہیں۔ پانی کا عجیب وغریب انتظام جس نے زمین کو ساری معلوم کائنات میں ایک استثنائی کرہ بنا دیا ہے ان کو حیرانی میں مبتلا نہیں کرتا۔ البتہ اپنے پیشواؤں کے کارنامے بیان کرنے کے لیے وہ پورے جوش سے کہہ اٹھتے ہیں کہ ان کے فیض کے چشمے سے ساری دنیا سیراب ہورہی ہے۔ شاید انسان کسی دکھائی دینے والی چیز کو اپنا مرکزِ محبت بنانا چاہتا ہے اور جب خالق اس کو دکھائی نہیں دیتا تو وہ کسی مخلوق کو اپنا مرکزِ محبت بنالیتا ہے۔ (الرسالہ، جنوری 1980)

صدیقی اسپرٹ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد 11 ہجری میں مدینہ میں ابوبکر صدیق کی خلافت کا واقعہ ہے۔ اس وقت عرب کے کچھ قبائل نے زکاۃ دینے سے انکار کردیا۔ یہ سادہ طور پر منعِ زکاۃ کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ اسٹیٹ سے بغاوت کا کیس تھا۔ اس لیے خلیفہ اوّل ابوبکر صدیق نے بہت شدید انداز میں اس کیس کو ہینڈل کیا۔ چنانچہ مدینہ میں اس تعلق سے مشورہ ہوا۔ خلیفہ اول ابوبکر نے اس موقع پر ایک فیصلہ کن تقریر کی، اس میں انہوں نے یہ تاریخی جملہ کہا: إِنَّهُ قَدِ انْقَطَعَ الْوَحْيُ وَتَمَّ الدِّينُ أَيَنْقُصُ وَأَنَا حَيٌّ؟ رَوَاهُ رزین (مشکاۃ المصابیح، حدیث نمبر 6034)۔ یعنی، وحی بند ہوچکی ہے، اور دین مکمل ہوگیا ہے، کیا اس میں کمی کی جائے گی، حالاں کہ میں زندہ ہوں۔

یہ جملہ کوئی سادہ جملہ نہیں تھا، بلکہ وہ ایک اسپرٹ کا اظہار تھا، جو ہر سچے مومن کے اندر ہونا

چاہیے۔ وہ یہ کہ کبھی ایسا موقع آتا ہے کہ دین کے معاملے میں کرائسس کی نوبت آجاتی ہے۔ اس وقت ایک مردمومن کا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔ ایسے نازک موقع پر مردمومن کو اس کی عارفانہ اسپرٹ اس پر ابھارے گی کہ وہ پورے عزم کے ساتھ یہ جملہ بولے— کیا دین میں کمی کی جائے گی، حالاں کہ میں موجود ہوں۔ یہ قول اگرکسی مردمومن کے دل کی گہرائی سے نکلے تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ فضا بدل جاتی ہے، اور اہل اسلام کی گاڑی دوبارہ پٹری پر چلنا شروع ہوجاتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ لوگوں کے لیے اپنی جان، اپنا خاندان، اپنی جائداد، اپنے معاشی مفادات سب سے قیمتی ہوتے ہیں۔ انھیں چیزوں کو ایک انسان سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں وہ ان کو ترجیح دیتا ہے اور اپنا سب کچھ اس کے لیے نثار کردیتا ہے۔ اس کے برعکس، جس کے اندر ایمان اور معرفت کی اسپرٹ پیدا ہوجائے اس کی زندگی ایمان کی بنیاد پر قائم ہوجاتی ہے۔ اللہ کا خوف ومحبت، اللہ کی یاد، اللہ کی نعمتوں کا شکر، اللہ کے لیے حوالگی کا جذبہ، وغیرہ اس کے اندر اتنا بڑھا ہوا ہو کہ ہر دوسری چیز اس کو کمتر لگے۔ یہی صدیقی اسپرٹ ہے۔ (الرسالہ، اپریل 2021)

جب دین کے لیے کوئی سنگین مسئلہ پیدا ہو تو سچا مومن تڑپ اٹھتا ہے۔ اللہ کے بھروسہ پر وہ اکیلا ہی دین کے لیے کھڑا ہوجاتا ہے۔ ایسا ہی واقعہ اکیسویں صدی میں اسلام کے لیے پیدا ہوا ہے، اور دوبارہ ضرورت پیش آ گئی ہے کہ کچھ اہل ایمان صدیقی اسپرٹ کے ساتھ دین کے لیے کھڑے ہوجائیں۔

موجودہ زمانے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دین کی تصویر کو بگاڑ دیا گیا ہے۔ اللہ کا دین مکمل طور پر دین امن (religion of peace) ہے، لیکن خود مسلمانوں کے غلط عمل کے ذریعے اس کو دین تشدد (religion of violence) بنا دیا گیا ہے۔ یہ صورتِ حال ایسی ہے جس پر ہر صاحبِ ایمان تڑپ اٹھے، ہر صاحبِ ایمان خدا کے دین کو دوبارہ امن کا دین بنانے کے لیے کامل طور پر سرگرم ہوجائے۔ اس مقصد کے لیے قرآن کا ترجمہ ہر زبان

میں لوگوں تک پہنچانا ہے۔ عالمی زبانوں میں اسلام کا پرامن پیغام ہر طرف فلڈ (flood) کر دینا ہے۔ یہاں تک کہ ہر عورت اور ہر مرد یہ جان لے کہ خدا کا دین امن کا دین ہے، تشدد سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

قرآن کے شروع میں بتایا گیا ہے کہ اللہ، رب العالمین ہے، وہ رحمۃ للعالمین ہے۔ اللہ کا اور اللہ کے دین کا کوئی تعلق نفرت وتشدد سے نہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ سچے اہل ایمان پکار اٹھیں، اور یہ کہیں کہ کیا اللہ کے دین کی تصویر پر تشدد دین کی بنا دی جائے گی، حالاں کہ میں زندہ ہوں۔ یہی صدیقی اسپرٹ ہے، اور یہی آج کا سب سے مطلوب کام۔ (الرسالہ، مارچ 2015)

حقیقی عالم

عبد اللہ بن المبارک (وفات 181ھ) کا ایک قول ہے:

لَا یَزَالُ الْمَرْءُ عَالِمًا مَا طَلَبَ الْعِلْمَ ، فَإِذَا ظَنَّ أَنَّهُ قَدْ عَلِمَ، فَقَدْ جَهِلَ (المجالسۃ وجواہر العلم، اثر نمبر 308)۔ یعنی، آدمی اس وقت تک عالم رہتا ہے جب تک وہ علم سیکھتا رہے۔ جب وہ گمان کرے کہ وہ عالم ہو گیا تو پھر وہ جاہل ہو گیا۔

عباس محمود العقاد کہا کرتے تھے کہ علم پڑھنے کا نام ہے۔ وہ بہت افسوس کرتے تھے کہ اکثر لکھنے والوں کا یہ حال ہے کہ وہ جتنا پڑھتے ہیں، اس سے زیادہ وہ لکھتے ہیں (العَقَّادُ كَانَ يَقُولُ□ العِلْمُ هُوَ القِرَاءَةُ. وَكَانَ يَأْسَفُ أَبْلَغَ الأَسَفِ، لِأَنَّ كَثِيرًا مِنَ الكُتَّابِ يَكْتُبُونَ أَكْثَرَ مِمَّا يَقْرَؤُونَ) رابطۃ العالم الاسلامی، رجب 1405ھ۔

(اوراقِ حکمت، ڈائری، 17 اپریل 1985)

تعلیم کی اہمیت

تعلیم کی اہمیت کیوں ہے۔ ایک عام انسان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ تعلیم اس لیے ضروری ہے کہ وہ ملازمت حاصل کرنے میں مددگار ہوتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ تعلیم کا ثانوی پہلو ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تعلیم آدمی کے لیے ملازمت یا معاش میں مددگار ہوتی ہے۔ مگر تعلیم کی اصل اہمیت یہ ہے کہ تعلیم آدمی کو باشعور بناتی ہے۔ تعلیم آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ باتوں کو اُس کی گہرائی کے ساتھ سمجھے اور زیادہ نتیجہ خیز انداز میں اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کر سکے۔

قدیم زمانے میں عام طور پر تعلیم برائے تعلیم کا رواج تھا۔ قدیم زمانے میں علم یا تعلیم کا رشتہ معاش سے کم اور زندگی سے زیادہ جڑا ہوا تھا۔ لوگ علم کی خاطر علم حاصل کیا کرتے تھے۔ قدیم زرعی دور میں معاش کا تعلق جسمانی محنت سے زیادہ تھا اور دماغی محنت سے کم۔ اس صورت حال نے علم کو معاش کے بجائے زیادہ تر خود علم سے جوڑ رکھا تھا۔

یہی خاص وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام بڑے بڑے اہلِ علم قدیم زمانے میں پیدا ہوئے۔ موجودہ زمانے میں ڈاکٹر اور انجینئر اور دوسرے تجارتی شعبوں کے ماہرین تو بہت پیدا ہو رہے ہیں۔ مگر خالص علمی شعبے کے ماہرین موجودہ زمانے میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں علم اقتصادیات کے تابع ہو گیا ہے۔ جب کہ قدیم زمانے میں زندگی کے تمام شعبے، بشمول اقتصادیات، علم کے تابع ہوا کرتے تھے۔

علمی تاریخ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بڑی بڑی دریافتیں کرنے والے اور بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دینے والے زیادہ تر ماضی میں پیدا ہوئے۔ موجودہ زمانے میں کوئی سقراط، کوئی گلیلیو، کوئی نیوٹن نظر نہیں آتا۔ البتہ ٹیکنیکل شعبوں کے ماہرین لاکھوں کی تعداد میں ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔

یہ صورت حال بے حد تشویش ناک ہے۔ اس صورت حال کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ زندگی کے مادّی شعبوں میں تو بڑی بڑی نمائشی ترقیاں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں، مگر علمی یا ذہنی ترقی کا عمل رک گیا ہے۔

حال میں امریکا کے بڑے بڑے دولت مندوں کے بارے میں ایک جائزہ شائع ہوا ہے۔ اس کے مطابق، امریکا کے ارب پتی قسم کے لوگ ایک نئی بیماری سے دوچار ہیں۔ اس بیماری کو افلوئنزا (affluenza) کا نام دیا گیا ہے، یعنی خوش حالی کی بیماری۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکا کے ارب پتی خاندانوں کے لڑکے اور لڑکیوں کا حال یہ ہے کہ وہ جسمانی اعتبار سے تو خوب فربہ ہو گئے ہیں، مگر وہ ذہنی بونے پن کا شکار ہیں۔ اُن کا عقلی ارتقا زیادہ نہ ہو سکا۔ (الرسالہ، اگست 2007)

اسلامی تحریک کا ہدف

تبلیغی جماعت کے سابق امیر مولانا انعام الحسن کاندھلوی (وفات 1996ء) نے کہا تھا کہ: ہماری تبلیغی تحریک ایک مسجد وار تحریک ہے۔ مولانا انعام الحسن کاندھلوی کا یہ قول تبلیغی جماعت کی صحیح تصویر کو بتاتا ہے۔ تبلیغی جماعت کی تحریک اصلاً مسلمانوں کی دینی اصلاح کی تحریک ہے، جو مسجدوں کو بنیاد بنا کر چلائی جا رہی ہے۔ مسجد وار تحریک کا مطلب ہے— مسجد اورینٹڈ موومنٹ (Masjid-oriented movement)۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے اندر جو تحریکیں اٹھیں، وہ مختلف پہلوؤں سے اِسی قسم کی تحریکیں تھیں— مسجد وار تحریک، مدرسہ وار تحریک، ملت وار تحریک، تحفظ وار تحریک، مناظرہ وار تحریک، فخر وار تحریک، سیاست وار تحریک، وغیرہ۔ اِس قسم کی تحریکوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے جو انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے درمیان پھیلا ہوا ہے، اور اکیسویں صدی میں بھی اس قسم کی تحریکوں کا تسلسل جاری ہے۔

تحریکوں کی اِس طویل فہرست میں صرف ایک تحریک ہے جو غیر موجود ہے، اور وہ ہے دعوت وارتحریک۔ دعوت وارتحریک کے لیے قرآن میں دعوت الی اللہ کا لفظ آیا ہے، یعنی خدا کے بندوں کو خدا کی طرف بلانا، تمام انسانوں کو خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) سے آگاہ کرنا۔ قرآن میں اِس دعوت وارتحریک کے لیے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً اِنذار، تبشیر، وغیرہ۔

دعوت الی اللہ، امتِ مسلمہ کا سب سے بڑا مشن ہے۔ یہی تمام پیغمبروں کا مشن تھا۔ یہی پیغمبر اسلام ﷺ کا مشن تھا۔ یہی اب امتِ محمدی کا مشن ہے۔ اِسی دعوتی مشن کی انجام دہی پر امتِ محمدی کا امتِ محمدی ہونا متحقق ہوتا ہے۔ امت اگر اِس دعوتی مشن کو انجام نہ دے تو اللہ کی نظر میں اس کا امتِ محمدی ہونا مشتبہ ہوجائے گا۔ مزید یہ کہ یہ دعوتی مشن فرض علی الکفایہ نہیں ہے، بلکہ وہ فرضِ عین ہے۔ امت کا ہر فرد جس طرح عبادت کو اپنے لیے فرض سمجھتا ہے، اسی طرح امت کے ہر فرد کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق، اِس دعوتی مشن میں اپنے آپ کو شریک کرے۔ (الرسالہ، جون 2012)

پہلا اسکول

علم کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ہر دوسری مصلحت پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمان تعلیم کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے ہوگئے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ موجودہ زمانے میں جو تعلیمی ادارے قائم ہوئے، ان کے اساتذہ زیادہ تر غیر مسلم تھے۔ مسلمانوں کے رہنماؤں نے کہا کہ یہ غیر مسلم استاد ہمارے بچوں کو خراب کر دیں گے، اس لیے ان اداروں میں مسلمانوں کو داخل کرنا درست نہیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمان تعلیم میں بہت پیچھے ہوگئے۔

یہ مصلحت درست نہ تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں جو سب سے پہلا

اسکول کھولا گیا، اس کے تمام استاد غیر مسلم تھے۔ یہ اسکول مدینہ میں مشرک قیدیوں کے ذریعہ کھولا گیا۔ بعض لوگ صفہ کو پہلا اسلامی مدرسہ کہتے ہیں۔ مگر صفہ تربیت گاہ تھا، نہ کہ تعلیم گاہ۔ اسلام کی پہلی تعلیم گاہ یقیناً وہ ہے جو غزوۂ بدر کے قیدیوں کے ذریعہ مدینہ میں قائم کی گئی اور اس کے ٹیچر سب کے سب مشرک اور غیر مسلم تھے۔

حتیٰ کہ اس تعلیمی نظام کی بنا پر مدینہ میں مسائل بھی پیدا ہوئے۔ مثلاً مسند احمد بن حنبل کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر کیا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ اس کے بعد ایک روز ایک لڑکا روتا ہوا اپنی ماں کے پاس آیا۔ ماں نے پوچھا تمہارا حال کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے معلم نے مجھ کو مارا ہے: جَعَلَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فِدَاءَهُمْ أَنْ يُعَلِّمُوا أَوْلَادَ الْأَنْصَارِ الْكِتَابَةَ، قَالَ: فجَاء غُلَام يَوْمًا يبكي إِلَى أمه فَقَالَت: مَا شَأْنك؟ فَقَالَ: ضَرَبَنِي مُعَلِّمِي (مسند احمد، حدیث نمبر 2216)۔

یہ قیدی سب کے سب اسلام کے دشمن تھے۔ ان کو چھوڑنے میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ دوبارہ اسلام کے خلاف مسئلہ بنیں گے۔ اس کے باوجود انھیں تعلیم کی قیمت پر چھوڑ دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ہر اندیشے کو نظر انداز کر کے اسے حاصل کرنا چاہیے۔ (الرسالہ، مارچ 1990)

مدرسہ کے طلبہ کے نام

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک طویل روایت حدیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ اس میں دیگر باتوں کے علاوہ مسلم عاقل کی صفات بھی بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ اس کو اپنے زمانہ سے باخبر ہونا چاہیے: أَنْ يَكُونَ بَصِيرًا بِزَمَانِهِ (صحیح ابن حبان،

حدیث نمبر 361)۔ یہ ایک بے حد اہم ہدایت ہے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ صرف واقفِ دین نہ بنیں، بلکہ اسی کے ساتھ واقفِ زمانہ بھی بنیں۔ اس کے بعد ہی آپ موجودہ زمانہ میں دین کی صحیح خدمت کرسکتے ہیں۔

واقف زمانہ بننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اپنی کمیونٹی کے خلاف ہونے والے ”ظلم اور سازش“ کو جاننے والے بن جائیں۔ یہ میرے نزدیک سطحیت ہے، نہ کہ علم۔ یعنی یہ ظواہر کو جاننا اور حقائق سے بے خبر رہنا ہے۔ علم بلاشبہ یہ ہے کہ آدمی اصل حقیقت کو جانے، نہ یہ کہ اس کی نگاہ ظاہری چیزوں پر اٹک کر رہ جائے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ دوسری قومیں مسلمانوں کے خلاف سازش اور ظلم میں مصروف ہیں، تب بھی اصل جاننے کی بات یہ ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں جنھوں نے ان قوموں کو یہ حیثیت دے دی ہے کہ وہ ہمارے خلاف کامیاب سازشیں کرسکیں۔ وہ ہمارے خلاف اپنے منصوبوں کی کامیاب تکمیل کریں اور ہمارے تمام اعاظم واکابر اس کو روکنے میں مکمل طور پر عاجز ثابت ہوں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی اصل کمی یہ ہے کہ وہ عصر حاضر سے ناواقف (unaware) ہیں۔ وہ ماضی کو جانتے ہیں، مگر حال کی انھیں مطلق خبر نہیں۔ ان میں سے کوئی شخص اگر کچھ جانتا ہے تو وہ بھی کچھ ظاہری چیزوں کو جانتا ہے، نہ کہ گہرے معنوں میں حقیقی حالات کو۔ دینی مدرسوں کے طلبہ اگر صرف ”حیوان کا سب“ بن کر نہیں رہنا چاہتے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو مفید طور پر لگائیں تو ان پر لازم ہے کہ وہ عصر حاضر کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ جانیں، وہ موجودہ زمانہ کی ان تبدیلیوں سے واقفیت حاصل کریں جنھوں نے ہمارے مروجہ طریقوں کو عملی اعتبار سے بالکل غیر موثر بنا دیا ہے۔(الرسالہ، فروری، 2018)

دین کی عصری تفہیم

ایک لمبی روایت صحابی رسول کے حوالے سے حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس کا ایک جزیہ ہے۔آپ نے کہا: وَعَلَى الْعَاقِلِ أَنْ يَكُونَ بَصِيرًا بِزَمَانِهِ (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 361)۔یعنی، دانش مند کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے سے باخبر ہو۔ بصیرت زمانی کی یہ صفت زندگی کے عام معاملات کے لیے بھی ہے، اسی کے ساتھ دین کو زمانے کی نسبت سے سمجھنے کے لیے بھی۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات مومنِ مجتہد کے لیے کہی گئی ہے۔ اجتہاد اہلِ اسلام کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اجتہاد کی خاص شرط کیا ہے۔وہ یہ ہے کہ مومن مجتہد قرآن وسنت کی گہری واقفیت کے ساتھ اپنے زمانے کے حالات سے بھی بخوبی طور پر واقف ہو۔تاکہ وہ زمانے کے تقاضے کے مطابق اسلامی تعلیم کی نئی تشریح کر سکے۔ ایسی تشریح جس میں اسلام کی تعلیمات کی بھرپور طور پر تعمیل موجود ہو، اور اسی کے ساتھ اس میں زمانے کے حالات کے مطابق اہل اسلام کو درست رہنمائی حاصل ہوتی ہو۔

اجتہاد دوسرے الفاظ میں اسلام کی دانش مندانہ تعبیر ہے۔جس آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ قرآن وسنت سے واقف ہو، لیکن اس کے اندر دانش مندی کی صفت نہ ہو، تو وہ دین کو درست طور پر نہیں سمجھے گا۔ وہ درست طور پر لوگوں کو دینی رہنمائی نہ دے سکے گا۔ وہ دین کو تطبیقی انداز (applied way) میں پیش نہ کر سکے گا۔

دین کی عصری تفہیم کا مطلب صرف یہ ہے کہ ابدی دین کو وقت کے اسلوب (idiom) میں بیان کرنا۔ دینی متن (religious text) کا ترجمہ اگر صرف ترجمہ ہے تو اس کی عصری تفہیم کا مطلب ترجمہ پلس (translation plus) ہے، یعنی سطور (lines) کے ساتھ بین السطور (between the lines) کا بیان۔(الرسالہ، مارچ 2020)

بصیرِ زمانہ

ایک طویل حدیث، ابو ذرغفاری نے روایت کی ہے۔ ایک سوال کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَعَلَى الْعَاقِلِ أَنْ يَكُونَ بَصِيرًا بِزَمَانِهِ (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 361)۔ اور عاقل کو چاہیے کہ وہ اپنے زمانے کو جاننے والا ہو۔ اس حدیث میں عاقل سے مراد عاقل مومن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن کے اندر یہ دانش مندی ہونا چاہیے کہ وہ اپنے زمانے سے پوری طرح باخبر ہو۔ اپنے زمانے سے بے خبر ہونا مومن کے لیے جائز نہیں ہے۔

بصیر زمانہ ہونے کا مقصد کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مومن اپنے عمل کی صحیح منصوبہ بندی (right planning) کرسکے۔ زمانے سے باخبری کے بغیر اسلامی عمل کی صحیح منصوبہ بندی نہیں ہوسکتی ہے۔ اس بنا پر مومن کو یہ کوشش کرنا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات سے پوری طرح باخبر ہو، ورنہ اس کی سرگرمیاں بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں گی۔

مثال کے طور پر مومن اگر ایسے زمانہ میں ہے جو امن کا زمانہ ہے۔ ایسے زمانے میں صرف پرامن منصوبہ بندی نتیجہ خیز ہوسکتی ہے۔ اگر مومن زمانے کے حالات سے بے خبر ہو، اور وہ امن کے زمانے میں جنگ کی تیاری کرے، اور پھر اپنے زمانے کے لوگوں کے خلاف لڑائی چھیڑ دے تو بلاشبہ اس کا منصوبہ غلط ہوجائے گا۔ اپنے جان و مال کو قربان کرنے کے باوجود وہ کوئی مثبت نتیجہ (positive result) حاصل نہ کرسکے گا۔

اسی طرح اگر مومن پرنٹنگ پریس کے زمانے میں ہے، اور وہ ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کی لائبریری بنا رہا ہے تو اس کا ایسا کرنا عملاً ایک ایسا کام ہوگا جس کا کوئی حقیقی نتیجہ نہیں۔ اسی طرح اگر مومن ایسے زمانے میں ہے جب کہ اظہارِ رائے کی آزادی ایک مسلّمہ حق سمجھا جاتا ہے، اور وہ دوسروں کی اظہارِ رائے پر پابندی لگانے کا مطالبہ کرے تو یہ مطالبہ عملاً کبھی پورا نہ ہوگا۔ البتہ وہ معتدل ماحول ختم ہوجائے گا جس میں مومن کے لیے بھی اظہارِ رائے کی یکساں آزادی ہو۔ (الرسالہ، فروری 2016)

ایک نوجوان عالم دین کا تجربہ

ایک نوجوان عالم دین آج کل ہمارے ساتھ تحریری کام میں کچھ مدد کررہے ہیں۔ ان کو میں دو جگہ غیر مسلموں کے اجتماع میں لے گیا۔ وہ دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوہ دونوں جگہ پڑھے ہوئے ہیں۔ مگر اب تک انہیں غیر مسلموں کے کسی اجتماع میں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ دوسرے اجتماع سے واپسی کے بعد میں نے ان کا تاثر پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ میرے لیے عقلی انفتاح کا تجربہ تھا۔ انہوں نے اس کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی:

مجھے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ ہم اب تک اندھیرے میں تھے اور ایک محدود دائرے میں گردش کررہے تھے۔ ہم نے یہ سمجھا ہی نہیں تھا کہ ایک اور وسیع میدان ہماری نظروں سے اوجھل ہے، جس میں زیادہ بہتر طور پر دین کی خدمت کی جاسکتی ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ غیر مسلم اقوام بھی ہمارے معاشرے کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ ان کو الگ کرنے کی صورت میں ہم خود الگ ہوکر رہ جائیں گے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ باہمی میل جول بڑھا کر ہم خدا کے پیغام کو عام کریں۔ اس کو اپنی محدود دنیا سے نکال کر غیر محدود فضا میں لے جائیں۔ یہ ہمارا فریضہ تھا۔ لیکن ہم اب تک اس سے دور تھے۔ (ڈائری، 26 فروری 1997)

تعارف اسلام

دہلی کی جامع مسجد کے پاس تھیا سافیکل سوسائٹی کی ایک لائبریری ہے۔ مجھے مسز اینی بسنٹ (1847-1933) کی ایک کتاب کی تلاش تھی۔ اس کتاب کو لینے کے لیے میں مذکورہ لائبریری میں 24 جون 1979 کو گیا۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ حسب معمول اس دن ان کا ہفتہ وار اجتماع تھا۔ کتاب حاصل کرنے کے بعد دن کو 10 بجے میں ان کے اجتماع میں شریک ہوگیا۔ یہ

پڑھے لکھے لوگوں کا اجتماع تھا۔ نیا چہرہ دیکھ کر انہوں نے مجھ سے فرمائش کی ”آپ بھی اپنے و چار رکھیں“۔ میں نے کہا کہ میں قرآن کا طالب علم ہوں اگر آپ پسند کریں تو میں یہ کر سکتا ہوں کہ یہ بتاؤں کہ قرآن کی تعلیم کیا ہے، انہوں نے کہا۔ ضرور آپ یہی بتائیے۔ ہم آپ سے اسی موضوع پر سننا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ تقریر کی۔ اس تقریر میں سادہ انداز میں توحید، آخرت اور جنت و جہنم کی وضاحت کی۔ میں نے بتایا کہ قرآن کے مطابق زندگی کا اصل مسئلہ موجودہ دنیا کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ موت کے بعد آنے والی دنیا کا مسئلہ ہے۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ہم کس طرح زندگی گزاریں کہ ہماری اگلی زندگی کامیاب رہے۔ تمام لوگ بہت غور سے میری تقریر سنتے رہے۔ تقریر کے بعد سوالات بھی ہوئے جن کا میں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جواب دیا۔

تقریر ختم ہونے کے بعد مجمع سے ایک صاحب اٹھ کر میرے پاس آئے اور میرا پتہ معلوم کیا۔ میں نے اپنا پورا پتہ بتا دیا۔ انہوں نے کہا کہ پٹیل نگر (نئی دہلی) میں تھیاسوفیکل سوسائٹی کا لاج ہے۔ وہاں زیادہ بڑے پیمانہ پر ہمارا پروگرام ہوتا ہے۔ ہم وہاں پر آپ کی تقریر رکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم ایک ساتھ ایک مہینہ (چار ہفتہ وار اجتماعات) کا پروگرام بنا کر چھپوا لیتے ہیں اور اس کو تمام ممبروں تک بھیج دیتے ہیں۔ اب 15 جولائی تک ہمارا پروگرام سٹ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد کسی تاریخ کو ہم آپ کو زحمت دینا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد میری دوسری تقریر 15 جولائی 1979 کو ہوئی۔ اس کا عنوان تھا، قرآن کا پیغام۔ ملک کے اکثر حصوں میں غیر مسلم حضرات کے اس طرح کے اجتماعات برابر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ اس کو پسند کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی وہاں آئیں اور سنجیدہ انداز میں اپنی بات پیش کریں۔ اسلام کے تعارف کے سلسلہ میں ہمیں جو کچھ کرنا ہے۔ اس کے سلسلہ میں ایک کام یہ بھی ہے کہ اس طرح کے اجتماعات میں پہنچیں اور ان مواقع سے فائدہ اٹھائیں۔ (الرسالہ، جنوری 1986)

عصر حاضر میں تعمیری کام

مسلمانوں نے پچھلے دوسو برس کے اندر کوئی بھی ٹھوس تعمیری کام نہیں کیا۔ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا مسئلہ عقلی نقطۂ نظر کا غلبہ تھا۔ موجودہ زمانہ میں عقلی نقطۂ نظر نے ایک فکری انقلاب پیدا کیا ہے۔ اس انقلاب نے دینی عقائد کو دورِ جاہلیت کی چیز قرار دے کر ان کو تاریخ کے خانہ میں ڈال دیا۔ یہاں ضرورت تھی کہ مسلمان اٹھیں اور دینی عقائد اور تعلیمات کو دوبارہ عقلی بنیاد فراہم کریں۔ مگر اس پوری مدت میں منفی ہنگاموں کے سوا مسلمان اور کچھ نہ کرسکے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ زمانے میں تبدیلی واقع ہوئی اور دینی عقائد کو دوبارہ عقلی بنیاد فراہم ہونے کے امکانات پیدا ہوگئے۔ مگر یہ کام تمام تر عیسائی اور یہودی علما نے انجام دیا۔ اس میں مسلمانوں کا ایک فی صد حصہ بھی نہیں۔ جدید سائنس نے خدا کو کائنات کے نقشہ سے حذف کر دیا تھا۔ اب دوبارہ خدا کائنات کے نقشہ میں نظر آرہا ہے مگر اس عمل کو انجام دینے والے وہ لوگ ہیں، جن کے نام جیمز جینز اور اڈنگٹن جیسے ہیں۔

یہی معاملہ تمام دینی تعلیمات کا ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ دنیا میں دوسرے الہامی مذاہب (عیسائیت، یہودیت) بھی موجود تھے۔ اسلام اور ان مذاہب کے درمیان تعلیمات اور تاریخی شخصیتوں کا اشتراک ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنی تعلیمات اور اپنی تاریخ کو عقلی اور سائنسی طور پر معتبر ثابت کرنے کے لیے جو تحقیقات کیں اس کا فائدہ بالواسطہ طور پر اسلام کے حصہ میں بھی آگیا۔ مثلاً علم الآثار کی تحقیق جس نے قرآن میں مذکور اقوام اور شخصیتوں کو تاریخ کی روشنی عطا کی۔

نظریۂ ارتقا کی تردید، جس نے خالق کے عقیدہ کو دوبارہ بحال کیا۔ عورت اور مرد کے درمیان حیاتیاتی فرق کو ثابت کرنا جس نے خاندان کے بارے میں اسلامی قوانین کو دوبارہ اعتباریت (credibility) عطا کی۔ حتیٰ کہ اسلام کی قدیم عربی کتب کو مخطوطات کے دور سے

نکال کر مطبوعات کے دور میں داخل کرنا بھی انھیں عیسائیوں اور یہودیوں کا کارنامہ ہے۔ غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کو سمجھنے کے لیے عربی زبان کے بعد سب سے زیادہ جس زبان میں اعلیٰ لٹریچر موجود ہے، وہ انگریزی زبان ہے۔ اس سلسلہ کی ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ سیرت کی مستند کتاب، سیرت ابن ہشام کا مکمل ترجمہ پہلے انگریزی میں ہوا اور اس کے بہت دیر بعد کسی مسلم زبان میں۔ (اوراقِ حکمت، ڈائری، 15 جون 1985)

مولانا عبد العزیز قاسمی مدرسہ بیت العلوم (دفع احسن سُریا پیٹ، ضلع نلگنڈہ) میں استاد ہیں انہوں نے 1983 کا ایک واقعہ بتایا۔

کڈپہ (آندھرا پردیش) میں سیرت النبی کا جلسہ تھا۔ مولانا عبد العزیز قاسمی بھی اس جلسہ میں مقرر کی حیثیت سے بلائے گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ جلسہ سڑک پر ٹینٹ لگا کر کیا جا رہا تھا۔ شامیانہ کے نیچے فرش اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ عین اس وقت ہندوؤں کا ایک جلوس نکلا۔ یہ کسی دیوی کا جلوس تھا۔ وہ گزرتا ہوا جلسہ گاہ کے قریب پہنچ گیا۔ جلسہ کے منتظمین نے جب یہ دیکھا تو ان کے چند افراد آگے بڑھ کر جلوس کے قائدین سے ملے۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو معلوم نہ تھا کہ اس سڑک سے آپ کا جلوس نکلنے والا ہے، ورنہ ہم یہاں آج اپنا جلسہ نہ رکھتے۔ بہر حال آپ ہمیں تھوڑا سا وقت دیں، ہم اپنا جلسہ تھوڑی دیر کے لیے روک کر ٹینٹ اور کرسیاں وغیرہ ہٹا دیتے ہیں۔ آپ کا جلوس جب گزر جائے گا تو اس کے بعد دوبارہ اس کو لگا لیں گے۔

جلسہ سیرت النبی کے لوگوں نے جب اس قسم کی پیشکش کی تو جلوس والوں کے دل نرم پڑ گئے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ جیسے ہمارا جلوس ہے ویسے ہی آپ کا جلسہ بھی ہے۔ آپ اپنے جلسہ کو گڑبڑ نہ کریں۔ ہم لوگ بازو کی گلی سے نکل کر پھر سڑک پر آجائیں گے۔ آپ کا جلسہ بھی جاری رہے گا۔ اور ہمارا جلوس بھی نکل جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ لوگ راستہ بدل کر آگے چلے گئے۔

مسلمان اگر جلوس کو روکتے تو بات بڑھتی اور فساد ہوتا، مگر جب مسلمانوں نے جلوس کو نہیں

روکا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ جولوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم اگر نرمی اختیار کریں تو وہ لوگ اور زیادہ دلیر ہو جائیں گے، انھیں اس واقعہ سے سبق لینا چاہئے۔ (ڈائری، 10 اکتوبر 1984)

مسلّمہ دلیل

شاہ ولی اللہ دہلوی (1762-1703) نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "مصطفوی شریعت کے لیے وقت آ گیا ہے کہ برہان اور دلیل کے پیراہنوں میں ملبوس کر کے اسے میدان میں لایا جائے"۔ شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ حقیقتاً اسی موضوع پر لکھی گئی ہے، مگر وہ روایتی اسلوب میں ہے۔

قدیم زمانہ روایتی زمانہ تھا۔ قدیم زمانہ میں روایتی استدلال کافی ہوتا تھا، مگر آج کا انسان روایتی استدلال کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ عقلی اور سائنسی اسلوب میں بات کو سمجھنا چاہتا تھا۔

مثال کے طور پر ہندستان کے مسلم علما سب کے سب یکساں سول کوڈ کے مخالف ہیں۔ مگر اس کی مخالفت کے لیے ان کے پاس کہنے کی جو بات ہے وہ صرف یہ کہ یہ ہماری شریعت میں مداخلت ہے اور ہم شرعی مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کے جواب میں جدید طبقہ کہتا ہے کہ یہ کوئی دلیل نہیں۔ اگر آپ یکساں سول کوڈ کے خلاف ہیں تو آپ کو عقلی اور سائنسی دلیل سے اسے ردّ کرنا ہوگا۔ ورنہ آپ کی بات نہیں مانی جائے گی۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ ہم اپنے نقطہ نظر کو مخاطب کے مسلّمہ دلائل سے ثابت کریں۔ (دیکھیں: الرسالہ ستمبر 1995) (ڈائری، 23 جون 1990)

عصری اسلوب کی اہمیت

دکتورعبدالعظیم محمود الدیب (پیدائش 1929) کی ایک کتاب ڈاک سے ملی۔ اس کا نام ہے: الْمَنْهَجُ فِي كِتَابَاتِ الْغَرْبِيِّينَ عَنِ التَّارِيخِ الْإِسْلَامِيِّ۔ وہ 130 صفحات پر مشتمل ہے۔ اور ربیع الثانی 1411 میں قطر سے چھپی ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے وسط تک مستشرق علما نے ساٹھ ہزار کتابیں اسلام کے بارے میں شائع کی ہیں۔ ان کتابوں کا مقصد کیا ہے۔ ان کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ مسلم نوجوانوں کو اسلام سے منحرف کر دیا جائے۔ اپنے اس مقصد میں وہ کافی کامیاب ہوئے ہیں حتیٰ کہ محمد محمد حسین مرحوم کے الفاظ میں ہمارے قلعوں کے لیے آج خود ہمارے اندر سے خطرات پیدا ہو گئے ہیں: حُصُونُنَا مُهَدَّدَةٌ مِنْ دَاخِلِهَا (صفحہ 35)۔

یہ صحیح ہے کہ ہماری نئی نسل اسلام کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہوئی ہے۔ مگر اس کی اصل وجہ مستشرقین کی کتابیں نہیں۔ اس کی زیادہ بڑی وجہ یہ ہے کہ خود مسلم علما دینِ اسلام کو وقت کے فکری مستوی پر پیش نہ کر سکے۔ بیرونی خطرات ہمیشہ موجود تھے اور ہمیشہ موجود رہیں گے۔ لیکن اگر ہم طاقت ور اسلوب میں اسلامی لٹریچر پیش کرسکیں تو اسلام کے خلاف ہر خطرہ اور ہر سازش ان شاء اللہ غیر موثر ہو کر رہ جائے گی۔ (ڈائری، 15 اکتوبر 1990)

عظیم انقلابی رہنمائی

مولانا عبد المتین بنارسی سے گفتگو کرتے ہوئے صحیح مسلم کی اس روایت کا ذکر آیا جو تابیر نخل کے بارے میں ہے اور جس میں ہے کہ آپ نے فرمایا: أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ (حدیث نمبر 2363)۔ یعنی تم اپنے دنیا کے معاملہ کو زیادہ جانتے ہو۔

میں نے کہا کہ یہ حدیث مذہب کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب کو بتا رہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسانی معاملات دو قسم کے ہیں۔ ایک معاملات کا اخلاقی پہلو۔ دوسرا وہ جس کو معاملات کا ٹیکنکل پہلو کہہ سکتے ہیں۔ مذکورہ حدیث نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ اخلاقی پہلو کو خدائی ہدایت کا پابند بتاتے ہوئے ٹیکنکل پہلو کے بارے میں کہہ دیا کہ اس کو تحقیق اور تجربہ کی بنیاد پر قائم کرو۔ گویا دینی مطالعہ کو سائنسی ریسرچ سے جدا کر دیا گیا۔

دوسرے مذاہب اپنی موجودہ شکل میں ان دونوں پہلوؤں کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ انہوں نے ٹیکنکل پہلو کو بھی مذہبی عقائد کے تابع کر رکھا ہے۔ مثلاً عیسائی مذہب میں سورج اور زمین کی گردش کے معاملہ کو مذہبی عقیدہ کی حیثیت دے دی گئی۔

ٹیکنکل پہلو کو اس طرح مذہبی عقیدہ کے ماتحت کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ درخت کے پھل کی پیداوار کم ملے گی۔ انسان قیمتی گوشت کے فائدے سے محروم رہے گا۔ کائنات کے حقائق انسان کے اوپر ظاہر نہیں ہوں گے۔ وغیرہ۔ مذکورہ طریقہ کی بنا پر دوسرے مروجہ مذاہب سائنسی تحقیق اور ترقی کا دروازہ بند کرتے ہیں۔ اس کے برعکس، اسلام نے سائنسی ترقی کا دروازہ آخری حد تک کھول دیا ہے۔ (ڈائری، 9 مئی 1989)

شعوری ایمان

قاضی مجتبیٰ حسن زنجانی (پیدائش 1915) حکومت ہند میں جوائنٹ چیف کنٹرولر امپورٹ اینڈ اکسپورٹ تھے۔ 14 فروری 1983 کی ملاقات میں انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ بتایا۔

1935 میں جب کہ وہ الہ آباد میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اصغر گونڈوی (1884-1936) بھی وہاں مقیم تھے۔ اصغر صاحب اس وقت ہندوستانی اکیڈمی کے سہ ماہی رسالہ "ہندوستانی" کے مدیر تھے۔ جناب زنجانی صاحب اور ان کے کچھ نوجوان ساتھی ایک روز اصغر گونڈوی سے

ملنے کے لیے گئے۔ وہاں مجلس میں ایک اور صاحب موجود تھے جوان طلبہ کے آزادانہ خیالات سے واقف تھے۔ انہوں نے اصغر گونڈی سے کہا:

''حضرت یہ لڑکے انگریزی پڑھ کر دہریے ہو گئے ہیں''۔

اصغر گونڈی یہ سن کر فوراً سنجیدہ ہو گئے۔ ان کو دہریہ نہ کہو۔ ''انہوں نے کہا۔ '' یہ ابھی ''لا الہ'' کی منزل میں ہیں۔ اس کے بعد جب وہ ''الا اللہ'' کی منزل میں پہنچیں گے تو وہ تم سے اچھے مسلمان ہوں گے''۔

اصغر گونڈوی کے اس جملہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے ایک واقعہ کے تاریک پہلو کو لینے کے بجائے اس کے روشن پہلو کو لیا۔ خدا اور مذہب کے بارے میں ایک آدمی کی تشکیکی خیالات کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر خدا اور مذہب کا منکر ہو۔ مگر اسی کے ساتھ یہاں دوسرا امکان بھی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی تلاش کے مرحلہ میں ہو۔ اصغر گونڈوی نے نوجوانوں کی ''دہریت'' کو انکار کے معنی میں لینے کے بجائے اس کو تلاش کے معنی میں لیا۔

اس کے اندر ایک اور حکمت بھی ہے۔ وہ یہ کہ '' تلاش'' کے مرحلہ سے گزر کر جو شخص ''یافت'' کے مرحلہ تک پہنچتا ہے اس کا ایمان بے حد پختہ ہوتا ہے۔ جو آدمی شعوری طور پر ''نہیں'' کا انکار کرے اور شعوری طور پر ''ہے'' کو اختیار کرے تو اس کے ایمان میں جوش اور یقین اور زندگی ہوتی ہے۔ اس کا ایمان ان لوگوں سے بہت بلند ہوتا ہے جنہوں نے ''نہیں'' کا تجربہ نہیں کیا۔ جن کو نسلی اور روایتی طور پر ایک عقیدہ مل گیا اور وہ اس سے مانوس ہو کر اس سے وابستہ ہو گئے۔

روایتی ایمان ایک آبائی تقلید ہوتا ہے۔ اور شعوری ایمان ایک ذاتی دریافت۔ اول الذکر ایمان آدمی کی زندگی کا بس ایک ضمیر ہوتا ہے۔ جبکہ ثانی الذکر ایمان اس کے وجود میں خون اور حرارت بن کر داخل ہو جاتا ہے۔ ایک اگر بے روح ایمان ہے تو دوسرا حقیقی معنوں میں زندہ ایمان۔ (الرسالہ، مئی 1983)

آج کی نوجوان نسلیں

موجودہ زمانے کے نوجوانوں کا مسئلہ صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ ان کے ذہن میں کچھ مثبت سوالات ہیں۔ مگر ہمارے رہنما ان سوالات کے جوابات منفی انداز میں پیش کررہے ہیں۔ یہ ایک تضاد کی صورت حال ہے، اور یہی تضاد آج کے نوجوانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ آج کا نوجوان بھٹکا ہوا نوجوان نہیں ہے، بلکہ وہ متلاشی (seeker) نوجوان ہے۔

بے لاگ تجزیہ بتاتا ہے کہ آج کل کے نوجوانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کے بزرگوں نے ان کو یہ بتایا کہ دور جدید ایک مخالفِ مذہب دور ہے۔ اس سوچ کے تحت ہمارے بزرگوں نے نوجوانوں کو یہ ٹارگٹ دیا کہ وہ دور جدید کو بدلیں۔ اس بنا پر ہماری کئی نسلیں خود ساختہ نظریے کے تحت دور جدید سے لڑتی رہیں۔ لیکن عملاً ان کو ناکامی کے سوا کچھ اور نہیں ملا۔

اس مسئلے کا حل صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ ہمارے بزرگ کھلے طور پر اعتراف کریں کہ ان کی نشاندہی غلط تھی۔ وہ اعلان کریں کہ دورِ جدید جو سائنس کی دریافتوں کے تحت بنا ہے، وہ ایک موافق مذہب دور تھا، لیکن ہمارے بزرگوں نے خلاف واقعہ طور پر اس کو مخالف مذہب دور کی حیثیت دے دی، اور ہماری جدید نسل نے بے فائدہ طور پر اس کے خلاف نظری یا عملی جنگ چھیڑ دی۔ اس کے نتیجہ میں مایوسی کے سوا ان کو کچھ اور نہیں ملا۔

اب کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ آج کے نوجوانوں کو یہ بتایا جائے کہ جدید دور ایک موافق مذہب دور ہے۔ جدید تہذیب ایک موافق مذہب تہذیب ہے۔ جدید دور نے ہمارے لیے نئے مواقع کھول دیے ہیں، جن کو اویل کرکے ہم تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ مثلاً قدیم دور توہمات کا دور (age of superstitions) تھا، آج کا دور حقائق کا دور ہے۔ قدیم دور جبر کا دور تھا، آج کا دور آزادی کا دور ہے، وغیرہ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہم نوجوانوں کو ایک امید بھرا نیا آغاز دے سکتے ہیں۔

(الرسالہ، مارچ 2020)

کرنے کا کام

مولانا عبد الماجد دریابادی (1892-1977ء) کے دادا مفتی محمد مظہر کریم صاحب اپنے وقت کے ایک ممتاز عالم تھے۔ 1857ء کے ہنگامہ میں علما نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا جو فتویٰ دیا، اس پر ان کے بھی دستخط تھے۔ اودھ کے دوسرے علما مثلاً مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد (مؤلف علم الصیغہ) وغیرہ کے ساتھ انھیں بھی حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔

قید کے زمانہ میں کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ مولانا مظہر کریم صاحب نے ایک ضخیم عربی کتاب کا اردو ترجمہ کر ڈالا۔ وہاں کے انگریز افسر کو اس کی خبر ملی تو اُس نے اس کو ایک ’’علمی کارنامہ‘‘ قرار دیا، اور اتنا خوش ہوا کہ حکومت سے ان کے حق میں پرزور سفارش کی۔ اس سفارش کے بعد اگرچہ فوری طور پر ان کی رہائی نہ ہوسکی، تاہم ان کی قید کی میعاد میں کافی کمی کر دی گئی — سیاسی حریف کی حیثیت سے انگریز مولانا مظہر کریم کا دشمن تھا، علمی اور تعمیری کام کرنے والے کی حیثیت سے وہ ان کا دوست بن گیا۔

یہ چھوٹا سا واقعہ ہماری جدید تاریخ کی تصویر ہے۔ جن میدانوں میں ہمارے لیے کام کے مواقع تھے، وہاں کام کرنے سے ہم کو کوئی دلچسپی نہیں ہوئی، اور جس میدان میں کام کا موقع نہیں ہے، وہاں ہم اپنا سر ٹکرا رہے ہیں۔ مزید نادانی یہ کہ اس لاحاصل کام کا نام ہم نے جہاد رکھ لیا ہے۔ (الرسالہ، جنوری 1982)

مخالفت یا غلط فہمی

برطانیہ کی کرسچین مشنری کے ایک ممبر کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ قرآن کا مطالعہ کر کے ایسی چیزیں جمع کریں جن کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔ اس منصوبے کے

مطابق، انہوں نے قرآن کے انگریزی ترجمے کا مطالعہ شروع کر دیا۔ کچھ دنوں کے مطالعے کے بعد وہ قرآن سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے مسیحی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرلیا۔ قبول اسلام کے بعد ان کا نام یہ رکھا گیا: داؤد بر بانک (Dawud Burbank)۔ اس کے بعد انہوں نے عربی زبان اور دینی تعلیم کے حصول کے لیے 1980 میں جامعہ اسلامیہ (مدینہ) میں داخلہ لیا۔ فراغت کے بعد انہوں نے پچاس 50 سے زیادہ عربی کتابوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ قبول اسلام کے بعد انہوں نے پاکستان کی ایک مسلم خاتون سے شادی کرلی۔ وہ دونوں حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ یکم نومبر 2011 کو مکہ جاتے ہوئے ایک روڈ حادثے میں ان دونوں کا انتقال ہو گیا۔ بوقت وفات ان کی عمر 49 سال تھی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر مخالفت کا سبب صرف ایک ہوتا ہے، اور وہ غلط فہمی (misunderstanding) ہے۔ درست طرزِ عمل یہ ہے کہ کسی کو محض ظاہری مخالفت کی بنا پر دشمن قرار نہ دیا جائے اور نہ اسے اپنے سے الگ سمجھا جائے۔ بلکہ ان کے کیس کو غلط فہمی کا کیس سمجھا جائے، اور سنجیدہ انداز میں ان کو اسلام کا مطالعہ کرایا جائے۔ اس کے بعد وہی ہوگا جس کی خبر قرآن میں ان الفاظ میں دی گئی ہے: بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں۔ تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو، پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس شخص میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا (41:34)۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ بعد کو مختلف اسباب سے اس کی رائے کسی کے بارے میں منفی اور کسی کے بارے میں مثبت بن جاتی ہے۔ یہ رائے اکثر حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ وہ غلط فہمی پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر آدمی کو مطالعے کا موقع دیا جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ معاملے کی صحیح نوعیت کو سمجھ جائے اور اپنی غلط سوچ کی اصلاح کر لے۔

جدید افکار اور مسلم علما

شیخ محمد امین شنقیطی (وفات 1974) مشہور عرب عالم تھے۔ ان کا ایک واقعہ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: شیخ شنقیطی اکثر کہا کرتے تھے کہ ہمارے علما دینی بصیرت کے ساتھ جب تک سائنسی علوم حاصل نہیں کریں گے، اور ہمارے نوجوان ان سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ اس وقت تک فکری غلبہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ اس وقت یورپ کے افکار دنیا میں چھائے ہوئے ہیں۔ اور ان کا جواب ان کی زبان میں دینا ہوگا۔ (ماہ نامہ دار العلوم، مارچ 2010، صفحہ 35)

جدید مغربی افکار کے بارے میں مسلم علما کا عام ذہن یہی ہے۔ وہ ان کو اسلام پر مغرب کے فکری حملے کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ جس چیز کو اپنی ضرورت سمجھتے ہیں، وہ صرف یہ ہے کہ اہل اسلام کی طرف سے ان کا دفاعی جواب دیا جائے۔ یہ مغربی افکار کا صرف کمتر اندازہ ہے۔ مغربی افکار، دوسرے الفاظ میں سائنس کی زمین پر پیدا شدہ افکار کا نام ہیں، اور سائنس علوم فطرت کا دوسرا نام ہے۔ اس اعتبار سے، سائنس خود اسلام کے لیے ایک تائیدی علم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جدید طبیعی سائنس اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اسلام کا جدید علمِ کلام ہے۔

اِس معاملے میں مسلم علما کی یہ ہلاکت خیز غلطی ہے کہ وہ مغربی سائنس سے مغربی کلچر کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہ دیکھ سکے۔ اپنی عدمِ واقفیت کی بنا پر وہ دونوں کو ایک دوسرے کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ مغربی سائنس کا علم کتابوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور انھوں نے یہ کتابیں پڑھی نہیں۔ اس کے برعکس، مغربی کلچر کا معاملہ یہ ہے کہ وہ کتابی مطالعے کے بغیر جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے مغربی کلچر کو دیکھ کر یہ فرض کرلیا کہ یہی معاملہ مغربی سائنس کا بھی ہے۔ یہ مسئلہ ”جواب“ دینے کا نہیں ہے، بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ جدید سائنسی علم کو اسلام کے حق میں استعمال کیا جائے (حکمتِ اختلاف، صفحہ 90)۔

جمہوریت کا دور

مولانا محمد الحسنی مشہور عربی مجلہ البعث الاسلامی (ندوہ، لکھنو) کے بانی تھے۔ ان کا انتقال 44 سال کی عمر میں 1979 میں ہوا۔ ان کے انتقال پر مولانا محمد منظور نعمانی (وفات 1997) نے ایک مضمون شائع کیا تھا، اس مضمون کا ایک جزء یہ تھا: 11 جون 1979 کی شام کو "البعث الاسلامی" کا شمارہ میرے پاس آیا۔ مغرب اور عشاء کے درمیان میں نے سب سے پہلے اس کا افتتاحیہ پڑھا۔ جو عزیز مرحوم محمد الحسنی کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا: "سُؤَالٌ حَائِرٌ يَحْتَاجُ إِلَى جَوَابٍ"۔ یہ سات صفحے کا مضمون تھا۔ اس میں ممالک اسلامیہ عربیہ خاص کر سعودی مملکت کے ذمہ داروں سے وہ باتیں صاف صاف کہی گئی تھیں، جن کا اس طرح صاف صاف کہا جانا یہ ان کی خیر خواہی کا بھی تقاضا تھا، اور ازروئے دین فرض ہو گیا تھا"۔ (ماہ نامہ الفرقان، لکھنو، مارچ 2013، صفحہ 8)

پچھلے دو سو سال کا زمانہ پریس کا زمانہ ہے۔ اس پوری مدت میں مسلم علما اور مسلم رہنماؤں نے احیائے ملت کے نام پر بے شمار تحریکیں چلائی ہیں، مگر ان تحریکوں کا خاص نشانہ زیادہ تر صرف ایک تھا، اور وہ تھا، حکمرانوں کو خطاب کر کے ان کی ذمہ داریاں یاد دلانا۔ سید جمال الدین افغانی (وفات 1897) سے لے کر اکیسویں صدی کے مسلم قائدین تک تقریباً سب لوگ اس اسلوب کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ مگر دو سو سال سے زیادہ مدت کی پرجوش جدو جہد کے باوجود یہ تحریکیں مکمل طور پر ناکام ہیں۔ اس ناکامی کا سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے۔ دورِ جمہوریت میں دورِ بادشاہت کے اسلوب پر کام کرنا۔

قدیم زمانے میں حکمرانوں کو خطاب کیا جاتا تھا، مگر موجودہ جمہوری زمانے میں کام کا نتیجہ خیز طریقہ صرف ایک ہے اور وہ ہے عوام کے اندر ذہنی بیداری لانا۔ مسلم قائدین جس طریقِ کار پر قائم ہیں۔ وہ ایک قسم کی خلافِ زمانہ روش ہے۔ اور فطرت کے قانون کے مطابق، اس قسم کی روش کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

موجودہ زمانہ ایک نیا زمانہ تھا۔ اس وقت موثر کام کرنے کے لیے ضروری تھا کہ زمانی حالات کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا جائے، یہ سمجھا جائے کہ جدید تقاضے کیا ہیں، اور پھر انہی کے مطابق اسلامی کام کی منصوبہ بندی کی جائے۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ لوگوں نے پر جوش تقریر و تحریر کو کافی سمجھ لیا۔ یہ بلا شبہ ایک غلط اندازہ تھا۔ اس غلطی کا نتیجہ تھا کہ موجودہ زمانے میں بے شمار قربانیوں کے باوجود مطلوب نشانہ حاصل نہ ہو سکا۔

نقصان در نقصان

مولانا اختر احسن اصلاحی (وفات 1957) مدرسۃ الاصلاح کے صدر مدرس تھے۔ ایک بار انہوں نے ایک مسلمان عالم کا نام لے کر کہا کہ وہ عربی زبان پر نہایت عمدہ قدرت رکھتے ہیں۔ اور فلاں عرب سفارت خانے میں کام کرتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان کو ادب عربی کے استاد کی حیثیت سے اپنے مدرسہ میں بلاؤں۔ مگر میں ان کو سفارت خانے والی تنخواہ نہیں دے سکتا۔ اس لیے میں اپنے مدرسہ کے لیے ان کو حاصل بھی نہیں کر سکتا۔

یہ بات چالیس سال پہلے کی ہے۔ اب یہ صورت حال چالیس گنا سے بھی زیادہ بڑھ چکی ہے۔ آج ہماری تمام بہترین صلاحیتوں کو سیکولر ادارے استعمال (avail) کر رہے ہیں، مسلم اداروں کو ان کا کوئی حصہ حاصل نہیں۔

تیسری دنیا (Third world) کی اصل کمزوری یہ ہے کہ اس میں سب تیسرے درجہ کے لوگ بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں جتنے اعلیٰ درجہ کے افراد تھے، اور جو اونچی تعلیم پائے ہوئے تھے، وہ ملینوں (Millions) کی تعداد میں یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ وہاں ان کو زیادہ پیسہ اور زیادہ بہتر مواقع حاصل ہیں۔ یہی تمام مسلم قوموں کا حال ہے۔ اور یہی غیر مسلم اقوام کا حال بھی۔

ہندستان اور پاکستان کے مسلم اداروں کو دیکھیے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ان اداروں کی کارکردگی اچھی نہیں۔ ان اداروں میں کام کا وہ معیار نہیں رہا جو پہلے وہاں پایا جاتا تھا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اعلیٰ ذہن تقریباً سب کے سب بیرونی ملکوں میں چلے گئے۔ اب صرف کم تر صلاحیت کے لوگ باقی رہ گئے ہیں، جو مسلم اداروں کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اور جن اداروں میں کمتر صلاحیت کے لوگ بھرے ہوئے ہوں، ان کی کارکردگی کا معیار کمتر کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ اعلیٰ کام ہمیشہ اعلیٰ آدمی کرتے ہیں۔ جب اعلیٰ آدمی ہی نہ رہیں تو اعلیٰ کام کیسے ہوسکتا ہے۔

اس صورت حال کا سب سے زیادہ عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے اکابر سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت تک مغربی اقوام کو سب سے بڑی برائی بتاتے رہے۔ انہوں نے ملّت کے تمام بہترین وسائل اس محاذ پر لگا دیے کہ ان بیرونی اقوام کی غلامی سے ملّت کو رہائی دے سکیں۔ مگر جب ناقابل بیان قربانیوں کے بعد بیرونی قومیں ہمارے ملکوں سے واپس چلی گئیں تو اب یہ حال ہے کہ ہمارے تمام بہترین افراد اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر خود مغربی ملکوں میں پہنچ گئے اور اب وہ انھیں قوموں کے زیر سایہ زندگی گزارنے کو فخر سمجھ رہے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان ترقی اور کامیابی چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو انسان کے اندر سے کبھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ماضی کے رہنماؤں نے اگر ایسا کیا ہوتا کہ جن بے شمار وسائل کو وہ مغربی قوموں کے خلاف لڑائی میں استعمال کرتے رہے ان کو وہ خود اپنے ملک کی علمی اور تمدنی ترقی میں استعمال کرتے تو دردناک مہاجرت کا یہ واقعہ، کم از کم اتنے بڑے پیمانے پر ہرگز پیش نہ آتا۔ ایسی صورت میں حوصلہ مند افراد خود اپنے ملک میں وہ مواقع پا لیتے جن کو استعمال کرکے وہ اعلیٰ ترقی حاصل کرسکیں۔

تیسری دنیا میں آزادیِ عمل کے مواقع نہ ہونا، اعلیٰ معیار کے تعلیمی اداروں کا فقدان، اپنے حوصلوں کے مطابق ترقی کے راستہ میں بڑھتے رہنے والے حالات کی غیر موجودگی، یہ وہ

چیزیں ہیں جو اس واقعہ کو ظہور میں لا رہی ہیں جس کو مشرقی ذہن کا مغربی دنیا کی طرف نکاس (brain drain) کہا جاتا ہے۔

اجتماعی حالات بے حد نازک ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ بے شمار پیچیدگیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ اجتماعی زندگی میں کوئی اصلاحی کام کرنا الجھے ہوئے دھاگے کو سلجھانے کے ہم معنی ہے۔ ایسی حالت میں اجتماعی زندگی میں نعروں کی سیاست لے کر اصلاح کے لیے کھڑا ہونا سنجیدگی کا عمل نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ نادانی کی چھلانگ ہوگی۔ (الرسالہ، جنوری 1989)

ٹیم ورک کی اہمیت

مولانا مناظر احسن گیلانی (وفات 1956) ایک بار دارالمصنفین (اعظم گڑھ) آئے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مولانا سید سلیمان ندوی (وفات 1953) یہاں رہا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی ذاتی محنت سے بہت سی اہم کتابیں تصنیف کی تھیں۔ اِس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا گیلانی نے کہا — یورپ میں جو کام اکادمی کرتی ہے، ہندستان میں اُس کو اک آدمی کرتا ہے۔ میں کہوں گا کہ قدیم حالات میں کوئی ایک شخص بھی بڑا کام کرسکتا تھا۔ لیکن موجودہ حالات میں کوئی بڑا کام کرنے کے لیے ٹیم ورک لازمی طور پر ضروری ہو گیا ہے۔

موجودہ زمانے میں علم کا جو اعلیٰ معیار قائم ہوا ہے، اُس اعلیٰ معیار پر کوئی بڑا علمی کام ایک فرد انجام نہیں دے سکتا، اُس کو انجام دینے کے لیے ایک ٹیم درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں تمام بڑے بڑے علمی کام ٹیم کے ذریعے انجام پاتے ہیں۔ مسلمان موجودہ زمانے میں وقت کے اعلیٰ علمی معیار پر کوئی کتاب تیار نہ کر سکے۔ اُس کا سبب یہی ہے کہ اُن کے یہاں ابھی تک ایک فرد کتاب لکھتا ہے، اکیڈمک ورک (academic work) کا ابھی تک مسلمانوں کے یہاں رواج نہیں۔

اِس معاملے میں ایک سبق آموز مثال قرآن کے انگریزی ترجمے کی ہے۔ پرنٹنگ پریس کے زمانے میں، قرآن کے بہت سے انگریزی ترجمے کیے گئے ہیں۔ اکثر انگریزی ترجمے ہمارے یہاں موجود ہیں۔ یہ تمام ترجمے شخصی کوشش کے ذریعے تیار کیے گئے ہیں۔ میں عرصہ دراز سے قرآن کے انگریزی ترجمے دیکھتا رہا ہوں۔ میں نے پایا ہے کہ ہر ترجمے میں دو بنیادی کمی پائی جاتی ہے۔ ایک، یہ کہ بہت سے مقامات پر ترجمے غلط کیے گئے ہیں، اور دوسری بات یہ کہ اِن ترجموں میں وضوح (clarity) بہت کم ہے۔ قرآن کی خاص صفت یہ ہے کہ اس کے اندر کمال درجے میں وضوح پایا جاتا ہے۔ لیکن اِن انگریزی ترجموں میں قرآن کی یہی اہم صفت بڑی حد تک موجود نہیں۔

قرآن کے موجودہ انگریزی ترجموں میں اِس کمی کا احساس مجھ کو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ یہ احساس مجھ کوستاتا تھا کہ وقت کی بین اقوامی زبان میں خدا کی کتاب کا صحیح اور موثر ترجمہ موجود نہیں۔ میں اِس کام کو وقت کے مسلّمہ معیار پر کرنا چاہتا تھا۔ اِس کے لیے میں نے بہت سے اہلِ علم کو متوجہ کرنا چاہا، مگر کوئی اِس کے لیے تیار نہ ہوا۔ آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود اِس کام کی ذمے داری لوں اور ٹیم ورک کے ذریعے قرآن کا مطلوب انگریزی ترجمہ تیار کرنے کی کوشش کروں۔

پچھلے تقریباً بیس سال سے میں اور میرے ساتھی خاموشی کے ساتھ اِس کام میں اپنی کوشش صرف کرتے رہے ہیں۔ میرے سوا، کئی لوگ مثلاً ڈاکٹر فریدہ خانم، ڈاکٹر ثانی اثنین خاں وغیرہ اِس مشکل کام میں ڈیڈی کیشن کے ساتھ مشغول رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے قرآن کا یہ انگریزی ترجمہ تیار ہو چکا ہے اور اب (تادمِ تحریر) اُس کا دوسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ یہ انگریزی ترجمہ پورے معنوں میں ٹیم ورک کا نتیجہ ہے۔ اِس کے ذریعے پہلی بار قرآن کا ایک ایسا انگریزی ترجمہ وجود میں آیا ہے جو ان شاء اللہ درست بھی ہے اور وضوح (clarity) اُس کے اندر پوری طرح پایا جاتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ اسلام کا کلمہ ساری دنیا کے ہر گھر (عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ) میں پہنچ جائے گا (مسند احمد، حدیث نمبر 23814)۔ میرا احساس یہ ہے کہ اِس حدیث میں کلمۂ اسلام سے مراد کلام الٰہی (Word of God) ہے، یعنی قرآن۔ اِس حدیث میں جس واقعے کی پیشین گوئی کی گئی ہے، اُس کا تعلق پرنٹنگ پریس اور انفارمیشن ٹکنالوجی (Information technology) کے زمانے سے ہے۔ یہ صرف موجودہ پریس کے زمانے میں ممکن ہوا ہے کہ قرآن کے مطبوعہ نسخے تمام دنیا کے ہر گھر میں پہنچا دیے جائیں۔ اب جب کہ اللہ کی توفیق سے، وقت کی بین اقوامی زبان میں قرآن کا صحیح ترجمہ وجود میں آچکا ہے، پوری ملت کا یہ فرض ہے کہ وہ متحدہ کوشش کے ذریعے قرآن کے اِس نسخے کو سارے عالم تک پہنچا دے، وہ اُس کو دنیا کے ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں داخل کر دے۔

میرا احساس ہے کہ اِس طرح قرآن کا ساری دنیا میں، ہر گھر اور ہر مقام میں، پہنچ جانا اتمامِ حجت کا آخری واقعہ ہوگا۔ انسانی تاریخ غالباً اپنے آخری دور میں پہنچ چکی ہے۔ اِس آخری دور میں جو سب سے بڑا دعوتی کام انجام پانا ہے، وہ بلا شبہہ یہی ہے کہ خدا کا کلام خدا کے تمام بندوں تک ان کی قابلِ فہم زبان میں پہنچا دیا جائے۔ (الرسالہ، مارچ 2009)

جاننا کافی نہیں

بوعلی سینا (370-430ھ) بڑے عالم فاضل شخص تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ اپنے زمانہ کے ایک بزرگ شیخ ابوالخیر سے ملے اور ان کے یہاں چند دن گزارے۔ بوعلی سینا واپس جانے لگے تو انھوں نے شیخ ابوسعید ابوالخیر کی خدمت میں رہنے والے ایک شخص سے کہا: آج میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ تم ایسا کرنا کہ میرے بعد شیخ میرے بارے میں جو کچھ کہیں وہ تم ایک خط میں لکھ کر میرے پاس بھیج دینا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ شیخ کا خیال میرے بارے میں کیا ہے۔

بوعلی سینا کی واپسی کو کئی دن گزر گئے مگر شیخ ابوسعید ابوالخیر نے ان کے بارے میں کوئی بات نہ کہی۔ اچھا یا برا کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا۔ بالآخر کئی دن کے انتظار کے بعد مذکورہ شخص نے شیخ سے سوال کیا کہ حضرت، آپ کے پاس بوعلی سینا آئے تھے، وہ آپ کی نظر میں کیسے آدمی ہیں۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر نے جواب دیا کہ وہ ایک اچھے حکیم ہیں اور ان کے پاس بہت علم ہے۔ مگر وہ مکارم اخلاق نہیں رکھتے۔

مذکورہ شخص نے شیخ ابوسعید ابوالخیر کا یہ تبصرہ ایک کاغذ پر لکھا اور اس کو بوعلی سینا کے پاس بھیج دیا۔ بوعلی سینا نے اس کو پڑھا تو ان کو بڑا جھٹکا لگا۔ انہوں نے مذکورہ شخص کو اس کا جواب لکھ کر بھیجا۔ اس جواب میں انہوں نے یہ لکھا کہ مجھے تمھاری تحریر پر تعجب ہے۔ میں نے مکارم اخلاق پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ پھر شیخ میرے بارے میں کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں مکارم اخلاق نہیں جانتا۔ مذکورہ شخص نے بوعلی سینا کا یہ جواب شیخ ابوسعید ابوالخیر کو بتایا۔ وہ اس کو سن کر مسکرائے اور کہا:

من این نگفتم کہ مکارم اخلاق نداند، گفتہ ام کہ ندارد (فوائد الفواد، صفحہ 451)۔

یعنی، میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ مکارم اخلاق نہیں جانتے، میں نے یہ کہا کہ وہ مکارم اخلاق نہیں رکھتے۔

ایک چیز ہے "جاننا" اور ایک چیز ہے "ہونا"۔ جاننا ذہن اور حافظہ کی سطح پر ہوتا ہے۔ اور ہونا آدمی کے پورے وجود کی سطح پر۔ جاننے والا آدمی صرف جانتا ہے اور ہونے والا آدمی خود اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ جاننا بہت آسان ہے۔ کوئی بھی شخص پڑھ کر اور سیکھ کر دین و اخلاق کی باتوں کو جان سکتا ہے۔ مگر ہونا اتنا ہی زیادہ مشکل ہے۔ ہونے کے لیے آدمی کو اپنے آپ کو پیس ڈالنا پڑتا ہے۔ کیونکہ پسا ہوا سفوف ہی پانی میں گھلتا ہے نہ کہ جمے ہوئے ٹکڑے۔ مگر اصل اہمیت اعتبار کی ہے۔ اور حقیقت کی دنیا میں جو کچھ اعتبار ہے، وہ ہونے کا ہے، نہ کہ جاننے کا۔

جس جاننے کے ساتھ ہونا نہ ہو، حقیقت کی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔

(الرسالہ، ستمبر 1981)

اختلاف کو نظر انداز کیجیے

جنوبی ہند سے ایک عالمِ دین کا مکتوب موصول ہوا ہے، اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:
تمل ناڈو اور دوسرے علاقوں میں علمائے کرام مختلف اداروں، مثلاً مدرسہ یا مسجد، وغیرہ، سے منسلک ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ان کو ادارے کی انتظامیہ (management) سے کوئی شکایت ہو جاتی ہے، اس وقت وہ منفی رویہ اپنا کر اس ادارے سے نکل کر کسی دوسرے ادارے میں چلے جاتے ہیں، یا ایک نیا ادارہ قائم کر لیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ پریشان بھی رہتے ہیں، اور ان کا علمی سفر بھی رک جاتا ہے۔ کیوں کہ ادارہ کی ذمے داریاں سنبھالنے میں ان کا وقت گذر جاتا ہے۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ موجودہ زمانے کے علما کو صرف خروج علی الحاکم کے مسائل معلوم ہیں، خروج علی مینجمنٹ کے مسائل ان کو معلوم نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خروج ہر جگہ غیر مطلوب ہے، اس کا انھیں علم نہیں۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ علما اپنی علمی ذمے داریاں ادا کریں، اور ادارے کی انتظامیہ، وغیرہ اپنی ذمے داریوں کو سمجھیں تو معاملہ درست طریقے سے چلے گا۔ اس معاملے میں علما کے لیے یہ حدیث رسول ایک رہنما گائڈ کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: أَدُّوا إِلَيْهِمْ حَقَّهُمْ، وَسَلُوا اللَّهَ حَقَّكُمْ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7052)۔ یعنی، ان کا حق ان کو دو، اور اپنا حق اللہ سے مانگو۔ اگر اس حدیث کے مطابق عمل نہ کیا جائے، تو باعتبارِ نتیجہ صرف فساد برپا ہوگا، شکایت کا ازالہ نہیں ہوگا۔

اس سلسلے میں محدثین ہمارے لیے نمونہ ہیں۔ انہوں نے اپنی علمی اور دینی ذمے داریاں بھرپور طریقے سے ادا کی، لیکن وقت کے حکام سے جو شکایت تھی، اس کو نظر انداز کیا۔ جس کی وجہ سے آج ہم ان کے علمی ذخیرے سے فائدہ حاصل کررہے ہیں۔ آج علما کرام دلوں میں شکایت پالنے کی وجہ سے اپنے لیے مسائل میں اضافہ کرتے جارہے ہیں، مگر کوئی بڑا علمی ذخیرہ یا

کارنامہ نہیں ادا کررہے ہیں۔ تقریباً ہر عالم اپنی انتظامیہ اور متولیانِ مساجد کے خلاف شکایت کرتا ہوا نظر آتا ہے، یہاں تک کہ پوری زندگی شکایت کی نذر ہوجاتی ہے۔

آج علما صرف جلسوں یا کانفرنسوں میں نظر آجاتے ہیں، مگر ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کو کوئی علمی تحقیق یا علمی یادگار نہیں دے پاتے۔ اس کے بغیر ہی وہ دنیا سے شاکی ہو کر رخصت ہوجاتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ علما اپنی اس سوچ کی اصلاح کریں، وہ اپنی لاعلمی کو جانیں۔ وہ ادارے کی انتظامیہ کی نیتوں پر حملے ترک کریں، اس کے بجائے ان کو چاہیے کہ جو مواقع ان کو حاصل ہیں، ان پر وہ فوکس کریں، اور امت مسلمہ کو فائدہ پہنچائیں۔ (مولانا سید اقبال احمد عمری، عمر آباد، تامل ناڈو)

مکتوب نگار نے جو بات لکھی ہے، وہ بلا شبہ درست ہے۔ لیکن راقم الحروف کے نزدیک اس کا سبب ماضی کی تاریخ تک جاتا ہے۔ فقہائے متقدمین اس معاملے میں میرے نزدیک ٹرینڈ سیٹر (trend setter) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فقہائے متقدمین کے زمانے میں مسائل میں اختلافات پیدا ہوئے۔ اس وقت فقہائے متقدمین نے مسائل پر لامتناہی بحثیں چھیڑ دیں۔ یہ بلا شبہ ایک غلو تھا، جس کے نتیجے میں غیر ضروری طور پر فقہی مسالک بنے، اور بڑھتے بڑھتے ان مسائل کی بنیاد پر مختلف قسم کے فقہی گروپ بن گئے۔ فقہ صرف ایک ہے، اور وہ وہی ہے، جو صحابہ کرام کے زمانے میں عملاً موجود تھی۔ بعد کے زمانے میں فقہی بنیاد پر مختلف گروہ بن گئے، مثلاً حنفی فقہ، مالکی فقہ، شافعی فقہ، حنبلی فقہ، جعفری فقہ، وغیرہ۔ یہ وہی چیز تھی، جس کو قرآن میں تفرق فی الدین (الشوریٰ، 42:13-14) کہا گیا ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مشترک امور میں توحد کا طریقہ اختیار کیا جائے، اور اختلافی امور میں توسع کا طریقہ۔

علمائے فقہ کو اس معاملے میں توسع کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا، جس کی طرف ابن عبد البر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم وفضلہ (جلد 1، صفحہ 345) میں اشارہ کیا ہے۔ اس اختلافی مسائل میں غلو کے نتیجے میں ایک مبتدعانہ اصول پیدا ہوا، جس کو ترجیح کہتے ہیں۔ ترجیح کا طریقہ،

جوعلمائے فقہ کے درمیان رائج ہوا، وہ بلا شبہ ایک مبتدعانہ اصول تھا۔ صحیح اصول توسع ہے، نہ کہ ترجیح۔ عبادات میں اصل زور روح یعنی اسپرٹ پر دینا چاہیے، مگر ترجیح کی اس بحث نے یہ کیا کہ عبادات میں روحِ عبادت کا مسئلہ عملاً غیر اہم بن گیا، اور ساری بحث مسائل پر ہونے لگی۔ مسائل بالفاظ دیگر فارم پر ہونے لگی۔ اسی کا نتیجہ آخر کار وہ نکلا جس کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدَى (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 1763)۔ یعنی، ان کی مسجدیں آباد ہوں گی، لیکن وہ ہدایت سے خالی ہوں گی۔ یہی معاملہ اداروں کے ذمہ داران سے اختلاف کا ہے۔ اگر اس قسم کے معاملے کا آپ تجزیہ کیجیے تو آپ پائیں گے کہ یہ سارے اختلافات فروعی چیزوں میں ہیں، نہ کہ اصولی چیزوں میں۔ جب کہ اتحاد صرف اصولی مسائل میں ممکن ہے، فروعی مسائل میں ممکن ہی نہیں۔

اس معاملے پر شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے ہمیں یہ کرنا چاہیے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اسلام کے دورِ اول میں جب خروج علی الحاکم کا مسئلہ پیدا ہوا، تو علمائے اسلام نے اس پر کیا رویہ اختیار کیا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، اس پر علما کا یہ اجماع ہو گیا کہ حاکم کے خلاف خروج کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ امام نووی نے لکھا ہے: وَأَمَّا الْخُرُوجُ عَلَيْهِمْ وَقِتَالُهُمْ فَحَرَامٌ بِإِجْمَاعِ الْمُسْلِمِينَ وَإِنْ كَانُوا فَسَقَةً ظَالِمِينَ (شرح النووی علی صحیح مسلم، جلد نمبر 12، صفحہ 229)۔ یعنی، حاکم کے خلاف خروج کرنا، مسلمانوں کے اجماع سے حرام ہے، اگرچہ حاکم فاسق وظالم ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حاکم کے خلاف خروج نہ کرنا، مطلقاً مطلوب ہے۔ کوئی بھی عذر (excuse) اس معاملے میں خروج کو جائز نہیں کرتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خروج ایک اور چیز سے جڑا ہوا ہے، اور وہ ہے، استحکام (stability)۔ سماجی زندگی میں استحکام مطلق طور پر مطلوب ہے۔ کوئی بھی چیز جو استحکام کو نقصان پہنچائے، وہ بطورِ اصول قابلِ ترک ہے۔

قدیم زمانے میں یہ عمل سیاسی حاکم کے مقابلے میں اختیار کیا گیا تھا، موجودہ زمانے میں یہی اصول اس معاملے میں اپلائی ہوتا ہے، جب کہ ادارے کے ذمے دار کے خلاف

خروج کا معاملہ ہو۔ کسی کے لیے یہ تو جائز ہے کہ وہ کسی عذر کو لے کر خاموشی کے ساتھ ادارے سے الگ ہوجائے۔ وہ الگ ہونے سے پہلے بھی اس معاملے میں خاموش رہے، اور ادارے سے الگ ہونے کے بعد بھی خاموش رہے۔ ادارے کے خلاف یا ادارے کے ذمے داران کے خلاف شکایتیں کرنا، اور منفی باتیں کر کے لوگوں کے اندر شکایتی ماحول پیدا کرنا، ہرگز جائز نہیں۔ (الرسالہ، فروری 2020)

غلط معیارِ حق

مولانا عبدالسلام رحمانی ایک اہل حدیث عالم ہیں۔ آج کی ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ 1978 میں وہ فجی گئے۔ ان کی کوششوں سے وہاں اہل حدیث کا ایک حلقہ بن گیا۔ وہ میلاد النبی اور چالیسواں جیسے رواجوں پر تنقید کرتے تھے۔ اس بنا پر ایک عالم ان سے غصہ ہوگئے جو اگرچہ دیوبندی تھے مگر وہاں کے حالات کی بنا پر انھوں نے مبتدعانہ رسومات کی سرپرستی اختیار کرلی تھی۔ یہ دیوبندی عالم مولانا عبدالسلام کے خلاف ہوگئے۔ یہاں تک کہ گورنمنٹ میں شکایتیں کر کے انھوں نے ان کا امیگریشن کینسل کرایا۔ اب وہ واپس آ کر بستی کے ایک مدرسہ میں کام کرتے ہیں۔

کچھ دن پہلے مولانا عنایت اللہ سبحانی ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سعودی عرب کے مبعوث تھے اور وہاں کی تنخواہ پر جامعۃ الفلاح (بلریا گنج) میں کام کرتے تھے۔ وہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر بعض معاملات میں تنقید کرتے تھے۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے مقامی افراد ان پر غصہ ہوگئے۔ انھوں نے ان کے خلاف سعودی عرب کے متعلق محکمہ میں شکایتیں بھیجیں، یہاں تک کہ وہاں سے ان کی تنخواہ بند کردی گئی۔ اور ان کی مبعوث کی حیثیت ختم کردی گئی۔ اس طرح کوپا گنج کے مولانا ممتاز قاسمی نے بتایا کہ کوپا گنج میں وہ الرسالہ کی تائید کرتے تھے اور اس کی ایجنسی چلاتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ وہاں گورنمنٹ

کے پرائمری اسکول میں اردو ٹیچر تھے۔ الرسالہ کی بعض تنقیدوں کی بنا پر جمعیۃ علما ہند کے مقامی افراد مولانا ممتاز صاحب کے خلاف ہوگئے اور کوشش کرکے ان کی ملازمت ختم کرادی۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت اگر میں وہاں ہوتا تو مجھے چار ہزار روپیہ مہینہ مل رہا ہوگا۔ اب وہ بمبئی میں امامت کرتے ہیں۔

اس طرح کے واقعات غالباً اس لیے ہوتے ہیں کہ لوگوں نے اپنی شخصیتوں اور اپنی جماعتوں کو معیارِ حق سمجھ لیا ہے۔ اس بنا پر جب کوئی شخص ان کی شخصیت یا ان کی جماعت پر تنقید کرتا ہے تو وہ بلا دلیل یہ یقین کر لیتے ہیں کہ ناقد ضرور غلطی پر ہے۔ یہی جھوٹا یقین ان کو مذکورہ قسم کی تخریبی کارروائیوں پر آمادہ کرتا ہے۔ (ڈائری، 10 دسمبر 1996)

اسٹیج کا فتنہ

موجودہ زمانے میں ایک نیا فتنہ پیدا ہوا ہے، جس کو اسٹیج کا فتنہ کہا جا سکتا ہے۔ جس آدمی کے اندر شاندار شخصیت ہو، جو اچھا بولنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جو لوگوں کو خوش کرنے کا فن جانتا ہو، جو عوام پسند لہجہ میں بول سکے، اس کو فوراً اسٹیج مل جاتا ہے۔ اسٹیج ملتے ہی آدمی کی انا (ego) بوسٹ (boost) ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ واپس لوٹنا اس کے لیے ممکن نہیں رہتا۔

اسٹیج ایکٹوزم کے بظاہر دوسرے بہت سے فائدے ہیں — عوامی مقبولیت، ہر جگہ پذیرائی اور ہر قسم کے دنیوی ساز و سامان، وغیرہ۔ یہ چیزیں اس کے اندر مصنوعی شخصیت بنانے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اسی میں کنڈیشنڈ ہو جاتا ہے۔ جب یہ درجہ آجائے تو اس کے اندر محاسبہ کا ذہن ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں درست راستے پر ہوں۔ مجھے اپنے اندر کوئی تبدیلی لانے کی ضرورت نہیں۔

جو آدمی مین آف اسٹیج (man of stage) بن جائے، وہ بظاہر کامیاب نظر آتا ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ سب سے زیادہ ناکام انسان ہوتا ہے۔ اس کے اندر تنقید سننے کا مزاج ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے اندر ذہنی ارتقا کا عمل رک جاتا ہے۔ وہ تخلیقی فکر (creative thinking) کے قابل نہیں رہتا۔ وہ صرف آج (today) میں جینے لگتا ہے، کل (tomorrow) کی سوچ اس کے اندر ختم ہوجاتی ہے۔ وہ دوسروں کے اندر جینے لگتا ہے، خود اپنے آپ میں جینا کیا ہے، وہ اس سے ناآشنا ہوجاتا ہے۔

ایسا آدمی بظاہر پاتا ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک محروم انسان ہوتا ہے۔ اس کو ہر جگہ انسانوں کی بھیڑ ملنے لگتی ہے، لیکن فرشتوں کی صحبت اس کو حاصل نہیں ہوتی۔ وہ مادی اعتبار سے بھر پور ہوتا ہے، لیکن روحانی (spiritual) اعتبار سے وہ ایک خالی انسان ہوتا ہے۔ وہ بظاہر سب کچھ ہونے کے باوجود حقیقت میں کچھ نہیں ہوتا۔ (الرسالہ، جولائی 2019)

زیادہ بڑی طاقت

دو صاحبان ملاقات کے لیے آئے۔ دونوں دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ ان سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ قرآن ہمارے اندر یہ ذہن بنانا چاہتا ہے کہ ہم عسر میں یسر کو دیکھیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں ہمارے علما اس کا ثبوت نہ دے سکے۔

میں نے کہا کہ ہمارے علما فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ انگریزوں نے پروفیسر آرنلڈ کے ذریعہ کتاب پریچنگ آف اسلام (1896) لکھوائی تاکہ مسلمانوں کے عمل کا رخ سیاسی جہاد سے ہٹا کر دعوت وتبلیغ کی طرف موڑ دیں، مگر علمائے وقت اس سے متاثر نہیں ہوئے۔ اسی طرح 1930 میں انگریزوں نے علما کو یہ پیش کش کی کہ دہلی میں صفدر جنگ مقبرہ کا پورا علاقہ جو کئی کیلومیٹر میں پھیلا ہوا ہے، آپ لوگوں کو دے دیا جائے گا۔ یہاں آپ لوگ تعلیم وتبلیغ کا ادارہ

قائم کریں اور سیاسی ٹکراؤ کے میدان سے الگ ہوجائیں۔ مگر علما نے اس پیش کش کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کردیا اور بدستور انگریز کے خلاف سیاسی لڑائی میں مشغول رہے۔

اس کے بعد میں نے کہا کہ اگر ان علما نے قرآن وسنت کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ اس کو عین اسلام کے حق میں سمجھتے اور اس کو قبول کر لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عین وہی صورتحال تھی جو واقعہ حدیبیہ کے وقت پیش آئی۔ قریش نے مسلمانوں سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کرکے سمجھا کہ ہم نے مسلمانوں سے ان کی تلوار چھین لی۔ حالاں کہ اصل صورت حال یہ تھی کہ انھوں نے مسلمانوں سے ''تلوار'' چھین کر زیادہ بڑی طاقت انھیں دے دی، اور وہ دعوت کے کھلے مواقع تھے۔ چنانچہ دعوت کی تسخیری طاقت ظاہر ہوئی اور صرف دوسال کے اندر مکہ فتح ہوگیا۔

اسی طرح انگریز اگرچہ علما سے ''تلوار'' چھین رہے تھے، مگر اس کے بدلے وہ انھیں عالمی سطح پر تعارف اسلام کے ایسے کھلے مواقع دے رہے تھے جو بلاشبہ ہر تلوار سے زیادہ تسخیری طاقت رکھتے ہیں۔ علما کے شمشیری جہاد کا نتیجہ عملاً اسلام اور مسلمانوں کے حق نہیں نکلا۔ لیکن اگر وہ اُس وقت دعوت کے میدان میں متحرک ہوجاتے تو آج خطہ برصغیر کی تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔ (ڈائری، 17اگست1989)

فتووں کی شریعت

پرنٹنگ پریس 1440ء میں ایجاد ہوا۔ اس کا موجد جرمنی کا گوٹن برگ (Johannes Gutenberg) ہے۔ مسلم دنیا میں پرنٹنگ پریس زیادہ دیر میں عام ہوا۔ 1727ء میں ترکی میں ابراہیم متفرقہ نامی شخص نے پرنٹنگ پریس قائم کیا۔ پریس کا قیام کوئی معمولی واقعہ نہ تھا..... (مگر اس وقت کے) بااقتدار علما نے اسے ''بدعت'' تصور کیا، شیخ الاسلام نے فتویٰ دیا کہ (اس پر) مذہبی کتابوں کا چھاپنا شرعاً ممنوع ہے۔ (اشخاص وافکار، ضیاء الحسن فاروقی، صفحہ 17-16، این سی پی یو ایل، نئی دہلی، 2011)۔

حرمت کے فتووں کا رواج اصحابِ رسول کے زمانے میں موجود نہ تھا۔ بعد کے زمانے میں جب امت میں زوال آیا تو علما تقلید کی روش پر قائم ہو چکے تھے۔ وہ ہر نئی چیز کو توحش کی نظر سے دیکھنے لگے۔ وہ ہر نئی چیز کو شریعت کے خلاف سمجھنے لگے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ حرمت کے فتووں کا رواج عام ہوا۔ بدقسمتی سے یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

"حرمت کی شریعت" کے اس رواج کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب زمانے سے بے خبری (unawareness) ہے۔ بعد کے زمانے میں علما اپنے وقت کی علمی ترقیوں سے بے خبر ہو گئے۔ اس بنا پر وہ ہر نئی چیز کو غلط سمجھنے لگے۔ اگر یہ علما جدید حالات سے واقف ہوں، اگر وہ وقت کے علمی معیار پر نئے مسائل کا سامنا کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں تو وہ نئے حالات کا مطالعہ کریں گے۔ وہ علمی انداز میں اس کا تجزیہ کریں گے۔ اور پھر وقت کی علمی سطح پر اس کی نوعیت کو بیان کریں گے۔ وہ تکفیر کی زبان استعمال کرنے کے بجائے علمی تجزیہ کی زبان استعمال کریں گے۔ بلکہ وہ نئے پیدا شدہ حالات کو اپنے ذہنی ارتقا کے لیے فکری خوراک بنالیں گے۔ مگر بدقسمتی سے بعد کے زمانے کے مسلم علما اس اہلیت کا ثبوت نہ دے سکے۔ ہر چیز جوان کی سمجھ میں نہیں آئی، اس پر وہ منفی ردّ عمل کا اظہار کرنے لگے۔ یہ ذہنی جمود کی حالت ہے۔ اور ذہنی جمود کی حالت اسلام میں مطلوب نہیں۔ (الرسالہ، جولائی 2016)

تنگ ذہنی نہیں

مولانا بدر جمال اصلاحی (42 سال) ملاقات کے لیے آئے۔ وہ سرائمیر اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں اور آج کل جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ میں استاد ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ عرب عالم محمد المجذوب کی ایک کتاب مشاہداتی فی الہند ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے تفصیل سے میرا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وحید الدین خاں جس انداز میں دین کی خدمت کر رہے ہیں، وہی آج دین کی خدمت کرنے کا صحیح طریقہ ہے، وغیرہ۔

مولانا بدرجمال صاحب نے بتایا کہ ایک عالمِ دین سعودی عرب گئے۔ وہاں ان کی ملاقات شیخ محمد المجذوب سے ہوئی۔ انہوں نے ان سے کہا کہ وحیدالدین خاں کا آپ نے اپنی کتاب میں اتنے شاندار انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ حالاں کہ وہ تو ایک بےحیثیت آدمی ہیں۔ شیخ محمد المجذوب نے جواب دیا کہ اس معاملہ میں آپ مجھے معاف رکھیں۔ کیوں کہ آپ لوگوں (ہندستانی علما) کا ذہن بہت تنگ ہے۔ وہ اپنے سوا کسی کا اعتراف کرنا نہیں جانتے۔ (ڈائری، 4 فروری 1990)

دو آپشن کے درمیان

مولانا ابوالکلام آزاد (وفات 1958) نے اپنے بارے میں لکھا ہے:

"زمانے نے میری صلاحیتوں کی قدر نہ کی ....."

مولانا آزاد کے اِس جملے کا مطلب یہ تھا کہ پیدائشی فطرت کے اعتبار سے، وہ اعلیٰ صلاحیت کے مالک تھے، لیکن دوسرے لوگوں نے اُن کو نہیں پہچانا، اِس لیے ان کی صلاحیت پوری طرح استعمال نہ ہوسکی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ احساس صرف ایک آدمی کا احساس نہیں ہے۔ تاریخ میں بہت سے ایسے انسان ہیں جو اپنے احساس کے اعتبار سے غیر استعمال شدہ شخصیت کی حیثیت سے جیے اور اسی احساس کے ساتھ وہ اِس دنیا سے چلے گئے۔ ایسے افراد کو بظاہر دوسرے لوگوں سے شکایت تھی، مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے افراد اپنے اِس احساس کے لیے تمام تر خود ذمہ دار تھے، نہ کہ کوئی دوسرا شخص۔

خالق نے موجودہ دنیا کو جس قانون کے تحت بنایا ہے، اس کے مطابق، کسی انسان کے لیے یہاں صرف دو میں سے ایک کا انتخاب (option) ہے۔ ایک یہ کہ وہ کسی دوسرے کے بنائے ہوئے اسٹیبلشمنٹ کے آگے سرینڈر کرے، یا وہ اپنے لیے ایک خود تعمیر کردہ دنیا (self-created world) کو تخلیق کرے اور اس کے اندر اپنی مرضی کے مطابق رہے۔ اِن دو کے سوا کوئی اور انتخاب کسی شخص کے لیے ممکن نہیں۔

موجودہ دنیا مسابقت (competition) کے اصول پر مبنی ہے۔ اس دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی دوسرا شخص آپ کی قدر و قیمت کو پہچانے، اور وہ آپ کے ساتھ وہ سلوک کرے، جو بطور خود آپ اُس سے چاہتے ہیں۔ ایسا کبھی کسی انسان کے لیے نہیں ہوا۔ صلاحیتوں کو دینے والا اللہ رب العالمین ہے اور صلاحیتوں کا استعمال وہی شخص کرتا ہے جس کو صلاحیت دی گئی ہے۔ دوسرے آدمی سے زیادہ سے زیادہ جو امید کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ آپ کے کیے ہوئے کام کا اعتراف کرے۔ اِس دنیا میں کوئی بھی شخص آپ کے حصے کا کام نہیں کرسکتا۔ موجودہ دنیا کے لیے یہ مقولہ بالکل درست ہے — کرو یا مرو (do or die)۔ (الرسالہ، مارچ 2016)

اصلاحِ نصاب، یا اصلاحِ ماحول

مسلم رہنماؤں کے درمیان عرصے سے یہ تحریک چل رہی ہے کہ دینی مدارس کا نصاب (syllabus) بدلا جائے۔ یہ اصل مسئلے کا صرف کم تر اندازہ ہے۔ دینی مدارس میں بلا شبہ اصلاح کی ضرورت ہے، لیکن اِس ضرورت کا تعلق اصلاً اصلاحِ نصاب سے نہیں ہے، بلکہ اصلاحِ ماحول سے ہے۔ موجودہ حالت میں خواہ مدارس کا نصاب بدل دیا جائے یا اس کو باقی رکھا جائے، دونوں صورتوں میں یقینی طور پر مطلوب نتیجہ نکلنے والا نہیں۔

دینی مدارس کا اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہاں کا نصاب قابلِ تبدیلی ہے، دینی مدارس کا اصل مسئلہ وہاں کا قدامت پرستانہ ماحول ہے جس کو بدلنا ضروری ہے۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ دینی مدارس میں مکمل طور پر جمود (stagnation) کی فضا قائم ہے۔ اِن مدارس میں آزادانہ سوچ کو شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا ہے۔ مدارس کا یہی جامد ماحول مدارس کے جدید رول کی ادائیگی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جب تک اِس ماحول کو بدلا نہ جائے، مدارس سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ دورِ جدید میں اپنا مطلوب رول ادا کرسکیں گے۔

مولانا شبلی نعمانی (وفات 1914) نے لکھا تھا کہ ہمارے مدارس میں مُتون پڑھائے

جاتے ہیں، فنون نہیں پڑھائے جاتے۔ یہ ایک صحیح بات تھی۔ اِس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس میں اساتذہ اور طلبا کی سوچ تمام تر کچھ کتابوں اور ان کتابوں کے مصنفین پر مُرتکز رہتی ہے۔ وہ اِنھیں چند کتابوں کو علم سمجھتے ہیں اور ان کے مصنفین کو علما کا درجہ دیتے ہیں۔ اِس سے طلبا اور اساتذہ کے اندر بند ذہن پیدا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، اگر ہمارے مدارس میں فنون پڑھائے جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موضوعات (subjects) زیر بحث آنے لگیں گے۔ اِس طرح غور وفکر کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہوجائے گا۔ اس طرح سوچ کا دائرہ چند مخصوص علما تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ کسی موضوع پر دوسرے اہلِ علم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی غور وبحث کے دائرے میں آجائے گا۔ اس طرح لوگوں کے ذہن کھلیں گے۔ لوگوں کا ذہنی ارتقاء ہوگا۔ لوگوں کے اندر تقلید کے بجائے اجتہاد کی صلاحیت ترقی کرے گی۔ ہر آدمی شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ چاہنے لگے گا کہ پچھلے لوگ جو کام کر چکے ہیں، میں اُن سے آگے جاؤں، میں علمی ارتقاء کی مزید منزلیں طے کروں۔

اِس معاملے کی ایک مثال مولانا شبلی نعمانی کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نہ صرف یہ کہ ایک اچھے عالم تھے، بلکہ وہ ایک فعال آدمی تھے۔ وہ اظہارِ خیال کی آزادی کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ وہ جہاں بھی رہتے تھے، وہاں وہ لوگوں کے اندر یہ اسپرٹ پیدا کرتے تھے کہ وہ کھلے ذہن کے تحت سوچیں اور کھلے ذہن کے تحت رائے قائم کریں اور دورِ جدید کے لحاظ سے اعلیٰ قابلیت پیدا کریں۔ اِس سلسلے میں وہ انگریزی زبان سیکھنے پر بھی زور دیا کرتے تھے۔

اِس کے نتیجے میں ایسا ہوا کہ مولانا شبلی کے قیامِ ندوہ (1913-1905) کے زمانے میں وہاں ایک زندہ علمی ماحول پیدا ہوگیا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مولانا شبلی نعمانی کے زمانے میں کئی اعلیٰ علمی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی (وفات 1953)، مولانا ابوالکلام آزاد (وفات 1958)، مولانا عبدالباری ندوی (وفات 1976)، مولانا عبد الماجد دریابادی (وفات 1977)، وغیرہ۔

تعلیم کے سلسلے میں دو چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں — نصاب، اور اساتذہ۔ کسی تعلیمی ادارے میں بلاشبہ نصاب کی بہت اہمیت ہے۔ لیکن نتیجے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو نصاب سے بھی زیادہ اہمیت اساتذہ کی ہے۔ نصاب کی حیثیت عملاً ایک ذریعہ کی ہے۔ تاہم اِس ذریعہ کا جو استعمال کرتا ہے، وہ استاذ ہے۔ استاذ اگر لائق اور فعال ہو تو وہ کسی بھی نصاب کو استعمال کرکے طلبا کے اندر مطلوب روح پیدا کرسکتا ہے، اور اگر استاد لائق اور فعال نہ ہو تو اچھے سے اچھا نصاب بھی عملاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گا۔ (الرسالہ، نومبر 2009)

مدرسہ کلچر

مدرسہ کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہاں دینی تعلیم ہوتی ہے، مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مدرسہ مبنی بر اقدار تعلیم (value education) کا ادارہ ہے۔ مدرسہ دراصل اُن قدیم روایات کے تسلسل کا نام ہے، جب کہ تعلیم کا مطلب اخلاقی تعلیم (moral education) ہوتا تھا، جب کہ انسانی اَقدار (human values) کو نصابِ تعلیم کا اہم جز سمجھا جاتا تھا۔

جدید نظامِ تعلیم کے برعکس، مدرسہ میں صرف سبجکٹ پڑھانے کے بجائے کتابوں کے ذریعے مختلف موضوعات کو پڑھایا جاتا ہے۔ اِس طرح اِن مدرسوں میں ابھی تک قدیم کتابوں کی اہمیت باقی ہے۔ قدیم روایات کے مطابق، یہ تمام کتابیں انسانی اقدار اور اخلاقی اصولوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ اِس طرح مدارس تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت کے ادارے بن گئے ہیں۔ اِن مدارس میں سماج کے اچھے شہری تیار کیے جاتے ہیں۔

مدارس کے ماحول میں ہمیشہ خدا اور مذہب اور روحانیت کا چرچا رہتا ہے۔ اِس طرح یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ مدارس میں تربیت پا کر جو لوگ تیار ہوں، وہ تعمیری سوچ کے حامل ہوں۔ وہ اجتماعی ذمے داریوں کو سمجھیں۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ (accountable)

سمجھیں۔ وہ اپنی ذات میں جینے والے نہ ہوں، بلکہ وہ دوسرے انسانوں کا شعور بھی یکساں طور پر رکھتے ہوں۔

مدرسے کے تعلیمی نظام میں مسلسل طور پر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بات دہرائی جاتی ہے۔ یہ دونوں تصور مدرسہ کے پورے نظامِ تعلیم میں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر شامل ہیں۔ اِس طرح ہر مدرسہ گویا کہ ایک ایسا ادارہ بن جاتا ہے، جو فنّی تعلیم کے ساتھ انسانی اور اخلاقی کلچر کا مرکز ہو۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ موجودہ زمانے میں قدیم اخلاقی روایات کا تسلسل جن اداروں کے ذریعے قائم ہے، وہ یہی مدرسے ہیں۔ یہ مدرسے قدیم اخلاقی چراغ کو موجودہ زمانے میں بھی جلائے ہوئے ہیں۔ (الرسالہ، جون 2008)

دینی مدارس

ایک صاحب جو خود دینی مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ دینی مدارس میں علم نبوت تو ہے، مگر وہاں نور نبوت نہیں۔ میں نے کہا کہ کوئی دینی مدرسہ آپ کو صرف علم دین دے سکتا ہے۔ وہ چیز جس کو آپ نورِ نبوت کہتے ہیں، وہ معرفت کی چیز ہے۔ اور معرفت ایک ایسا علم ہے جو خود اپنی دریافت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ کوئی نصاب یا کوئی دینی ادارہ آپ کو معرفت نہیں دے سکتا۔

میں نے کہا کہ موجودہ دینی مدارس کی اصل کمی وہ نہیں ہے جو آپ سمجھتے ہیں۔ بلکہ اصل کمی یہ ہے کہ ان مدارس میں کھلا پن (openness) موجود نہیں ہے۔ اس بنا پر طلبہ کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) اور معرفت یا آپ کے الفاظ میں نورِ نبوت پیدا نہیں ہوتی۔ معرفت تخلیقی فکر کا نتیجہ ہے۔ بند ماحول میں کبھی وہ چیز نہیں پیدا ہو سکتی جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔

مدرسے کے نصاب کے ذریعے ایک طالب علم متون (texts) کو پڑھتا ہے۔ مگر کھلا پن (openness) طالب علم کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ نصاب کی کتابوں کے باہر جو علمی

ذخیرہ ہے، اس سے بھی فائدہ اٹھائے۔ وہ اپنے اندر علمی گہرائی پیدا کرے۔ وہ وسعت نظر کا حامل بنے۔ وہ اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرے کہ مدرسے کی حدود سے باہر جو وسیع تر دنیا ہے، اس سے واقفیت حاصل کرے۔ وہ کتابوں کے دائرے سے باہر انسانوں کے دائرے میں داخل ہو جائے۔

یہ ضروری ہے کہ طالب علم اپنے موضوع کے متون سے واقف ہو۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور بڑی ضرورت ہے، وہ یہ کہ طالب علم اپنے زمانے کو جانے۔ وہ زندگی کے وسیع تر دائرے سے باخبر ہو۔ یہ چیز صرف خارجی مطالعہ سے حاصل ہوسکتی ہے۔ خارجی مطالعہ سے مراد صرف کتابی مطالعہ نہیں ہے، بلکہ دیگر اہل علم سے تبادلۂ خیال کے ذریعے اپنے ذہنی افق کو وسیع کرنا بھی اس میں شامل ہے۔ یعنی دینی موضوعات کے علاوہ سیکولر موضوعات سے بقدر ضرورت آشنا ہونا۔ (الرسالہ، اگست 2016)

ہر چیز ایک پروفیشن

ایک مذہبی مسلمان نے ایک دکان کھولی۔ دکان کامیاب نہ ہوسکی۔ انہوں نے دکان بند کر دی اور ایک مدرسہ کھول لیا۔ مدرسہ کامیابی کے ساتھ چلنے لگا۔ جو فائدہ انہیں دکان سے حاصل نہیں ہوسکا تھا، وہ فائدہ ان کو مدرسے سے حاصل ہو گیا۔ ایک مسلمان نے ڈاکٹری شروع کی۔ ڈاکٹری میں وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اسلامی ادارہ بنایا اور اس ادارے کے اسٹیج سے انہوں نے اسلامی تقریروں کا پروگرام شروع کر دیا۔ اب وہ خوب کامیاب ہو گئے۔ جلد ہی مسلمانوں کے درمیان ان کی دھوم مچ گئی۔ ایک مسلمان عرصے تک بے کار تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک مسجد کی بنیاد رکھ دی۔ ایک عرصے کے بعد مسجد کی شاندار عمارت کھڑی ہو گئی۔ مسجد کے ذریعے انہیں وہ سب کچھ حاصل ہو گیا جس کو وہ چاہتے تھے۔

اسی کا نام دینی پروفیشن ہے، یعنی دین کو ایک پروفیشن کے طور پر اختیار کرنا۔ دین کے نام پر وہ فائدے حاصل کرنا جس کو لوگ مادی پیشے کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں یہ دینی پروفیشن بہت زیادہ عام ہو چکا ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی عنوان سے، دین کو ایک تجارت بنائے ہوئے ہے۔ ہر آدمی دین کے نام پر وہ تمام مادی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو دوسرے لوگ دنیا کے نام پر حاصل کرتے ہیں۔

ایک چیز ہے مشن (mission) اور دوسری چیز ہے پروفیشن (profession)۔ ایک شخص دین کو مشن کے طور پر اختیار کرے، یعنی خالص رضائے الٰہی کے لیے وہ دین کے کسی شعبے کی خدمت کرے، تو اس کا یہ عمل اس کے لیے آخرت میں جنت میں داخلے کا ذریعہ بنے گا۔ اس کے برعکس، جو لوگ دین کو بطور پروفیشن اختیار کریں، یعنی دین کے نام پر مادی فائدہ حاصل کریں، ان کو دنیا کی زندگی میں کچھ ظاہری فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن آخرت میں وہ اس قرآنی آیت کے مصداق ٹھہریں گے: أُولَئِكَ لا خَلاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ (3:77)۔ یعنی، آخرت کی اعلیٰ نعمتوں میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔

ذہنی جمود کا نقصان

ہندستان کے دینی مدارس کے معلّم یقیناً ایک اہم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہ ایسی نسل کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں، جس سے دینی روایت کا تسلسل قائم ہے۔ اسی طرح یہ مدارس آزاد ہندستان میں اردو کو زندہ رکھنے کا ایک بڑا ذریعہ ہیں، وغیرہ۔

مگر ہندستان کے دینی مدرسوں میں جو ماحول ہے وہ معلمین کے فکری مستویٰ کو بلند نہیں ہونے دیتا۔ مثال کے طور پر ان مدارس میں استاد اور شاگرد کا رشتہ صرف معلِّم اور معلَّم (متعلم) کا رشتہ ہے۔ یعنی ایک بتانے والا ہے اور دوسرا سننے والا۔ اس کی وجہ سے معلمین کا

مزاج ایسا بن جاتا ہے کہ وہ اپنے ذہن سے باہر کی حقیقتوں کو سمجھ نہیں پاتے۔ طلبہ کے سامنے ان کی حیثیت یہ ہوتی ہے کہ انھیں سیکھنا نہیں ہے، بلکہ سکھانا ہے۔ اس سے ان کا ذہن جمود (stagnation) کا شکار ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ جاننا یا دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرنا، یہ سب باتیں ان کے مزاج سے خارج ہو جاتی ہیں۔

اس کے برعکس مغرب میں تعلیم کا تصور بالکل دوسرا ہے۔ مغرب میں استاد اور شاگرد کے درمیان معلِّم اور معلَّم کا تعلق نہیں، بلکہ رفیق کا تعلق ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم ایک مشترک سفر ہے، جس کو استاد اور شاگرد دونوں مل کر انجام دیتے ہیں۔ اس طرح کے ماحول میں انسان کا ذہن یہ بنتا ہے کہ اس کو اگر کچھ دینا ہے، تو اس کو دوسرے سے کچھ لینا بھی ہے۔ وہ اگر کچھ باتیں جانتا ہے تو دوسرے بھی کچھ باتوں کو جانتے ہیں جن کو اسے دوسرے سے لینا چاہیے۔

مغرب کے تعلیمی نظام میں معلِّم کے اندر ذہنی جمود پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے اندر یہ صلاحیت زندہ رہتی ہے کہ وہ اپنے سے باہر کی حقیقتوں کو سمجھے، اور ان سے فائدہ اٹھائے۔ اس کے برعکس، ہمارے دینی مدارس کا ماحول، مذکورہ سبب سے، جامد ذہنیت پیدا کرنے کا کارخانہ بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مدارس کے ذریعہ تحفظ دین کا کام تو کسی درجہ میں ہوا، مگر احیائے دین کا کام ان مدارس کے ذریعہ مطلق نہ ہوسکا۔ (اوراقِ حکمت، ڈائری، 26 مارچ 1985)

دو دنیاؤں کا فرق

میں نے اپنی تحریری زندگی شروع کی تو میں کمیونزم کا مخالف بن چکا تھا۔ اسی زمانہ میں میں نے اس کے بارے میں ایک مقالہ لکھا تھا جو ”ہندستان کی منزل: سوشلزم یا اسلام“ کے نام سے چھپا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس موضوع پر زیادہ جامع کتاب لکھی جو اپریل 1959 میں شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا: مارکسزم جس کو تاریخ رد کر چکی ہے۔ اس کے جلد ہی بعد اس

موضوع پر میری دوسری کتاب اگست 1959 میں شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا: سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ۔

پچھلے 35 سال کے اندر اس موضوع پر میں کم از کم ایک سو مضامین اور کتابیں اردو، عربی اور انگریزی میں شائع کر چکا ہوں۔ ان تمام مضامین اور کتابوں میں ہمیشہ میں نے کمیونزم اور سوشلزم کی مخالفت کی ہے۔ ایک زمانہ میں بہت سے اسلام پسند سوشلزم کی طرف مائل ہو چکے تھے اور اس کو اسلامی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر میں ہمیشہ اس نظریہ کا مخالف رہا۔

11 جون 1990ء کو نئی دہلی کے روسی سفارت خانہ سے ٹیلیفون آیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مجھ کو دس روزہ پروگرام کے تحت سوویت روس بھیجنا چاہتے ہیں تاکہ میں وہاں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کو براہ راست دیکھوں، نیز یہ کہ 28 جولائی کے لیے انہوں نے میری سیٹ ریزرو کرادی ہے۔

سوویت روس کی موجودہ حکومت کا میرے جیسے ایک ''مخالف'' کو اپنے ملک میں بلانا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ یہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید سیکولرزم کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو اس کو سارے عالم پر غالب کیے ہوئے ہے۔ وہ یہی فراخ دلی اور برداشت ہے۔ مغربی جمہوریت جس کو اب روس اختیار کر رہا ہے، وہ موافق اور مخالف کی اصطلاحوں سے اوپر اٹھ کر لوگوں سے معاملہ کرتی ہے۔ وہ اپنے ایک مخالف کی پذیرائی کے لیے بھی تیار رہتی ہے۔ اس کی اس صفت نے اس کو یہ طاقت دی ہے کہ وہ ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر سکے۔

موجودہ زمانہ کے اسلامی اداروں کا حال اس معاملہ میں بالکل برعکس ہے۔ ان کے یہاں صرف اپنے موافق کے لیے جگہ ہے۔ جس شخص کو وہ اپنا مخالف سمجھ لیں، اس کے سایہ سے بھی وہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایک شخص اگر کسی اسلامی ادارہ کے ''اکابر'' پر تنقید کر دے تو

اس کی تنقید خواہ کتنی ہی علمی اور مدلل کیوں نیں۔ موجودہ اسلامی اداروں کی یہی کمزوری ہے جس نے ان کو آج کی دنیا میں بالکل بے قیمت بنا دیا ہے۔

کم از کم پچھلے پچاس سال کی بابت میں کہہ سکتا ہوں کہ اس مدت میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا جس کی آج کی دنیا میں کوئی اہمیت ہو۔ زندہ اور اعلیٰ انسان وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں کھلی تنقید اور آزادانہ اختلافِ رائے کا ماحول ہو۔ ان اداروں میں یہ ماحول سرے سے موجود ہی نہیں، پھر وہاں اعلیٰ درجہ کے انسان کیوں کر پیدا ہو سکتے ہیں۔

آج اسلام کی نئی تاریخ بنانے کے لیے مجتہدانہ صلاحیت رکھنے والے اعلیٰ افراد درکار ہیں۔ مگر موجودہ اسلامی اداروں میں اکابر پرستی اور تقلیدِ شخصی کا ماحول اتنی گہرائی کے ساتھ چھایا ہوا ہے کہ ان اداروں سے مجتہدانہ اوصاف والی شخصیت کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ ان اداروں سے کسی اعلیٰ انسان کا ابھرنا ویسا ہی ایک عجوبہ ہوگا جیسا کسی قبرستان سے ایک زندہ انسان کا نکل آنا۔ (سفرنامہ غیر ملکی اسفار، جلد 2، روس کا سفر)

مولانا محمد تقی امینی 5 مئی 1926 کو سیحہ بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ 21 جنوری 1991 کو علی گڑھ میں ان کی وفات ہوئی۔ مولانا مرحوم کے ساتھ میری زندگی کے کئی عبرت انگیز واقعات وابستہ ہیں۔ جون 1966 میں جب میں نے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (لکھنؤ) کو چھوڑ دیا۔

اس وقت مولانا مرحوم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ناظم دینیات تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر بطور خود ہندستان کے ان مسلم اداروں کے نام سفارشی خطوط لکھے جہاں لکھنے پڑھنے کا کام ہوتا تھا۔ مثلاً دار المصنفین، معارف اسلام، ندوۃ المصنفین، وغیرہ۔ مدارس عربیہ سے جو جرائد نکلتے ہیں ان کو بھی خطوط لکھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان میں سے کسی ادارہ میں جگہ مل جائے تاکہ میں وہاں رہ کر لکھنے پڑھنے کا کام کرسکوں۔ مگر تمام کے تمام اداروں نے مجھ کو قبول کرنے سے معذرت ظاہر کی۔

اس سلسلہ میں انہوں نے تقریباً ایک درجن اداروں کے نام خطوط لکھے تھے۔ ان کے جوابات انہوں نے مجھے دکھائے تھے۔ ان جوابات میں میری صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا تھا۔ مگر براہِ راست یا بالواسطہ انداز میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ میرا مزاج تنقیدی ہے۔ اور اسی تنقیدی مزاج کی بنا پر ان کے ساتھ میرا نباہ نہ ہو سکے گا۔ (ڈائری، 30 جنوری 1991ء)

موجودہ دینی مدارس

دینی مدارس، بلا شبہ موجودہ زمانہ میں اہم دینی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کے افادی پہلو پر اتنا زیادہ لکھا جا چکا ہے کہ میری طرف سے اس سلسلے میں صرف تصدیق کافی ہے۔ اس پر مزید اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ تاہم دینی مدارس کی بعض علامات مثلاً ان میں باہمی اختلاف بلکہ تصادم یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان میں مسلّمہ خوبیوں کے باوجود، کوئی کمی ہے۔ اگر کمی نہ ہو تو یہ ناممکن ہے کہ یہ مدارس مسلمانوں کی باہمی جنگ کا میدان بن جائیں۔ حالاں کہ مسلمانوں کی باہمی جنگ سراسر حرام ہے۔

میرے نزدیک وہ کمی یہ ہے کہ یہ مدارس اپنے افراد کو صرف داخلی نشانہ دیتے ہیں، وہ ان کو کوئی خارجی نشانہ نہیں دیتے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ داخلی نشانہ بالآخر باہمی ٹکراؤ پیدا کرتا ہے۔ جب کہ خارجی نشانہ یہ کرتا ہے کہ قوتوں کو خارج کی طرف موڑ کر لوگوں کو آپس کے تصادم سے بچا لیتا ہے۔ وہ قوتوں کو خارجی محاذ پر لگا دیتا ہے۔

موجودہ دینی مدارس کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ تحفظ کی نفسیات کے زیر اثر وجود میں آئے۔ چنانچہ ان کا سارا نظام اور نصاب تحفظ کے تحت بنا۔ بالفاظ دیگر ان مدارس نے اول روز سے مسلمانوں کو صرف داخلی نشانہ دیا۔ وہ ان کو کوئی خارجی نشانہ نہ دے سکے۔ اور جس قوم کے افراد کے پاس صرف داخلی نشانہ ہو، وہ ایک حد پر پہنچ کر ہمیشہ آپس میں ٹکرانا شروع کر دیتے ہیں۔

قرآن میں دینی تعلیم کا جو تصور دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ایسے افراد تیار ہوں، جو اقوامِ عالم پر انذار کا کام کریں (التوبۃ، 9:122) ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ دینی اداروں کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کے افراد کو عمل کا خارجی نشانہ دے سکیں۔تاہم خارجی نشانہ سے میری مراد پرامن خارجی نشانہ ہے، نہ کہ اس قسم کا جارحانہ خارجی نشانہ جس کو موجودہ زمانہ کے جھوٹے قائدین نے دریافت کیا ہے۔

خارجی نشانہ سے میری مراد وہی چیز ہے جس کو قرآن میں انذار کہا گیا ہے۔یعنی پرامن انداز میں اسلام کے پیغام سے اہل عالم کو باخبر کرنا۔موجودہ مدارس میں اگر تعلیم کے ساتھ اقوام عالم کے درمیان تعارفِ اسلام کے عمل کو بھی اس کی صحیح اور موثر صورت میں شامل کر دیا جائے تو مدارس زیادہ بامقصد بن جائیں اور زیادہ مفید بھی۔(الرسالہ، جنوری، 1985)

ہمارے مدارس

صحابہ ہمیشہ اساسات دین پر متوجہ رہتے تھے۔مگر بعد کو عباسی خلافت کے زمانہ میں دوسری قوموں کے اثر سے مسلمانوں کا یہ حال ہوا کہ وہ اساسات دین کے بجائے جزئیات دین کو طے کرنے میں الجھ گئے۔ان کے درمیان عجمی قوموں کے اختلاط سے نئے نئے مسائل پر بحثیں ہونے لگیں۔یہ بحثیں حقیقتاً ان امور پر نہ تھیں، جو قرآن وحدیث میں واضح الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں۔بلکہ زیادہ تر ان پہلوؤں پر تھیں جو لوگوں نے اپنے غیر ضروری قسم کے خوض و تعمق سے خود پیدا کیا تھا۔فقہ میں جزئیاتی امور پر بحثیں پیدا ہوگئیں اور اعتقادیات میں کلامی موشگافیوں سے پیدا شدہ مسائل لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت جو اسلامی نظام تعلیم بنا، اس میں انھیں فقہی اور اعتقادی بحثوں نے سب سے زیادہ جگہ حاصل کر لی۔حتیٰ کہ خود قرآن وحدیث بھی اب انھیں

اختلافی بحثوں کی روشنی میں پڑھائے جانے لگے۔ یہ اندازِ تعلیم جو ابتداءً عباسی دور میں رائج ہوا، بعد کو مقدس بن کر اسلامی نظام تعلیم کا لازمی جزء بن گیا اور آج بھی وہ کسی نہ کسی طرح اس کا لازمی جزء بنا ہوا ہے۔ جو چیز صرف اسلام کی تاریخ تھی اس کو اسلام کی حقیقت سمجھ لیا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی درس گاہوں سے بالکل مختلف انسان بن کر نکلنے لگے جو قرآن کو مطلوب تھے۔ قرآن (35:28) کے مطابق، اللہ تعالیٰ کو اسلامی تعلیم سے ایسے انسان مطلوب ہیں جو اللہ سے ڈریں (إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ)، اور جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ (9:122) ہے، وہ دنیا کے لوگوں کو آنے والے سخت دن سے ہوشیار کریں (لِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ)۔ مگر اب اسلام کے تعلیمی نظام سے ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو جزئیاتی بحثوں کے ماہر ہوں اور اختلافی مسائل میں کمالِ فن کی داد دے سکیں۔

اس فرق کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہمارے مدارس سے وہ مطلوبہ نتیجہ حاصل نہ ہو سکا جس مقصد کے لیے وہ قائم کیے جاتے ہیں۔ اگر آپ خدا کی عظمت کا تذکرہ کریں اور جنت وجہنم کو یاد کریں تو آپ کے اندر خشوع اور تقویٰ کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اس کے برعکس، اگر آپ ظاہری جزئیات اور لفظی موشگافیوں میں بحث ومباحثہ کریں تو اس سے آپ کو صرف قساوت کی غذا ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے مدارس سے بڑی تعداد میں ایسے لوگ نکلتے ہیں جن میں خشوع اور تقویٰ کے بجائے غفلت اور قساوت پائی جاتی ہے۔ (الرسالہ، مئی 1985)

ایک سبق آموز واقعہ

ایک دیوبندی عالم سے ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو انہوں نے بتایا کہ ایک بار ہمارے مدرسہ میں امتحان کے پرچہ میں ایک سوال یہ تھا کہ اخلاق اور معاشرت سے متعلق دو حدیث لکھیے۔ مگر بہت کم طلبہ اس کے جواب میں دو حدیث لکھ سکے۔ حالانکہ انہیں طلبہ کا حال یہ تھا کہ

رفع یدین اور اس قسم کے دوسرے اختلافی مسائل پر سوال ہو تو وہ اس کے جواب میں گھنٹوں تقریر کر سکتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان طلبہ کو جب حدیث کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں تو استاد اخلاق اور معاشرت جیسی حدیثوں کی صرف لفظی قرأت کر کے گزر جاتا ہے مگر جب رفع یدین اور آمین بالجہر جیسے اختلافی مسائل آتے ہیں تو وہ ان پر کئی کئی دن تک تقریر کرتا ہے اور ان پر اپنی معلومات کا دریا بہاتا ہے۔ یہ طریقۂ درس ظاہر ہے کہ اسی قسم کے علما پیدا کرے گا جس کا ذکر مذکورہ دیوبندی عالم نے کیا۔(ڈائری، 14 فروری 1998)

اعتراف

بھوپال کے قریب ایک گاؤں کا واقعہ ہے۔لوگ عام طور پر جاہل اور نماز وغیرہ سے بے تعلق تھے۔ایک عالم اس گاؤں میں جانے لگے۔انہوں نے لوگوں کو غیرت دلائی اور ان کو جوڑ کر نماز پر آمادہ کیا اور وہاں جمعہ بھی قائم کیا۔اب وہاں پنج وقتہ نماز اور جمعہ ہونے لگا۔

اس کے بعد ایسا ہوا کہ شاہ محمد یعقوب مجددی (1203-1339ھ) کا اس گاؤں میں جانا ہوا۔ اگلے دن جمعہ تھا۔لوگوں نے کہا کہ آپ کل تک یہاں ٹھہریں اور کل آپ ہی یہاں جمعہ پڑھائیں۔ حضرت شاہ صاحب کی نظر مسئلہ پر گئی۔انہوں نے کہا کہ ایسے چھوٹے گاؤں میں مسئلہ کی رو سے جمعہ کی نماز جائز نہیں۔ یہ کہہ کر وہ شہر واپس آگئے تاکہ یہاں جمعہ کی نماز ادا کرسکیں۔

اس کے بعد مذکورہ عالم کا اس گاؤں میں جانا ہوا۔انہوں نے دیکھا کہ وہاں نماز کا نظام ٹوٹ گیا۔لوگوں نے اپنے گاؤں میں نماز جمعہ کی ادائیگی چھوڑ دی اور کسی بڑے مقام پر بھی جمعہ پڑھنے کے لیے نہیں گئے۔لوگوں نے شکایت کی کہ آپ نے یہاں جمعہ قائم کر دیا اور حضرت پیر صاحب آئے تھے تو انہوں نے بتایا کہ اس گاؤں میں جمعہ کی نماز جائز ہی نہیں۔ چنانچہ ہم نے جمعہ پڑھنا چھوڑ دیا۔

مذکورہ عالم یہ صورت دیکھ کر بہت پریشان ہوئے اورفوراً روانہ ہوکر حضرت شاہ صاحب کے پاس پہنچے۔انہوں نے حضرت شاہ صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ نے گاؤں والوں سے یہ کہا ہے کہ یہاں جمعہ کی نماز جائزنہیں۔حضرت شاہ صاحب نے کہاہاں میں نے کہا ہے۔اور مسئلہ تو یہی ہے۔مذکورہ عالم نے کہا کہ حضرت آپ درست فرماتے ہیں۔مگرصورت حال یہ ہے کہ اس گاؤں کے لوگ نماز چھوڑے ہوئے تھے۔ان کو کہہ سن کرنماز کی طرف متوجہ کیا ہے۔شرائط جمعہ کے مسائل اپنی جگہ صحیح ہیں۔مگر ابھی ان لوگوں میں اتنی رغبت نہیں کہ وہ جمعہ کی خاطر سفر کر کے باہر جائیں اورمرکزی مقام پر جمعہ کی نماز ادا کریں۔ان کی مزاج کی رعایت کرتے ہوئے میں نے وہاں جمعہ کی نماز شروع کرادی تھی تاکہ کسی طرح وہ عادی ہوجائیں۔

حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی نے یہ سنا تو فرمایا کہ آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔مجھ سے غلطی ہوگئی۔اس کے بعد اگلے جمعہ کووہ دوبارہ گاؤں میں گئےاورلوگوں سے کہا کہ مذکورہ عالم کا جمعہ قائم کرنا بالکل صحیح تھا۔”اصل یہ ہے کہ میں نے متن دیکھا تھا،حاشیہ نہیں دیکھا۔حاشیہ میں وہ مسئلہ موجود ہے جومولوی صاحب نے تم لوگوں کو بتایا۔اب تم لوگ پہلے کی طرح یہاں نماز ادا کرو“۔اس کے بعد خود وہاں کے لوگوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا کی۔پھر شہر واپس آئے۔

(الرسالہ،اپریل 1981)

فرد کی اصلاح

عام طورپرلوگوں کا حال یہ ہے کہ کسی شخص کے اندر کوئی خرابی کی بات دیکھتے ہیں،تو وہ غیرجانب دار(indifferent) ہوجاتے ہیں۔لوگ صرف اپنے بچوں کی خرابیوں کی اصلاح کے معاملہ میں سنجیدہ ہوتے ہیں، دوسروں کی خرابیوں کی اصلاح سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔میری مراد یہاں انفرادی اصلاح سے ہے۔کیوں کہ میں اجتماعی اصلاح کے نام پراٹھنے کولیڈری سمجھتا ہوں، نہ کہ حقیقتاً اصلاحی کام۔

مگر میرا حال یہ ہے کہ میں کسی فرد کے اندر کوئی خرابی دیکھتا ہوں، تو فوراً دل بے چین ہوجاتا ہے۔ مثلاً 23 ستمبر 1978 کا واقعہ ہے۔ میرے یہاں ایک مسلم اسکالر آئے۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے انھیں سمجھا بجھا کر آمادہ کیا کہ وہ سگریٹ چھوڑ دیں۔ چنانچہ انہوں نے سگریٹ پھینک دی، اور میری ڈائری میں یہ الفاظ لکھے:

"آج بتاریخ 23 ستمبر 1978 سے میں نے سگریٹ چھوڑ دی۔ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے اس عہد پر قائم رکھے"۔

اسی طرح حفظ الرحمن عظیم قاسمی 19 نومبر 1978 کو میرے دفتر میں آئے۔ ان کے ساتھی نے بتایا کہ وہ ہر شخص کی تقریر کو دہرا سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے قاری طیب صاحب، مولانا انظر شاہ صاحب کی تقریروں کو بالکل انھیں کی آواز میں دہرادیا۔ تاہم مجھے اس سے خوشی نہیں ہوئی۔ میں نے کہا کہ جب آپ کا حافظہ اتنا غیر معمولی ہے، تو آپ اس کو نقل کے بجائے کسی زیادہ بہتر کام میں استعمال کریں۔ مثلاً آپ انگریزی پڑھیں۔ اچھا حافظہ ہونے کی وجہ سے آپ بہت آسانی سے نئی زبان سیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے اتفاق کیا اور میری ڈائری پر یہ الفاظ لکھے:

"میں اللہ کو گواہ بنا کر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد کسی کی تقریر نہیں دہراؤں گا، ان شاء اللہ۔"

(اوراقِ حکمت، ڈائری، 19 فروری 1985)

اسلامی تربیت

آج جامعہ ملیہ (اسلامک اسٹڈیز) کے تین طالب علم ملاقات کے لیے آئے۔ ان میں سے ایک انعام الرحمن فلاحی تھے۔ وہ جامعۃ الفلاح سے فارغ ہیں، اور اب اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کررہے ہیں۔ انعام الرحمن فلاحی صاحب کے والد کا نام مولانا رفیق عالم قاسمی ہے۔ وہ جماعت اسلامی کے رکن ہیں نیز مرکز جماعت اسلامی میں ایک ذمہ دارانہ عہدہ پر ہیں۔

انعام الرحمن فلاحی صاحب نے بتایا کہ انہوں نے اپنے والد سے کہا کہ ”میں مولانا وحید الدین سے ملنے کے لیے جانا چاہتا ہوں“۔ ان کے بیان کے مطابق مولانا رفیق قاسمی صاحب نے جواب دیا کہ ”جاؤ، مگر وہاں استفادہ کی نیت سے بیٹھنا“۔

اسی کا نام اسلامی تربیت ہے۔ انعام الرحمن فلاحی کے والد اگر ان سے یہ کہتے کہ تم کو اگر ملنا ہے تو جماعت اسلامی کے کسی عالم سے ملو تو وہ اپنے بیٹے کو تحزّب کی تعلیم دیتے۔ اگر وہ یہ کہتے کہ مولانا وحید الدین تو ایک نزاعی شخص ہیں تو وہ اپنے بیٹے کے اندر غیر علمی نقطۂ نظر پیدا کرتے۔ اگر وہ یہ کہتے کہ مولانا وحید الدین تو ہندولابی کے آدمی ہیں تو وہ اپنے بیٹے کے اندر الزام تراشی کا مزاج پیدا کرتے۔ اس کے برعکس، جب انہوں نے اپنے بیٹے سے مذکورہ جملہ کہا تو ان کا یہ جملہ اپنے بیٹے کے لیے مثبت لائنوں پر تربیت کا ذریعہ بن گیا۔ (ڈائری، 21 اپریل 1997)

جائز حدود کے اندر

دہلی میں ایک امام مولانا قاسم قاسمی ہیں۔ وہ رود گراں کی مسجد میں امامت کرتے ہیں اور اس ے ساتھ مدرسہ حسین بخش میں قرآن کا درس دیتے ہیں۔ مگر وہ مسجد اور مدرسہ سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ وہ تعویذ گنڈے کا بھی کاروبار نہیں کرتے۔ وہ ان تدبیروں سے بھی بہت دور رہتے ہیں جن کے ذریعہ لوگ چندے اور ہدایہ وصول کرتے ہیں۔ اس کے باوجود جمنا پار (گونڈہ) میں انہوں نے اپنا ذاتی مکان بنالیا ہے۔ ان کے یہاں دو ٹیلی فون لگا ہوا ہے۔ ایک گھر پر اور ایک مطب میں، وغیرہ۔

یہ کامیابی انہوں نے کس طرح حاصل کی۔ اس کا راز محنت ہے۔ وہ فن طب سے واقف ہیں اور مرکب دوائیں خالص اجزاء کے ساتھ بناتے ہیں اور ان کو معقول منافع کے ساتھ بھیجتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی جائز کمائی سے وہ سب کچھ حاصل کرلیا ہے جو دوسرے لوگ غلط طریقوں سے

حاصل کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جائز حدود میں وہ سب کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے جس کے لیے آدمی جائز حد کو توڑ کرنا جائز کے دائرہ میں داخل ہوجاتا ہے۔ (ڈائری، 28 مارچ 1995)

نقصان میں فائدہ

ڈاکٹر عنایت اللہ سبحانی جامعۃ الفلاح (بلریا گنج، اعظم گڑھ) میں استاد ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ سعودی عرب کے تحت مدارس کے آخری جماعت کے طلبہ اور نوجوان اساتذہ کی تدریب کا انتظام اس سال بمبئی میں رکھا گیا تھا۔ مولانا سبحانی کا ایک لڑکا جو جامعۃ الفلاح سے فارغ ہوا ہے، اس کے پاس دعوت نامہ نہیں آیا تھا، تاہم خبر سن کر وہ بھی بمبئی پہنچ گیا۔ وہاں جب وہ تدریبی پروگرام کے ہندستانی ذمہ دار سے ملا تو انہوں نے سب سے پہلے دعوت نامہ کا مطالبہ کیا۔ جب اس نے بتایا کہ اس کے پاس دعوت نامہ نہیں ہے تو فوراً ہی انہوں نے اس کو لینے سے انکار کردیا۔

وہ لڑکا مایوس ہوکر وہاں کی مسجد میں چلا گیا۔ نماز کا وقت ہوا تو تدریب کے سعودی شیوخ نماز کے لیے مسجد میں آئے۔ یہاں ایک شیخ سے مذکورہ نوجوان کی ملاقات ہوگئی۔ اس نے اپنا قصہ بتایا۔ سعودی شیخ نے کہا کوئی ہرج نہیں، تم میرے ساتھ چلو۔ انہوں نے پروگرام کے ناظم سے کہہ کر اس کو تدریب میں شامل کرادیا۔ آخر میں جب امتحان ہوا تو یہ نوجوان پوری جماعت میں فرسٹ آیا۔ اس نے 96 فیصد نمبر حاصل کیے۔

یہ اس بات کی ایک مثال ہے کہ اس دنیا میں نقصان میں بھی فائدہ ہوتا ہے۔ مذکورہ نوجوان کو جب تدریبی پروگرام کے ناظم نے ردّ کردیا تو اس کو سخت جھٹکا لگا۔ اس بنا پر بعد کو جب اسے پروگرام میں شامل کیا گیا تو اس نے ان طالب علموں سے زیادہ محنت کی، جن کو نہایت آسانی کے ساتھ داخلہ مل گیا تھا۔ اس نے دوسروں سے زیادہ محنت کی۔ اس نے

اساتذہ کے درس کو زیادہ توجہ سے سنا۔ زیادہ اہتمام کے ساتھ نوٹ تیار کیے۔ اس طرح اس کی بڑھی ہوئی محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ پوری جماعت میں ٹاپ کیا۔ (ڈائری، 7 دسمبر 1996)

ایک لفظ کا فرق

ایک صاحب جن کی تعلیم ایک مدرسہ میں ہوئی ہے۔ 12 دسمبر 2017 کو ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ اس سے پہلے 2005 میں میں آپ سے ملا تھا۔ اس وقت میں نے کہا تھا کہ میرے اندر احساسِ کمتری بہت زیادہ ہے۔ اس کا کوئی حل بتائیے۔ میں نے کہا کہ آپ صرف ایک لفظ بدل دیجیے۔ ابھی تک آپ احساسِ کمتری کا لفظ بولتے ہیں۔ آج سے آپ احساسِ غلطی کا لفظ بولنا شروع کر دیجیے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ آپ کا سارا معاملہ درست ہو جائے گا۔

آج کی ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ یہ بات آپ نے ایک ڈائری میں لکھی اور وہ ڈائری مجھ کو دے دی۔ اسی وقت سے میں نے اس نصیحت کو پکڑ لیا ہے۔ اب میں یہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ اپنی غلطی کو دریافت کرتا ہوں، اور اس کی اصلاح کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے سارے معاملات درست ہو گئے۔ گھر کے معاملات بھی، پڑوسیوں کے معاملات بھی، اور مسجد اور مدرسے کے معاملات بھی۔ پہلے میں برابر ٹینشن میں رہتا تھا، اب مجھے کوئی ٹینشن نہیں۔ کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ کسی سے کوئی جھگڑا نہیں۔ اب میں یہ کرتا ہوں کہ کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو میں خود ہی سوچ کر اس کو درست کر لیتا ہوں۔ اب سب لوگ مجھ سے خوش رہتے ہیں۔ جب کہ پہلے ہر شخص کو مجھ سے شکایت ہوتی تھی۔

یہ کرشمہ صرف ایک پر حکمت بات کا تھا۔ وہ یہ کہ اس سے پہلے وہ غلط تقابل (comparison) کا شکار تھے۔ اب انہوں نے احساس کمتری کے جملے کو بدل کر احساسِ

غلطی بنالیا۔ پہلے وہ دوسروں کے خلاف سوچا کرتے تھے، اب وہ اپنی اصلاح آپ کے انداز میں سوچنے لگے۔ بظاہر یہ ایک لفظ کا فرق تھا، لیکن یہ لفظ اتنا زیادہ پرحکمت تھا کہ اس نے ان کی پوری زندگی کو بدل دیا۔ ان کو منفی شخصیت (negative personality) سے نکال کر مثبت شخصیت (positive personality) بنادیا۔ (الرسالہ، جولائی 2019)

ایک نوجوان عالم دین کو نصیحت

ایک نوجوان عالم دین، محمد طلحہ ندوی (بجنور) 26 مارچ 2019 کو ملاقات کے لیے میرے آفس میں آئے، اور نصیحت کی درخواست کی، تو میں نے ان کو یہ نصیحت کی:

(1) رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مطابق آپ ٹھہر ٹھہر کر بولنا سیکھیں، کبھی تیز تیز نہ بولیں، تاکہ سننے والا ہر بات کو پکڑتا چلا جائے، یہی طریقہ رسول اللہ کا تھا: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، كَانَ يُحَدِّثُ حَدِيثًا لَوْ عَدَّهُ العَادُّ لَأَحْصَاهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3567؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2493)۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کوئی بات اس طرح بولتے تھے کہ اگر کوئی گننے والا گننا چاہتا تو شمار کرلیتا۔

(2) سیاسی مسائل، اور شکایت کے مسائل اور دینی اختلاف کے مسائل پر بولنا بالکل چھوڑ دیں، ان کو ممنوعات کلام میں شمار کریں۔ اگر آپ نے ان دو نصیحتوں پر عمل کیا، تو ان شاء اللہ، آپ ایک نئے انسان بن جائیں گے۔

نوٹ: ہر انسان کو اس کے خالق نے کسی خاص صلاحیت کے ساتھ دنیا میں بھیجا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اس عطیۂ الٰہی کو دریافت کرے، اور اس کو منصوبہ بند انداز میں استعمال کرے۔ (الرسالہ، جون 2019)

تربیتِ شعور

مسٹر خالد جمال ملاقات کے لیے آئے۔ وہ حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ اس وقت وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کارپوریٹ کمیونی کیشنز کے منیجر ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ میری ابتدائی تعلیم کلکتہ کے ایک اردو اسکول میں ہوئی۔ میرے باپ بھی معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ بظاہر میرے لیے کسی بڑی ترقی کے مواقع نہیں تھے۔ مگر میں اپنی طالب علمی کے زمانہ سے ہی الرسالہ پڑھتا تھا۔ اس سے میرے اندر ایک نئی سوچ اور نئی ہمت پیدا ہو رہی تھی۔ پھر میں نے الرسالہ میں ایک مضمون پڑھا، جس میں بتایا گیا تھا کہ یہ ایج آف کمیونی کیشن ہے۔ اس کو پڑھ کر میرے اندر یہ عزم جاگا کہ مجھے کمیونی کیشن کا کورس کرنا چاہیے۔ چنانچہ اردو اسکول سے فراغت کے بعد میں نے کمیونی کیشن کی اسٹڈی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ آج میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کمیونی کیشن کے شعبہ کا منیجر ہوں۔

اکثر لوگ اردو اسکول اور عربی مدرسہ کے خلاف لکھتے اور بولتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ قوم کو ناکارہ بناتا ہے۔ مگر مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ یہ رائے درست نہیں۔ اصل کام یہ ہے کہ اردو اسکول یا عربی کے ساتھ ”الرسالہ“ جیسے کسی انفارمل تربیتی کورس کا اضافہ کر دیا جائے۔ اس کے بعد ہر طالب علم اس طرح آگے بڑھ جائے گا جس طرح خالد جمال صاحب آگے بڑھ گئے۔ (ڈائری، یکم دسمبر 1995)

مثبت لٹریچر کی ضرورت

ایک مدرسہ کے طالب علم نے کراچی بک فیر 2019 میں سی پی ایس انٹرنیشنل کے اسٹال پر آ کر اپنا تاثر ان الفاظ میں نقل کیا ہے: چار سال قبل میں عورتوں کے بارے میں عرب

کے دورِ جاہلیت سے بھی بدتر سوچتا تھا۔ میرے بڑے بھائی نے مولانا (وحید الدین خاں) صاحب کی کتابوں کے مطالعہ پر زور دیا۔ اس وقت میری ذہنی حالت بدتر ہو رہی تھی، میں سوچ سوچ کر اتنا پریشان ہو گیا کہ میں نے خودکشی کرنے کا ارادہ کرلیا۔ ایک دن میں بڑے بھائی کی لائبریری گیا، کتابیں دیکھتے ہوئے میری نظر مولانا صاحب کی کتاب ''انسان کی منزل'' پر پڑی۔ میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میرے ذہن سے بوجھ اتر گیا ہو۔ اس کے بعد مجھے مولانا صاحب کی مزید کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت کسی نے مجھے عورت کے بارے میں اسلام کا غلط تصور بتایا کہ اسلام عورتوں کو کمتر درجہ دیتا ہے۔ اب میں عورتوں کے بارے میں اسلام سے کچھ حوالہ چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ انھیں قید کرنے کی اسلام میں مجھے اجازت مل جائے گی۔ میں نے اسی نیت سے مطالعہ شروع کیا۔ لیکن جب میں نے کتاب پڑھی، تو انسانوں کے درمیان مجھے اپنا وجود جنگلی محسوس ہونے لگا۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ مرد افضل ہے عورت سے۔ مطالعہ کرنے کے بعد میری سوچ کا پیمانہ بدل گیا۔ میں نے یہ کتابیں پڑھیں بی خاتونِ اسلام، خاتونِ جنت، عورت معمارِ انسانیت، وغیرہ۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے دوسروں کا احتساب کرنے کے بجائے خود کا احتساب شروع کیا۔ گھر میں عورتوں کے ساتھ میں نے غلط رویہ ختم کردیا۔ میرے اندر بدلاؤ آیا تو میں نے اس نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ عورت کا بھی درجہ ہے، وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے، جیسے کہ مرد۔ اب گھر میں میں عورتوں سے جھگڑا نہیں کرتا ہوں۔ میں اب یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے رب نے دوبارہ زندگی عطا کی ہے۔ (محمود السلام قاسمی، کراچی، 8 دسمبر 2019)

اس تاثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کے نوجوان طبقے کی رہنمائی کے لیے مثبت لٹریچر کی کتنی زیادہ ضرورت ہے۔ (الرسالہ، مارچ 2020)

سیکھنے کی اہمیت

ایک مسلم نوجوان نے عربی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں داخلہ لیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ مدرسہ میں پڑھے ہوئے نوجوانوں سے ملتے ہیں، لیکن جو نوجوان انگریزی اسکولوں میں پڑھ کر آتے ہیں اور انگریزی بولتے ہیں ان سے وہ دور رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے ان لوگوں کی طرح اچھی انگریزی بولنا نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی عذر نہیں۔ اگر آپ کو اچھی انگریزی بولنا نہیں آتا تو آپ کو سیکھنا تو آتا ہے۔ آپ بات کرنے کے لیے نہیں، بلکہ سیکھنے کے لیے ان کے پاس بیٹھیے۔ انہوں نے ایک سال ایسا کیا۔ اس کے بعد انہیں دوسروں کی طرح انگریزی میں بات کرنا آ گیا۔

اکثر لوگ اپنے بارے میں اس قسم کی کمتری کی نفسیات میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ اپنے حال (present) کو جانتے ہیں، مگر وہ اپنے مستقبل (future) کو دریافت نہیں کرپاتے۔ یہ کمزوری اکثر لوگوں میں غیر شعوری طور پر ہوتی ہے۔ وہ اپنی اس کمزوری کو دریافت نہیں کرپاتے، وہ جانے بغیر اس میں مبتلا رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر فطری طور پر اعلیٰ امکانات موجود رہتے ہیں، لیکن بے شعوری کی بنا پر وہ ان امکانات کو واقعہ نہیں بنا پاتا۔ یہاں تک کہ وہ اسی حال میں مر جاتا ہے۔

سیکھنا (learning) ہر انسان کے لیے بہت ضروری ہے۔ سیکھنے کا فائدہ سب سے زیادہ ان لوگوں کے ذریعے ملتا ہے جو آپ کے جاننے والے ہوں۔ البتہ اس کے لیے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر تواضع (modesty) کا مزاج ہو۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ تواضع علم کا دروازہ ہے:

Modesty is the door of knowledge.

تواضع کے ذریعے آدمی علم کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ جس آدمی کے اندر تواضع کی صفت نہ ہو، وہ دوسروں سے فائدہ نہیں اٹھائے گا، وہ علم کے کتب خانے کے اندر بھی علم سے محروم رہے گا۔

جانا ہے بہت دور

ایک بزرگ نے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ شروع شروع میں اس تعلیم گاہ کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اساتذہ کو وقت پر تنخواہیں نہ ملتیں طلبا کے لیے بعض اوقات کھانے کا انتظام ناممکن ہو جاتا۔ چھپر کے سایہ کے نیچے تعلیم دی جاتی اس طرح کی بے شمار دشواریوں کے درمیان اس درس گاہ کو سفر کرنا پڑا۔

مگر دشواریاں جس طرح آدمی سے کچھ چیزیں چھینتی ہیں، اسی طرح وہ اسے کچھ چیزیں دیتی بھی ہیں۔ ظاہری اسباب کی کمی عزم وہمّت کو بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ ایسے جذبات اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں جو فراوانی کے اندر کبھی پیدا نہیں ہوتے۔

اس تعلیمی ادارے کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے ایک روز سارے ادارے میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ حالات بے حد نامساعد نظر آرہے تھے۔ درس گاہ کے ناظم نے طلبا واساتذہ کا ایک اجتماع کیا جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا:

”موجودہ حالات میں ممکن ہے آپ کا جی ملامت کرتا ہو کہ آپ کہاں آ کر پھنس گئے۔ کسی بنی بنائی درس گاہ میں گئے ہوتے تو آرام سے رہ سکتے تھے۔ مگر یہ گھبرانے کی بات نہیں، کیونکہ دوسرے اگر حال کے وارث ہیں تو یہاں آپ ایک نئے مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں۔ لوگ تاریخ خواں ہوتے ہیں مگر آپ کو قدرت نے ایک ایسے مقام پر کھڑا کیا ہے کہ آپ تاریخ ساز بن سکتے ہیں“۔

یہ الفاظ جن حالات میں کہے گئے تھے اس کے اعتبار سے وہاں اس نے بجلی کا کام کیا۔ طلبہ اور اساتذہ میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ وہ زندگی کی ایک اعلیٰ ترین اخلاقی قدر سے آشنا ہوئے۔ یہ کہ مستقبل کی تعمیر کے لیے حال میں جد و جہد کی جائے۔ یہ قدر، نفسیاتی طور پر، اس وقت ان کے لیے لامعلوم رہتی جب کہ وہ ایسے حالات میں نہ ہوتے۔ اسی طرح ناظم درس گاہ کی زبان سے بھی ہرگز یہ الفاظ نہ نکلتے اگر وہ آسودگی اور فارغ البالی میں ہوتے۔ ناظم اس لیے یہ الفاظ بول سکے اور سننے والے اسی لیے ان کو سمجھ سکے کہ وہ دشوار حالات میں تھے۔ آسانیوں کی فضا میں انھیں یہ سبق نہیں مل سکتا تھا۔

جو لوگ اپنے آپ کو مشکل حالات میں پائیں وہ اسے اپنی بدقسمتی تصور کرتے ہیں حالانکہ یہ صرف سمجھنے کی غلطی ہے اگر صحیح ذہن ہو اور عزم بیدار ہو تو مشکل حالات اس سے زیادہ بڑی چیزیں دیتے ہیں۔ جو آسانیوں اور راحتوں میں کسی کو ملتی ہے۔ دشواریاں آپ کو اعلیٰ ترین انسانی قدروں سے آشنا کرتی ہیں۔ آپ کے اندر سوز و درد پیدا کر کے آپ کے کلام کو بے پناہ بنا دیتی ہیں مشکلات کو عبور کرنے کا نیا ولولہ پیدا کرتی ہیں اور بالآخر آپ کو ان بلند ترین انسانوں میں شامل کرتی ہیں جن کو تاریخ خواں کے مقابلے میں تاریخ ساز کہا جاتا ہے۔

اوپر جس واقعہ کا حوالہ دیا گیا، وہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا واقعہ ہے اور جس نے مذکورہ تقریر کی، وہ مولانا مجیب اللہ ندوی (1918-2006) تھے۔ اب خدا کے فضل سے یہ ادارہ ”چھپر“ کے دور سے نکل کر ”بلڈنگ“ کے دور میں داخل ہو گیا ہے اور تعلیم کے میدان میں ملت کو ایک نئی راہ دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ ہر بار جب کوئی شخص نیا کام شروع کرتا ہے، تو اس راستہ میں غیر یقینی صورتِ حال سے لازماً دوچار ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ صبر اور امید کے ساتھ جما رہے تو استحکام کے مرحلہ پر پہنچنے سے کوئی بھی اسے روک نہیں سکتا۔ (الرسالہ، اپریل 1977)

امام ابوحنیفہ کا معاشی مسلک

بھٹکل کے سفر (اکتوبر 1984) میں ایک صاحب نے ایک مسجد کا واقعہ بتایا، جس میں بڑی نصیحت ہے۔ ایک شخص نے اس مسجد میں نماز پڑھی۔ اس کے بعد مسجد کے موذن سے پوچھا کہ مجھے ایک نیا جوتا بنوانا ہے، کسی اچھے جوتے ساز کا پتہ بتاؤ تاکہ میں اس سے اپنا جوتا بنوا سکوں۔ موذن نے امام صاحب کی طرف اشارہ کیا جنہوں نے ابھی ابھی وہاں نماز پڑھائی تھی۔

مسافر کو یقین نہیں ہوا۔ مگر جب وہ مسجد کے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ مسجد کے نیچے ایک دکان میں وہی شخص جوتا بنانے میں مشغول ہے، جس نے ابھی نماز کے وقت مسجد میں امامت کی تھی۔ مسافر نے دکان میں جاکر امام صاحب سے گفتگو کی اور ان کو اپنے جوتے کا آرڈر دے دیا۔

بتانے والے نے بتایا کہ یہ امام صاحب عام جوتا سازوں سے کافی زیادہ قیمت پر جوتا بناتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے یہاں خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ کیوں کہ ان کے متعلق لوگوں کو اطمینان ہے کہ ان کا بنایا ہوا جوتا پوری طرح قابل اعتماد ہوگا۔

ہمارے ائمہ اور مدرسین جو امام ابوحنیفہ کے فقہی مسلک پر بہت زور دیتے ہیں اگر وہ امام ابوحنیفہ کے اس "معاشی مسلک" کو بھی اختیار کرلیں تو ملت کے آدھے جھگڑے خود بخود ختم ہوجائیں اور اسی کے ساتھ اس کے آدھے مسائل بھی۔ (الرسالہ، جنوری 1985)

ناموافق حالات ترقی کا زینہ بن گئے

ایک "ملاجی" دہلی کی ایک مسجد میں امام تھے۔ امامت کے علاوہ ان کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ وہ روزانہ قرآن کا درس دیں۔ ان تمام خدمات کا معاوضہ تھا — ماہانہ 25 روپے تنخواہ، مسجد میں ایک حجرہ اور دو وقت کا کھانا۔ نوجوان ملاجی اس مختصر معاوضہ پر قانع ہونے کے لیے

تیار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مسجد میرے لیے کم ازکم ایک ٹھکانا تو ہے۔ یہاں رہ کر میں اپنے بچے کی تعلیم پوری کرالوں گا۔ میں نہیں تو میرا بچہ مستقبل میں بہتر معاشی زندگی حاصل کر لے گا۔

مگر مسجد کے لوگوں کا سلوک ان کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ ہر نمازی ان کو اپنا ملازم سمجھتا۔ ذرا ذرا سی بات میں ہر آدمی ان کے اوپر برس پڑتا اور ان کو ذلیل کرتا۔ کوئی فرش کے لیے، کوئی جھاڑو کے لیے، کوئی لوٹے کے لیے، کوئی کسی اور چیز کے لیے ان پر بگڑتا رہتا۔ وہ معاشی تنگی برداشت کر سکتے تھے۔ مگر ذلت ان کے لیے برداشت سے باہر تھی۔ بالآخر انہوں نے ایک نیا فیصلہ کیا۔ انہوں نے طے کیا کہ مجھے اپنی زندگی کو مستقل طور پر مسجد سے وابستہ نہیں رکھنا ہے۔ بلکہ اپنے لیے کوئی دوسرا کام پیدا کرنا ہے۔ تاہم فوری طور پر مسجد چھوڑنا بھی بُرا تھا۔ کیونکہ مسجد کی امامت چھوڑنے کے بعد مسجد کا حجرہ ان سے چھن جاتا۔ اور شہر میں دوسری جگہ حاصل کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔

انہوں نے مسجد کی امامت کرتے ہوئے شہر کے طبیہ کالج میں داخلہ لے لیا اور خاموشی کے ساتھ طب کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ طبّی تعلیم کی تکمیل میں ان کو پانچ سال لگ گئے۔ اس دوران وہ مسجد کے لوگوں کے برے سلوک کو پہلے سے بھی زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ نئے فیصلہ میں کامیاب ہونے کے لیے ضروری تھا کہ وہ صبر کریں۔ ذلت کی زندگی سے نکلنے کی خاطر ذلت کی زندگی کو چند سال اور برداشت کریں۔

بالآخر وہ وقت آیا کہ انہوں نے طبّی کالج سے ڈاکٹری کی سند حاصل کرلی۔ اب انہوں نے مسجد والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے امامت سے استعفیٰ دے دیا اور شہر کے ایک محلہ میں ایک جگہ کرایہ پر لے کر اپنا مطب کھول لیا۔ ان کی زندگی کے تلخ تجربات اور مستقبل کی خاطر ان کی طویل جدوجہد نے ان کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ انہوں نے نہایت محنت اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا مطب چلایا۔ صرف چھ ماہ بعد ان کی آمدنی اتنی ہوگئی کہ ایک مکان لے کر وہ بچوں کے ساتھ بفراغت رہنے لگے۔ ایک سال کے بعد انھیں مقامی طبّی کالج میں لیکچرر کی جگہ بھی مل گئی۔

اس طرح ان کی معاشی زندگی میں مزید استحکام پیدا ہو گیا۔کل کے ملاجی اب ڈاکٹر صاحب بن کر زندگی گزار رہے ہیں۔ان کو عزت بھی حاصل ہے اور معاشی فارغ البالی بھی۔

زندگی کے ناموافق حالات زندگی کے نئے زینے ہوتے ہیں جن کو استعمال کر کے آدمی آگے بڑھ سکتا ہے۔بشرطیکہ وہ ناموافق حالات سے نفرت اور شکایت کا سبق نہ لے۔ بلکہ مثبت ذہن کے تحت اپنے لیے نیا مستقبل بنانے میں لگ جائے۔(الرسالہ،مئی 1982)

یہ احترام نہیں، ناقدری ہے

فقہ کی کتابوں میں علی مرغینانی (593-511ھ) کی کتاب ''ہدایہ'' بہت مشہور اور مقبول کتاب ہے۔علمائے احناف کے فتاوی کا مدار زیادہ تر اسی پر ہے۔اگر کوئی شخص کہے کہ ہدایہ کی جلدوں کو سمجھ کر پڑھنے یا اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں۔بس اس کی ''تلاوت'' کر لینا کافی ہے۔ اس کو جلی حرفوں میں چھپوا لیا جائے اور الفاظ کی صحیح ادائیگی کی ضمانت کے لیے اعراب بھی لگا دیے جائیں اور اس کے بعد لوگوں کو دے دیا جائے کہ وہ صبح وشام اس کے الفاظ کو دہرالیا کریں۔اگر کوئی ایسا کہے تو سارے علما اس کے مخالف ہو جائینگے۔مگر حیرت انگیز بات ہے کہ قرآن کے بارے میں وہ ٹھیک اسی عمل پر راضی ہو گئے ہیں۔ جو بات انھیں شامی اور درمختار اور ہدایہ اور کنز الدقائق کے معاملہ میں بے معنی نظر آتی ہے، وہی بات قرآن کے معاملہ میں عین مطلوب بن گئی ہے۔

مجھے ایک بار سفر میں ایک نوجوان کی ہم راہی کا اتفاق ہوا۔ یہ ایک فیض یافتہ نوجوان تھا اور صوم وصلوٰۃ کا نہایت پابند تھا۔وہ اپنے گلے میں ایک حمائل لٹکائے ہوئے تھا۔ ہمیشہ باوضو رہتا اور جہاں موقع ملتا، قرآن کھول کر اس کی تلاوت شروع کر دیتا۔اس کا ذوق شوق دیکھ کر میں نے کہا: آپ عربی زبان بھی سیکھ لیجیے تا کہ جب آپ قرآن پڑھیں تو اس کو سمجھ بھی سکیں۔

میری اس بات کے جواب میں اس نے جو کچھ کہا وہ عام مسلمانوں کی نفسیات کی مکمل ترجمان تھی:
"ہم تو صرف ثواب کے لیے قرآن پڑھتے ہیں"۔

یہ حال اس کتاب کا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس کے اتارنے کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ لوگ اس پر غور کریں اور اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کریں (ص، 38:29)
(الرسالہ، مئی 1978)

تعمیر شعور

ایک عالم ملاقات کے لیے آئے۔ وہ ایک بڑے عربی دینی مدرسہ سے فارغ ہیں اور مدرسہ کے چندہ کے لیے ہر سال سفر کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اس سلسلہ میں کئی بار انڈمان جا چکے ہیں۔ انڈمان کے لیے کلکتہ سے پانی کے جہاز کے ذریعہ جانا ہوتا ہے۔ یہ مسلسل پانچ دن کا سفر ہے۔ بڑے جہاز میں ڈھائی ہزار آدمی ہوتے ہیں۔ پانچ سو آدمی صرف عملہ کے ہوتے ہیں۔ اس میں پولیس کے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔

اس طرح کی بہت سی معلوماتی باتیں انہوں نے بتائیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے کئی بار سمندر کے ذریعہ انڈمان کا سفر کیا ہے۔ کسی سفر میں کوئی خاص سبق آموز بات جو آپ کو ملی ہو، وہ بتائیے۔ مگر وہ کوئی سبق کی بات نہ بتا سکے۔

اسلامی نظام کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کے تمام ادارے اور اس کی سرگرمیاں (education oriented) ہوں، مدرسہ، مسجد، اجتماع، قیادت اور صحافت سب اس طرح چلائے جائیں کہ ان سے مسلمانوں کا شعور بیدار ہوتا رہے۔ مگر یہی وہ اصل چیز ہے جس سے ہمارے تمام ادارے بالکل خالی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا کوئی ادارہ بھی شعور کی تربیت کا کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ بلاشبہ موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمی ہے۔ (ڈائری، 22 جنوری 1989)

ناکامی کا سبب

ہندستان کے مسلمانوں نے 1857 میں انگریزوں سے جنگ کی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو مکمل شکست ہوئی۔ 1860 میں ہندستان کے مسلمانوں نے جان لیا کہ انگریزوں کی سلطنت ہندستان میں ایک مسلمہ امر بن چکی ہے۔ اس وقت ہندستان کے مسلم علما کا پہلا ردّ عمل کیا ہوا۔ یہ کہ ہندستان کے مسلمانوں کو انگریزی تہذیب اور انگریزی تعلیم سے بچایا جائے۔ اس کے تحت ملک میں کثرت سے عربی مدارس قائم کیے گئے۔

یہ ردّعمل کی بڑی عجیب مثال ہے۔ انگریزوں کے مقابل میں شکست کا اصل ردّعمل یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلم علما میں یہ ذہن ابھرے کہ انگریزوں کے پاس وہ کون سی طاقت ہے کہ وہ باہر سے آکر ملک میں قابض ہو گئے ہیں۔ اور پھر ان کی طاقت کو جان کر اس کو حاصل کیا جائے اور پھر ان کے خلاف زیادہ موثر انداز میں اقدام کیا جائے۔

صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد عیسائیوں میں یہ ذہن ابھرا تھا کہ مسلمانوں کی طاقت کے راز کو جانیں۔ انھوں نے تیزی سے عربی زبان سیکھی اور مسلمانوں کے علوم کا لاتینی زبان میں ترجمہ کیا۔ مگر جب تاریخ بدلی اور دور جدید میں مسلمانوں کو مسیحی اقوام کے مقابلہ میں شکست ہوئی تو مسلمان یہ نہ سوچ سکے کہ وہ مسیحی قوموں کی طاقت کے راز کو جانیں اور اپنے آپ کو اس کے اعتبار سے کریں۔ وہ صرف تحفظ کی نفسیات میں بند ہو کر رہ گئے۔ (ڈائری، 7 اگست 1984)

دعوتی ذہن

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں قرآن (Quran) پر مفصل مقالہ ہے۔ اس کے آخر میں قرآنی تراجم کی تفصیل ہے۔ عجیب بات ہے کہ فارسی، ترکی اور اردو میں تو مسلمانوں نے قرآن کے

ترجمے کیے۔ یہ زبانیں مسلمانوں کی زبانیں تھیں۔ مگر دوسری زبانوں میں قرآن کے ترجمے عرصہ دراز تک صرف غیر مسلم کرتے رہے۔

لاتینی زبان میں پہلا ترجمہ 1143 میں کیا گیا۔ یہ ترجمہ ایک عیسائی پادری نے کیا۔ اسی طرح اطالوی، جرمن، ڈچ، فرانسیسی وغیرہ زبان میں بھی ابتدائی ترجمے عیسائیوں اور یہودیوں نے کیے۔ انگریزی میں بھی پہلا ترجمہ الگزینڈر رراس نے کیا، وغیرہ۔ عیسائیوں کے بعد انگریزی میں جس شخص نے پہلا ترجمہ کیا وہ ایک قادیانی تھا۔ بعد کو دوسرے کچھ مسلمانوں کے ترجمے شائع ہوئے۔ زیادہ تر اس جذبہ کے تحت کہ دوسروں نے غلط ترجمہ کیا ہے، اس کو صحیح کیا جائے۔

اس کی وجہ مسلمانوں میں دعوتی ذہن نہ ہونا ہے۔ ہمارے علما و مفسرین زیادہ سے زیادہ یہ سوچ سکے کہ غیر عربی داں مسلمانوں کے لیے قرآن کا ترجمہ تیار کریں۔ یہ بات ان کے ذہنی دائرہ سے باہر رہی کہ غیر مسلم اقوام کے لیے ان کی اپنی زبانوں میں قرآن کے ترجمے تیار کرکے شائع کیے جائیں تاکہ وہ اسلام سے واقف ہوں۔ (ڈائری، 30 ستمبر 1984)

ایک عالم دین کی قربانی

1947ء کے بعد ہریانہ، پنجاب، ہماچل پردیش اور راجستھان کے علاقہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کو دوبارہ اس علاقہ میں جمانے کے لیے سب سے زیادہ جس نے کام کیا وہ بلاشبہ جمعیۃ علما ہند ہے۔

یہ کام کس طرح انجام دیا گیا، اس کی ایک مثال مولانا ممتاز احمد قاسمی ہیں۔ 1963ء میں دارالعلوم سے فراغت کے بعد انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ طب کی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ وہ دہلی آکر مولانا محمد میاں صاحب سے ملے۔ وہ چاہتے تھے کہ مولانا محمد میاں ان کے لیے حکیم عبدالحمید صاحب کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیں تاکہ طبیہ کالج میں آسانی سے ان کا داخلہ ہو

جائے۔ مولانا محمد میاں نے ان کی بات سننے کے بعد کہا کہ اگر تم میرا مشورہ مانو تو میں تم کو ایک اور زیادہ بہتر کام بتاتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ دیکھو، یہ ہماچل پردیش کے ایک گاؤں سے خط آیا ہے کہ یہاں ایک عالم بھیجیے۔ میری رائے ہے کہ تم وہاں چلے جاؤ۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی اللہ کے بھروسہ پر روانہ ہو گئے۔ یہ شملہ کے قریب ایک گاؤں تھا۔ وہاں کی مسجد میں آ کر وہ مقیم ہو گئے۔ مگر شروع میں یہ حال تھا کہ اتنے مسلمان نہیں ملتے تھے کہ باجماعت نماز قائم ہو سکے۔ ایک روز جمعہ کا دن تھا۔ مسجد میں صرف دو آدمی تھے۔ تیسرے کی تلاش میں وہ باہر نکلے۔ ایک جاہل مسلمان گھاس کا گٹھر باندھ کر کھڑا ہوا تھا۔ مولانا ممتاز صاحب نے اس سے مسجد چلنے کے لیے کہا۔ اس نے کہا کہ تم مولویوں کو اور تو کوئی کام نہیں۔ پھر وہ بولا کہ اگر تم میرا یہ گھاس کا گٹھر اٹھا لو تو میں تمہارے ساتھ مسجد چلنے کے لیے تیار ہوں۔ مولانا ممتاز صاحب نے فوراً دونوں ہاتھوں سے گھاس کا گٹھر اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ اب وہ دیہاتی مسلمان مسکرانے لگا اور مسجد میں آ کر نماز میں شریک ہو گیا۔ آج یہ گاؤں کافی ترقی کر چکا ہے۔ اب وہاں نہ صرف مدرسہ اور مسجد آباد ہیں، بلکہ وہاں کے مسلمان تعلیم اور اقتصادیات میں بھی کافی آگے بڑھ چکے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد مولانا ممتاز صاحب شملہ منتقل ہو گئے۔ (شملہ کا سفر، اسفار ہند)

صحیح سبق

حضرت شفیق بلخی اور حضرت ابراہیم ادہم دونوں ہم زمانہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار شفیق بلخی اپنے دوست ابراہیم ادہم کے پاس آئے اور کہا کہ میں ایک تجارتی سفر پر جا رہا ہوں۔ سوچا کہ جانے سے پہلے آپ سے ملاقات کر لوں۔ کیوں کہ اندازہ ہے کہ سفر میں کئی مہینے لگ جائیں گے۔

اس ملاقات کے چند دن بعد حضرت ابراہیم ادہم نے دیکھا کہ شفیق بلخی دوبارہ مسجد میں موجود ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ تم سفر سے اتنی جلدی کیسے لوٹ آئے۔ شفیق بلخی نے بتایا کہ میں

تجارتی سفر پر روانہ ہو کر ایک جگہ پہنچا۔ وہ ایک غیر آباد جگہ تھی۔ میں نے وہاں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں میں نے ایک چڑیا دیکھی جو اڑنے کی طاقت سے محروم تھی۔ مجھے اس کو دیکھ کر ترس آیا۔ میں نے سوچا کہ اس ویران جگہ پر یہ چڑیا اپنی خوراک کیسے پاتی ہو گی۔ میں اس سوچ میں تھا کہ اتنے میں ایک اور چڑیا آئی۔ اس نے اپنی چونچ میں کوئی چیز دبا رکھی تھی۔ وہ معذور چڑیا کے پاس اتری تو اس کی چونچ کی چیز اس کے سامنے گر گئی۔ معذور چڑیا نے اس کو اٹھا کر کھالیا۔ اس کے بعد آنے والی طاقت ور چڑیا اڑ گئی۔

یہ منظر دیکھ کر میں نے کہا سبحان اللہ۔ خدا جب ایک چڑیا کا رزق اس طرح اس کے پاس پہنچا سکتا ہے تو مجھ کو رزق کے لیے شہر در شہر پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں سے واپس چلا آیا۔ یہ سن کر حضرت ابراہیم ادہم نے کہا کہ شفیق، تم نے اپاہج پرندے کی طرح بننا کیوں پسند کیا۔ تم نے یہ کیوں نہیں چاہا کہ تمہاری مثال اس پرندے کی سی ہو جو اپنے قوت بازو سے خود بھی کھاتا ہے اور اپنے دوسرے ہم جنسوں کو بھی کھلاتا ہے۔ شفیق بلخی نے یہ سنا تو ابراہیم ادہم کا ہاتھ چوم لیا اور کہا کہ ابو اسحاق، تم نے میری آنکھ کا پردہ ہٹا دیا۔ وہی بات صحیح ہے جو تم نے کہی۔

ایک ہی واقعہ ہے، اس سے ایک شخص نے بے ہمتی کا سبق لیا اور دوسرے شخص نے ہمت کا۔ اسی طرح ہر واقعہ میں بیک وقت دو پہلو موجود ہوتے ہیں۔ یہ آدمی کا اپنا امتحان ہے کہ وہ کسی واقعہ کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ایک زاویہ سے دیکھنے میں ایک چیز بری نظر آتی ہے، دوسرے زاویہ سے دیکھنے میں وہی چیز اچھی بن جاتی ہے۔ ایک رُخ سے دیکھنے میں ایک واقعہ میں منفی سبق ہوتا ہے اور دوسرے رخ سے دیکھنے میں مثبت سبق۔ (الرسالہ، فروری 1986)

شکر کا موقع

ایک مسلمان عالم ہیں۔ وہ ایک دینی مدرسہ چلاتے ہیں۔ انہوں نے ایک عرب ملک کو مالی امداد کی درخواست دی تھی۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد ان کی درخواست منظور ہوگئی اور رقم دہلی کے مذکورہ عربی سفارتخانہ میں بھیج دی گئی۔ وہ دہلی آکر اپنی رقم لے گئے۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ جیسے ہزاروں لوگ اس طرح کی امداد وصول کر رہے ہیں۔ کچھ وہ لوگ جو بڑی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں، وہ اس سے بھی زیادہ بڑے مواقع پا رہے ہیں۔ مگر میرے علم میں کوئی شخص نہیں جو اس کو خدا کی نعمت سمجھے اور علی الاعلان اس کا ذکر کر کے خدا کا اعتراف کرے۔ شکر، دین کا خلاصہ ہے اور وہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے نکل گیا ہے۔

اللہ تعالی کو یہ مطلوب ہے کہ ہر زمانہ میں کچھ لوگ ہوں جو دین کا کام کریں۔ مسجد اور مدرسہ چلانا، دعوت اور تبلیغ کا کام کرنا، اسلامی علوم کی خدمت کرنا، وغیرہ۔ اس طرح کی خدمت کے ساتھ آدمی معاشی کام نہیں کرسکتا۔ اس بنا پر اللہ تعالی نے بہت بڑے پیمانہ پر یہ انتظام کر دیا کہ ہر دور میں اہل دین معاش سے فارغ ہو کر دین کی خدمت میں مشغول رہیں۔

اس اعتبار سے اسلام کی تاریخ کے تین دور ہیں۔ سیاسی دور، زراعتی دور، صنعتی دور۔ قدیم دور سیاسی دور تھا۔ اس زمانہ میں اس قسم کے خادمان دین کے لیے اسلامی حکومت سے باقاعدہ وظیفے جاری کیے جاتے تھے۔ اس کے بعد زمیندار، جاگیردار اور نواب پیدا ہوئے جو گویا زراعتی دور کے سرمایہ دار تھے۔ یہ لوگ مستقل طور پر دینی خادموں کا مالی تعاون کرتے رہے۔

جدید صنعتی دور میں مسلمان اقتصادی اعتبار سے بالکل پسماندہ ہو چکے تھے۔ اللہ تعالی نے یہ کیا کہ عرب سرزمین کے نیچے تیل کا زبردست ذخیرہ پیدا کر دیا جو ان کے لیے صنعتی پس ماندگی کی تلافی بن گیا۔ یہی تیل کی دولت ہے جو دنیا بھر کے تمام دینی اداروں اور دینی شخصیتوں کو

مالی امداد فراہم کر رہی ہے۔ لاکھوں لوگ اس سے غیر معمولی فائدے حاصل کر رہے ہیں۔ مگر میرے علم کے مطابق کوئی بھی ایسا شخص نہیں جس کے سینہ میں اس نعمت خداوندی کی بنا پر شکر کا سمندر موجزن ہو گیا ہو۔ (ڈائری، 24 دسمبر 1990)

داعی نہ کہ ادیب

دو مسلم نوجوان ملاقات کے لیے آئے۔ وہ اورنگ آباد کے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ حال میں انہوں نے اورنگ آباد کے مدرسہ سے فراغت حاصل کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ایک استاد مولانا ادریس صاحب آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ ہم لوگ کسی کام سے دلّی آئے تھے تو ہم نے چاہا کہ آپ سے بھی ملاقات کریں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے استاد میرے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کا کہنا ہے کہ آپ جیسا ادیب برصغیر ہند میں کوئی نہیں۔

میں نے کہا کہ یہ تو آپ نے میری تعریف نہیں کی بلکہ میرے اوپر پتھر مارا۔ میں ادیب نہیں ہوں بلکہ میری اصل حیثیت یہ ہے کہ میں اسلام کا داعی ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ قدیم عرب میں وہاں کے سردار رسول اللہ کو شاعر کہتے تھے۔ قرآن نے اس کی تردید کی اور کہا کہ وہ شاعر نہیں۔ قدیم عرب سوسائٹی میں شاعر کا لفظ کوئی برا لفظ نہیں تھا، لیکن رسول اللہ کی اصل حیثیت یہ تھی کہ آپ حق کے داعی تھے۔ ایسی حالت میں آپ کو شاعر یا ادیب کہنا آپ کی اصل حیثیت کو گھٹانے کے ہم معنی تھا۔ کسی آدمی کو اگر آپ داعی حق کہیں تو اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کی بات مانیں اور اس کا ساتھ دیں۔ لیکن کسی کا شاعر اور ادیب ہونا آپ کے اوپر اس قسم کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالتا۔ (ڈائری، 12 اپریل 1997)

میں پڑھ کر پڑھاؤں گا

فادر ہنری ہراس (1889-1956) ایک اسپینی مسیحی تھے۔ وہ 34 سال کی عمر میں 18 نومبر 1922 کو بمبئی کے ساحل پر اترے۔ ہندستان کی زمین نے ان کو متاثر کیا۔ ان کو محسوس ہوا کہ ان کے تبلیغی حوصلہ کے لیے اس ملک میں کام کا اچھا میدان ہے۔ انہوں نے طے کرلیا کہ وہ یہاں رہ کر اپنا تبلیغی کام انجام دیں گے۔

مگر ہندستان ان کا وطن نہیں تھا۔ کام سے پہلے ضروری تھا کہ یہاں ان کے لیے قیام کی کوئی بنیاد ہو۔ یہاں اپنی جگہ بنا کر ہی وہ یہاں کی آبادی میں اپنے تبلیغی کام کو جاری رکھ سکتے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ ہندستان میں بحیثیت معلم کے قیام کریں گے اور اس کے بعد کالج میں اور کالج کے باہر اپنے لیے کام کی تدبیر کریں گے۔ بمبئی کا ہراس انسٹیٹیوٹ (Heras Institute) انھیں کی یادگار ہے۔

فادر ہراس (Fr. Henry Heras) چند دن بعد سینٹ زیویرس کالج بمبئی کے پرنسپل سے ملے وہ ایک تاریخ دان تھے۔ انہوں نے اپنے ملک سے تاریخ میں ڈگری لی تھی۔ پرنسپل نے ان کے کاغذات دیکھ کر پوچھا: ”آپ یہاں کون سی تاریخ پڑھانا پسند کریں گے“ فادر ہراس نے فوراً جواب دیا ”ہندستانی تاریخ۔“ پرنسپل کا اگلا سوال تھا: ہندستانی تاریخ میں آپ کا مطالعہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ”کچھ نہیں“۔ پھر آپ کیسے ہندستانی تاریخ پڑھائیں گے“ پرنسپل نے پوچھا۔ فادر ہراس کا جواب تھا:

I shall study it.

میں ہندستانی تاریخ کا مطالعہ کرکے اپنے آپ کو تیار کروں گا۔ پھر اس کو پڑھاؤں گا۔

فادر ہراس جانتے تھے کہ معلمی کا کام وہ بطور پیشہ نہیں اختیار کر رہے ہیں کہ یورپ کی تاریخ یا جو مضمون بھی وہ چاہیں پڑھائیں اور مہینہ کے آخر میں تنخواہ لے کر وہ مطمئن ہوجائیں۔ ان کے

لیے معلمی کا کام ایک خاص مقصد کی خاطر تھا۔ اور وہ یہ کہ وہ اپنے تبلیغی کام کے لیے مناسب بنیاد فراہم کریں اور اس مقصد کے اعتبار سے ان کے لیے "ہندستانی" تاریخ سب سے زیادہ موزوں مضمون تھا۔ وہ ہندستان میں تھے اس لیے ہندستانی تاریخ کے معلم بن کر وہ زیادہ بہتر طور پر یہاں کے نوجوانوں میں اپنے دین کی تبلیغ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندستان کی تاریخ سے نا آشنا ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے مضمون کے لیے ہندستانی تاریخ کو پسند کیا۔

انھوں نے ہندستانی تاریخ کے مطالعہ میں اتنی زیادہ محنت کی کہ وہ نہ صرف اس مضمون کے اچھے معلم بن گئے بلکہ ہندستانی تاریخ میں سرجادو ناتھ سرکار اور ڈاکٹر سریندر ناتھ سین کے درجہ کے مورخ کی حیثیت حاصل کرلی۔ (الرسالہ، مارچ 1984)

ایک کردار ادا کرنے کے لیے

22 ملین ڈالر کے خرچ سے " گاندھی " کے نام پر ایک فلم بنی ہے جس میں مہاتما گاندھی کی زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ اس فلم کے بنانے والے ایک انگریز سر رچرڈ اٹن برو (Richard Attenborugh, 1923-2014) ہیں۔ وہ بیس سال سے اس فلم کو بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی مووی کمپنی اس میں سرمایہ لگانے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی، کیونکہ اس فلم کے متعلق ان کا عام خیال یہ تھا کہ وہ بالکل غیر نفع بخش (totally uncommercial) ہوگی۔ مگر بن کنگسلے (Ben Kingsley) نے اتنی کامیابی کے ساتھ گاندھی کا پارٹ ادا کیا کہ یہ فلم آج کامیاب ترین فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔

بن کنگسلے کے باپ ایک ہندستانی گجراتی ڈاکٹر تھے۔ جنھوں نے ایک انگریز خاتون سے شادی کی۔ ان کا ابتدائی نام کرشنا بھنجی تھا۔ بعد کو انھوں نے اپنا نام بن کنگسلے رکھ لیا۔ بن کنگسلے کو گاندھی سے جسمانی مشابہت کی بنا پر اس فلم میں ہیرو کا پارٹ ادا کرنے کے لیے چنا گیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے طویل مدت تک سخت محنت کی۔

بن کنگسلے شوٹنگ سے کافی پہلے ہندستان آئے۔ انہوں نے اپنے سر کو منڈایا تاکہ ان کا سر گاندھی کی طرح گنجا معلوم ہو۔ وہ موٹے تھے چنانچہ انہوں نے مسلسل کم کھانا کھا کر اپنا وزن 20 کلو تک گھٹایا اور اپنے کو دبلا بنایا۔ سورج میں دیر دیر تک رہے تاکہ ان کا رنگ سانولا دکھائی دینے لگے۔ فلم کی کہانی کو پورا کا پورا یاد کر ڈالا۔ انہوں نے اپنے کمرہ کی دیواروں کو مہاتما گاندھی کی تصویروں سے بھر دیا۔ وہ مہاتما گاندھی کی پانچ گھنٹہ کی ڈاکومنٹری کو دیکھتے رہے۔ وہ گاندھی کی طرح پاؤں توڑ کر بیٹھنے پر قادر نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے روزانہ دو گھنٹے کی یوگا ورزش کر کے اپنے کو اس کا عادی بنایا کہ وہ پاؤں توڑ کر دیر دیر تک بیٹھیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے روزانہ دو گھنٹے چرخا چلایا تاکہ وہ شوٹنگ کے وقت بالکل مہاتما گاندھی کی طرح چرخا چلا سکیں۔ (نیوز ویک 13 دسمبر 1982)

بن کنگسلے کو ایک فلم میں خاص کردار ادا کرنا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے اتنی تیاریاں کیں۔ طویل مدت تک سخت محنت کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ وہ یہ کردار ادا کرنے میں کامیاب ہوں۔ پھر جو لوگ اپنے کو خیر امت کہتے ہیں ان کو تو تاریخ انسانی میں اہم ترین کردار ادا کرنا ہے۔ کیا وہ کسی تیاری کے بغیر یہ مشکل رول ادا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ (الرسالہ، مئی 1983)

عزم واستقلال

کچھ مسلم نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ آپ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرو مگر جب مسلمانوں کو اسکول اور کالج میں داخلہ ہی نہ ملے تو پڑھیں گے کیوں کر۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل بے بنیاد عذر ہے۔ میرے بھائی عبدالمحیط خاں اور میرے بھتیجے شکیل احمد خاں کو بنارس ہندو یونیورسٹی میں داخلہ ملا۔ اور دونوں نے وہاں انجنیئرنگ کی ڈگری امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ آپ اگر واقعی پڑھنا چاہیں تو کوئی آپ کو روک نہیں سکتا۔

پھر میں نے اپنی مثال دی۔ عربی مدرسہ میں عربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے یہ چاہا کہ انگریزی زبان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔ یہ غالباً 1944 کی بات ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) میں عربی مدارس کے طلبہ کے لیے داخلہ کی ایک صورت پہلے سے موجود ہے۔ اس کے مطابق میں نے جامعہ ملیہ میں داخلہ کا ارادہ کیا تھا۔

میرے چچازاد بھائی مولانا اقبال احمد سہیل کا ڈاکٹر ذاکر حسین سے بہت قریبی تعلق تھا۔ میں سہیل صاحب کا ایک سفارشی خط لے کر اعظم گڑھ سے دلی آیا اور اوکھلا پہنچ کر ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ملنساری اور خوش اخلاقی مشہور ہے۔ مگر کسی نامعلوم سبب کے تحت انہوں نے میرے ساتھ نہایت خشک رویہ اختیار کیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ میں سہیل صاحب کا خط دے کر ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے خط پڑھا اور اس کے بعد مزید کچھ پوچھے بغیر سادہ طور پر داخلہ لینے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں پرائیویٹ طور پر انگریزی پڑھوں گا۔ سالہا سال کی محنت کے بعد خدا کے فضل سے میں نے اتنی انگریزی سیکھ لی کہ ہر طرح کی انگریزی کتاب پڑھ سکتا ہوں۔ جامعہ کے انگریزی کے استاد انوار علی خاں سوز مرحوم الرسالہ کے قاری تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وحید الدین خان انگریزی عبارتوں کا جو ترجمہ کرتے ہیں اس سے اچھا ترجمہ ہم لوگ نہیں کر سکتے ہیں۔ (ڈائری، 14 فروری 1990)

مثبت اثر لینا

مولانا سید نور ابراہیم (28 سال) پونے کی ایک مسجد میں امام ہیں۔ 1987ء میں یہ واقعہ ہوا کہ انہوں نے ایک مطبوعہ اردو اعلان مسجد میں پڑھ کر سنایا۔ اس اعلان میں "آرگنائزیشن" کا لفظ تھا وہ اس کا صحیح تلفظ نہ کر سکے۔

اس کے بعد انھیں احساس ہوا کہ میں نے مدرسہ سے عالم کی فراغت حاصل کرلی، مگر انگریزی سے میں اتنا زیادہ بے بہرہ ہوں کہ انگریزی کا ایک لفظ جو اردو خط میں چھپا ہوا ہے اس کو میں پڑھ نہیں سکتا۔ یہ سوچ کر ان کے اندر غیرت آئی۔ بازار سے انھوں نے انگریزی کتابیں حاصل کیں اور بطور خود انگریزی پڑھنا شروع کیا۔ اب ذاتی کوشش سے انھوں نے اتنی انگریزی سیکھ لی ہے کہ وہ الرسالہ انگریزی پورا کا پورا سمجھ کر پڑھ لیتے ہیں۔ وہ ہر مہینہ باقاعدہ طور پر انگریزی الرسالہ کا مطالعہ کررہے ہیں۔ (پونہ کا سفر، اسفار ہند)

سچائی کی فتح

تیرھویں صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے جب کہ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ کاندھلہ (ضلع مظفرنگر، یوپی) کی جامع مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں میں نزاع شروع ہوگئی۔ یہ نزاع مسجد سے متصل ایک زمین کے بارے میں تھی۔ مسلمان اس زمین کو مسجد کی ملکیت قرار دے کر مسجد میں شامل کرنا چاہتے تھے اور ہندوؤں کا اصرار تھا کہ یہ قدیم مندر کا حصہ ہے۔ جھگڑا بڑھا تو معاملہ عدالت تک پہنچا اور کئی سال تک اس کا مقدمہ چلتا رہا۔

مجسٹریٹ انگریز تھا۔ جو شواہد اس کے سامنے پیش کیے گئے وہ اتنے قطعی نہ تھے کہ ان کی بنیاد پر وہ کسی ایک فریق کے حق میں فیصلہ کرسکے۔ بالآخر مجسٹریٹ نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے الگ الگ گفتگو کی۔ اس نے مسلمانوں سے کہا کہ کیا تمھاری نظر میں کوئی ایسا ہندو ہے جو یہ گواہی دے کہ یہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔ اگر تم کسی ایسے ہندو کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ کردوں گا۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم کسی ہندو کا نام نہیں بتا سکتے، یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور ہم کو کسی ہندو سے یہ امید نہیں کہ ایسے مذہبی معاملہ میں وہ جانب داری کے بغیر بالکل سچ بات کہہ سکے اور یہ گواہی دے کہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔

اس کے بعد انگریز مجسٹریٹ نے ہندوؤں کو بلایا اور کہا کہ کیا تم کسی ایسے مسلمان کا نام بتا سکتے ہو جو تمھارے دعوے کی تصدیق کرے اور یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ملکیت ہے۔ اگر تم ایسے مسلمان کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ تمھارے حق میں کر دوں گا۔ ہندوؤں نے باہم مشورہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجسٹریٹ سے کہا کہ یہ مسئلہ قومی عزت کا معاملہ بن گیا ہے۔ اس لیے بہت مشکل ہے کہ کوئی مسلمان یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ہے تاہم ہماری بستی میں ایک بزرگ ایسے ہیں جن سے ہم کو امید ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔

ہندوؤں نے جس مسلمان کا نام بتایا وہ مولانا مظفر حسین کاندھلوی کے والد مولانا محمود بخش (وفات 1258ھ) تھے۔ مجسٹریٹ کا کیمپ اس وقت کاندھلہ کے قریب موضع ایلم میں تھا۔ اس نے فوراً مولانا محمود بخش کے یہاں پیغام بھیجا کہ وہ کچہری میں پہنچ کر متعلقہ مسئلہ میں اپنا بیان دیں۔ مجسٹریٹ کا بھیجا ہوا آدمی جب مولانا موصوف کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ فرنگی کا منھ کبھی نہیں دیکھوں گا۔ مجسٹریٹ نے دوبارہ اپنا چپراسی بھیج کر کہلایا کہ اس کا انتظام رہے گا کہ میں یا کوئی دوسرا انگریز آپ کے سامنے نہ پڑے۔ آپ مہربانی کر کے تشریف لائیں، کیونکہ آپ ہی کے بیان پر ایک اہم مقدمہ کا فیصلہ ہونا ہے۔ اس نے مزید کہلایا کہ آپ کی مذہبی کتاب قرآن میں یہ حکم ہے کہ کسی معاملہ میں کسی کے پاس گواہی ہو تو وہ اس کو پیش کرے، وہ ہرگز اس کو نہ چھپائے۔

اب مولانا محمود بخش کاندھلوی مجسٹریٹ کی عدالت میں تشریف لائے۔ مجسٹریٹ خیمہ کے اندر دروازہ کے پاس بیٹھ گیا۔ مولانا دروازہ کے پاس باہر کی طرف کھڑے ہو گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بڑی تعداد خیمہ کے باہر جمع تھی۔ ہر ایک ملے جلے جذبات کے ساتھ منتظر تھا کہ دیکھیے آج کیا پیش آتا ہے۔ اندر بیٹھے ہوئے مجسٹریٹ نے بلند آواز سے پوچھا کہ مولانا محمود بخش صاحب یہ بتائیے کہ یہ متنازعہ جگہ ہندوؤں کی ہے یا مسلمانوں کی ہے۔ مولانا

نے فرمایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جگہ ہندوؤں کی ہے، مسلمانوں کا دعویٰ اس کے بارے میں غلط ہے۔ مجسٹریٹ نے مولانا محمود بخش صاحب کے اسی بیان پر اپنا فیصلہ دے دیا اور وہ زمین ہندوؤں کو مل گئی۔ یہ زمین کاندھلہ کی موجودہ جامع مسجد کی جنوب مشرقی دیوار سے ملی ہوئی ہے۔ ہندوؤں نے مجسٹریٹ کے فیصلہ کے فوراً بعد یہاں مندر تعمیر کر دیا۔ اب بھی اس جگہ پر وہ مندر موجود ہے۔

مسلمان کچہری سے اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کے چہرے اداس تھے اور ان کے دلوں میں شکست کا احساس چھایا ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں نے کہا "مولوی نے قوم کو غیروں کے سامنے رسوا کر دیا"۔ مسلمانوں کو معلوم نہ تھا کہ قانون کی عدالت کا فیصلہ اگرچہ ہو چکا ہے مگر اخلاق کی عدالت کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ مولانا محمود بخش کی اس سچائی اور بے لاگ حق پرستی کا ہندوؤں پر بہت اثر پڑا۔ مولانا کی سچائی کے واقعہ میں وہ اس دین کی سچائی کو دیکھنے لگے، جس نے ان کے اندر یہ زبردست قوت پیدا کی کہ وہ ایک نہایت نازک قومی معاملہ میں بھی انصاف سے نہیں ہٹے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاندھلہ کے کئی ہندو خاندان اسلام سے متاثر ہوئے اور مولانا محمود بخش کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ مسلمان اپنا مقدمہ ہار گئے مگر اسلام اپنا مقدمہ جیت گیا۔

دو شخصوں یا گروہوں میں جب بھی کوئی نزاعی معاملہ پیش آتا ہے تو عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر ایک کی نظر مفاد اور مصلحت کی طرف چلی جاتی ہے۔ جس چیز میں بظاہر فائدہ نظر آئے، جو قومی وقار کے مطابق ہو۔ جس میں دنیوی سر بلندی حاصل ہوتی ہو، آدمی بس اسی کی طرف جھک جاتا ہے۔ مگر حقیقی کامیابی کا راستہ یہ ہے کہ معاملہ کو حق اور ناحق اور انصاف اور بے انصافی کی نظر سے دیکھا جائے۔ جو طریقہ حق کے مطابق ہو اس کو اختیار کر لیا جائے اور جو طریق کے خلاف ہو اس کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ اصولی موقف ہے اور اس دنیا میں بالآخر اصولی موقف کامیاب ہوتا ہے، نہ کہ افادی موقف۔ (الرسالہ، ستمبر 1981)

'انا' کی دیوار

یوپی (انڈیا) کے ایک شہر کا واقعہ ہے۔ یہاں ایک مسلم عالم نے ایک مدرسہ بنایا۔ اِس کے بعد وہاں حکومت کی طرف سے ایک سڑک کی تعمیر کی گئی۔ یہ سڑک مدرسے کی عمارت کے پاس سے گزر رہی تھی۔ یہاں مدرسے کی ایک دیوار تھی جو سڑک کی تعمیر میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ مدرسے کے لوگ اِس دیوار کو ہٹانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ پختہ دیوار ہے، ہم اِس کو کیسے ہٹا سکتے ہیں۔ آخرکار یہ معاملہ بڑھ کر نزاع تک پہنچ گیا۔

ایک دوسرے مدرسے کے ذمے دار جو الرسالہ مشن سے وابستہ ہیں، اُن کو معلوم ہوا تو وہ اُس متنازعہ مقام پر گئے۔ انہوں نے مدرسے کے ذمے داروں سے کہا کہ یہ نہ پختہ دیوار ہے اور نہ غیر پختہ دیوار، یہ صرف انا کی دیوار ہے۔ اِس کے بعد مدرسے والے اِس دیوار کو ہٹانے پر راضی ہو گئے اور سڑک اپنے نقشے کے مطابق، تعمیر کر دی گئی۔ اِس واقعے کے بعد اہلِ مدرسہ اور حکومت کے ذمہ داروں کے درمیان اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔ اِس کا مزید فائدہ یہ ہوا کہ وہاں اسلامی دعوت کی راہ ہموار ہو گئی۔

اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کو لوگ رکاوٹ کہتے ہیں، وہ حقیقی رکاوٹ نہیں ہوتی، بلکہ وہ صرف ضد اور انا کی رکاوٹ ہوتی ہے جو بڑھتے بڑھتے ایک سنگین مسئلہ بن جاتی ہے۔ اِس طرح کے مسائل کے موقع پر اگر دانش مندی سے کام لیا جائے تو مسئلہ اِس طرح ختم ہو جائے گا جیسے کہ وہ تھا ہی نہیں۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ مسئلہ صرف ایک ذہنی مسئلہ ہوتا ہے، وہ کوئی حقیقی مسئلہ نہیں ہوتا۔

ہر مسئلہ ابتداءً ایک چھوٹا مسئلہ ہوتا ہے۔ یہ صرف لوگوں کا غیر دانش مندانہ رویہ ہے جو ایک چھوٹے مسئلے کو بڑا مسئلہ بنا دیتا ہے۔ اِس طرح یہ ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ بدستور باقی رہتا ہے اور نئے زیادہ پیچیدہ مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ دانش مندی یہ ہے کہ مسئلے کو پہلے ہی مرحلے

میں ختم کردیا جائے۔ مسئلے کا بڑھنا کسی بھی حال میں مفید نہیں، خواہ وہ فرد کا معاملہ ہو یا جماعت کا معاملہ۔ (الرسالہ، اپریل 2012)

ایک تجربہ

1966 کی بات ہے۔ اس وقت میں ندوہ (لکھنؤ) میں تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ پولیس کی گاڑی ندوہ کے احاطہ میں آکر رُکی۔ اس میں سے کئی پولیس کے لوگ برآمد ہوئے۔ ان کو ندوہ کے ذمہ داروں نے ٹیلی فون کرکے بلایا تھا تاکہ وہ ان کے ایک سنگین مسئلہ کو حل کریں۔

مسئلہ یہ تھا کہ ندوہ اور لکھنؤ یونیورسٹی دونوں بالکل پاس پاس ہیں۔ یونیورسٹی کا ایک ہاسٹل ندوہ کی دیوار سے ملا ہوا ہے۔ اس ہاسٹل کے لڑکے جو سب کے سب غیر مسلم تھے ندوہ والوں کو مسلسل پریشان کررہے تھے۔ وہ گالی دیتے، پتھر پھینکتے، مذاق اُڑاتے اور طرح طرح کی نازیبا حرکتیں کرتے۔ ان کا مقصد غالباً یہ تھا کہ ندوہ کے لوگ مشتعل ہوکر کوئی جارحانہ کارروائی کریں اور پھر یونیورسٹی کے لڑکوں کو ندوہ کے خلاف بھرپور فساد کرنے کا بہانہ ہاتھ آجائے۔

یہ مسئلہ برسوں سے جاری تھا۔ ندوہ والوں نے پریشان ہوکر پولیس بلائی اور ان سے فریاد کی۔ پولیس والے حسب دستور رسمی کارروائی کرکے واپس چلے گئے۔ اور اصل مسئلہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔

یہ مسئلہ اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ 1974 میں ندوہ کے ذمہ داروں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ یہ مسئلہ نہ پولیس کے ذریعہ حل ہوسکتا ہے اور نہ براہ راست ٹکراؤ کے ذریعہ اسے ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اس کو تالیف قلب کے اسلامی اصول کو استعمال کرکے حل کیا جائے۔ اس فیصلہ کے تحت مولانا علی میاں کے رفیق خاص مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم اس کے ذمہ دار بنائے گئے۔

منصوبہ کے مطابق مولانا اسحاق جلیس ندوی نے پہلے یہ پتہ لگایا کہ ہاسٹل کے لڑکوں میں

لیڈر کون کون ہے۔ انہوں نے ان لیڈروں سے ملاقات کی۔ ان کو ندوہ میں نہایت اہتمام کے ساتھ چائے پر بلایا گیا۔ ندوہ والوں نے ان "ظالم" لڑکوں سے ان کے ظلم اور بدتمیزی کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ ان سے ساری ملاقات اور گفتگو اس طرح کی گئی جیسے کہ ندوہ والوں کو ان سے کوئی شکایت ہی نہیں۔ پوری مدت میں ندوہ کے لوگ ان سے اس طرح معتدل انداز میں ملتے رہے جیسے کہ ان کی طرف سے ظلم وزیادتی کا کوئی واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔

ان گفتگوؤں اور ملاقاتوں کے نتیجہ میں، عین پیشگی منصوبہ کے مطابق، یہ ہوا کہ ندوہ کی ٹیم اور یونیورسٹی کی ٹیم کے درمیان ہاکی میچ رکھا گیا۔ ندوہ کے لڑکے ہاکی کھیلنے میں مشہور ہیں۔ مگر انھیں پیشگی طور پر یہ سمجھا دیا گیا کہ تمہیں اس میچ میں جیتنا نہیں ہے۔ تم کو جان بوجھ کر خراب کھیل کھیلنا ہے تاکہ تم ہار جاؤ۔ منصوبہ یہ تھا کہ جان بوجھ کر یونیورسٹی کے لڑکوں کو کھیل میں جتایا جائے اور پھر انھیں ہیرو بنا کر ان کے دل کو جیتنے کی کوشش کی جائے۔

مقررہ تاریخ کو دونوں کے درمیان ہاکی میچ ہوا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ندوہ کے نوجوان خراب کھیل کھیلے اور یونیورسٹی کے لڑکوں کو بالقصد یہ موقع دیا کہ وہ بہتر کھیل کھیل کر میچ جیتیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ یونیورسٹی کے طلبہ ندوہ کے طلبہ کے مقابلہ میں "شاندار طور پر" کامیاب ہو گئے۔ اب طے شدہ منصوبہ کے مطابق یونیورسٹی کے لڑکوں کو خوب اچھالا گیا۔ مختلف طریقوں سے ان کی تالیف قلب کی گئی۔ ان کو دل کھول کر انعامات دیے گئے۔ ان کا ہیروانہ استقبال کیا گیا، وغیرہ۔

یونیورسٹی کے طلبہ ندوہ والوں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی چاہتے تھے اور ندوہ والوں نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو جھکا کر ان کی بڑائی کا اعتراف کر لیا۔ ندوہ کے لوگوں نے اپنے مذکورہ عمل سے یونیورسٹی کے طلبہ کے جذبات برتری کو پوری طرح تسکین دے دی۔ اب مسئلہ اپنے آپ حل تھا۔ یونیورسٹی کے طلبہ نے اس کے بعد پھر کبھی ندوہ والوں کو پریشان نہیں کیا۔

یہ ایک عظیم الشان مثال ہے جو یہ بتاتی ہے کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کا حل کیا

ہے۔ وہ حل یہ ہے کہ مسلمان یک طرفہ اقدام کے ذریعہ ہندو مسلم تناؤ کو ختم کردیں۔ وہ خود ''چھوٹے بھائی'' بن کر فریق ثانی کو ''بڑے بھائی'' کا درجہ دینے پر راضی ہوجائیں، اور اس کے بعد ان کے تمام مسئلے یقینی طور پر حل ہوجائیں گے۔

ندوہ کا مذکورہ واقعہ مزید اس جھوٹے اندیشہ کو غلط ثابت کرتا ہے کہ اگر ہم جھکیں گے تو وہ اور زیادہ دلیر ہوجائیں گے۔ مذکورہ واقعہ میں ندوہ والوں نے واضح طور پر یک طرفہ جھکاؤ کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کے نتیجہ میں بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے غیر مسلم طلبہ کی ہمتیں اور زیادہ بڑھ جائیں۔ وہ پہلے سے زیادہ جری ہوکر ندوہ والوں کو ستانے لگیں۔ ندوہ والوں کا نرم رویہ ان کو اور زیادہ سخت رویہ والا بنا دے۔ مگر ایسا قطعاً نہیں ہوا۔ بلکہ ندوہ والوں کے جھکاؤ نے انھیں بھی جھکا دیا۔ ایک فریق کی نرمی دوسرے فریق کو نرم کرنے کا سبب بن گئی۔ جو مسئلہ دس سال سے ناقابل حل بنا ہوا تھا، وہ ایک دن کے اندر لڑے بھڑے بغیر حل ہوگیا۔ 1974 کے بعد وہ دوبارہ کبھی پیش نہیں آیا۔

ندوہ کے اس چھوٹے سے واقعہ میں اس عظیم تر مسئلہ کے بارے میں رہنمائی موجود ہے جس کو عام طور پر ملی مسئلہ کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ عملی تجربہ کی زبان میں بتا رہا ہے کہ ملک کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ندوہ والوں نے اپنے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اپنے محدود دائرہ میں جو تدبیر کی وہی تدبیر وسیع تر دائرہ میں ملت کے مسائل کا بھی واحد یقینی حل ہے۔ اگر مسلمان اس دانش مندی کا ثبوت دیں، جس کا ثبوت ندوہ والوں نے دیا تو یقینی طور پر ان کے تمام جھگڑے ختم ہوجائیں گے۔ اور پھر مسلمانوں کو موقع مل جائے گا کہ وہ امن اور یکسوئی کے ماحول میں اپنی تعمیر و ترقی کا کام کرسکیں۔ اس کے بعد وہ تعمیر کے کام کے لیے بھی مواقع پالیں گے اور اسلام کے تعارف کے لیے بھی۔ (الرسالہ، جون 1986)

امام کبھی جھوٹ نہیں بولتا

میرٹھ میں ایک عربی مدرسہ امدادالاسلام کے نام سے ہے۔ اس کے شیخ الحدیث مولانا شکیل احمد قاسمی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنا قصہ بتایا جو جنوری 1965 میں پیش آیا۔ راشن کے دکاندار نے بتایا کہ آپ اپنے راشن کارڈ کو ویریفائی کرالیں۔ ورنہ آئندہ اس پر راشن نہیں ملے گا۔ انہوں نے اپنا راشن کارڈ دفتر میں داخل کر دیا۔ انسپکٹر جانچ کے لیے مولانا کے گھر آیا تو اتفاق سے وہ موجود نہ تھے۔ چنانچہ ویریفیکیشن نہ ہو سکا۔ مولانا دوبارہ دفتر میں گئے۔ وہاں وہ ایک مسلمان انسپکٹر مسٹر خورشید احمد سے ملے۔ خورشید صاحب نے کہا کہ اب تو یہی کیا جاسکتا ہے کہ آپ دوبارہ درخواست دیدیں۔ انکوائری کے لیے تو آدمی جائے گا۔ ویریفیکیشن کے بغیر تو آپ کا کارڈ نہیں بن سکتا۔

مولانا واپس جارہے تھے کہ راستے میں محمد معراج صاحب مل گئے جن کی مسجد میں مولانا جمعہ کی نماز پڑھاتے ہیں۔ معراج صاحب نے کہا کہ اس طرح تو آپ کا کارڈ بننے میں مہینوں لگ جائیں گے۔ وہ دوبارہ مولانا کو دفتر لے گئے، اور ہندو افسر (A.D.M.) سے کہا۔ ہندو افسر نے قصہ سننے کے بعد فوراً مذکورہ خورشید صاحب کو بلایا اور کہا کہ ان کا کارڈ ابھی بنا کر دے دیجیے۔ کیوں کہ یہ امام ہیں، اور امام کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ ان کے پاس کہاں اتنا وقت ہے کہ وہ بار بار آئیں۔

مولانا شکیل صاحب کارڈ لے کر چلنے لگے تو مذکورہ ہندو افسر نے دوبارہ بلایا۔ اس نے پوچھا کہ آپ کو کتنا تیل ملتا ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پانچ لیٹر۔ اس نے کہا کہ نہیں، آپ اپنے دکاندار سے کہیے کہ وہ آپ کو دس لیٹر تیل دے۔ کیونکہ گیس والوں کے لیے 5 لیٹر ہے اور بے گیس والوں کے لیے دس لیٹر۔ مولانا شکیل صاحب نے کہا کہ یہ قاعدہ مجھ کو معلوم نہیں تھا اور دکاندار ہم کو 5 لیٹر سے زیادہ نہیں دیتا تھا۔ ہندو افسر نے کہا کہ آپ کا دکاندار اگر دس لیٹر نہ دے تو دوبارہ میرے پاس آئیے۔ (ڈائری، 14 مارچ 1995)

امن کا فائدہ

بھوپال کے محمد ذاکر حسین کے صاحبزادہ محمد زبیر کی عمر ابھی صرف آٹھ سال ہے اور انہوں نے آدھا قرآن حفظ کر لیا ہے۔ میں نے صاحبزادہ سے کہا کہ آپ قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر سنائیں انہوں نے سُبۡحَانَ الَّذِیۡ أَسۡرَیٰ بِعَبۡدِهٖ سے پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کے پڑھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی پختہ قاری پڑھ رہا ہو۔ ان کو سن کر میں نے کہا کہ یہ بھی قرآن کا ایک زندہ معجزہ ہے کہ 8 سال کا ایک بچہ 15 پارہ حفظ کر لے اور اس کو ایک پختہ قاری کی طرح پڑھ کر سنائے معلوم ہوا کہ انہوں نے صرف ڈیڑھ سال میں یہ حفظ کیا ہے۔

مذکورہ بچہ کے استاد حافظ عبد الرقیب صاحب ہیں۔ وہ اپنے بزنس کے سلسلہ میں ہر روز بھوپال سے بیر کھیڑی جاتے ہیں۔ 32 کلو میٹر کا یہ فاصلہ بس کے ذریعہ طے ہوتا ہے۔ بس کے مالک غیر مسلم ہیں مگر جب انہوں نے جانا کہ یہ بچہ اپنے استاد کے ساتھ حفظ قرآن کے لیے روزانہ سفر کرتا ہے تو انہوں نے بچہ کا کرایہ لینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ یہ بچہ ہر روز 64 کلو میٹر کا یہ سفر بس کے ذریعہ طے کرتا ہے مگر بس کے مالکان اس کا کرایہ نہیں لیتے۔ یہ قصہ سن کر میں نے کہا کہ یہ بھی قرآن کی ایک کرامت ہے۔ (الرسالہ، مارچ 1999)

دار العلوم دیوبند کا ایک واقعہ

5 مارچ 2000 کو ہندوستانی وزیر خارجہ مسٹر جسونت سنگھ کا ٹیلی فون آیا۔ انہوں نے کہا کہ ایک مسئلہ میں آپ سے بات کرنا ہے۔ اس کے لیے میں وزارت خارجہ کے جوائنٹ سکریٹری مسٹر وویک کاٹجو کو آپ کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد وہ 5 مارچ کی شام کو ہمارے دفتر میں آئے اور دیر تک گفتگو کی۔

مسٹر وویک کاٹجو نے کہا کہ ہائی جیکنگ کے معاملہ میں میں جسونت سنگھ کے ساتھ افغانستان (قندھار) گیا تھا۔ وہاں ہماری ملاقات افغانی نوجوانوں سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے آپ کو دیوبندی بتایا۔ ہم نے پوچھا کہ آپ لوگ برائے سیاحت ہندستان آنا پسند کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ پھر ہم نے پوچھا کہ آپ ہندوستان میں کون سی جگہیں دیکھنا چاہیں گے۔ انہوں نے سب سے پہلے دیوبند کا نام لیا۔ مسٹر وویک کاٹجو نے کہا کہ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ طالبان تحریک اور ہائی جیکنگ کا تعلق کیا دیوبند کے مدرسہ سے ہے۔

میں نے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں۔ ان لوگوں کا یہ کہنا کہ ہم دیوبندی ہیں، صرف فقہی معنی میں ہے، اور اس معنی میں میں بھی دیوبندی ہوں۔ اس کا کوئی تعلق طالبان کی سیاسی تحریک سے نہیں ہے۔ پھر میں نے کہا کہ افغانستان میں بڑے بڑے دینی مدرسے نہیں ہیں۔ چنانچہ آزادی سے پہلے افغانستان کے طلبہ دارالعلوم دیوبند میں آکر دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ آزادی کے بعد جب حالات بدل گئے تو دیوبند کے پڑھے ہوئے علما نے بلوچستان میں افغانستانی سرحد کے قریب بہت سے مدرسے قائم کیے۔ یہ مدرسے نصاب کے اعتبار سے دیوبندی پیٹرن پر تھے۔ اس لیے ان مدرسوں کو بھی دیوبندی مدرسہ کہا جانے لگا۔ دیوبندی مدرسہ کا مطلب حنفی فقہ کی تعلیم کا مدرسہ ہے جیسا کہ دیوبند کا یہ مدرسہ ہے۔ میں نے کھل کر وضاحت کی کہ افغانی طالبان کا سیاسی نظریہ پاکستان کے سیاسی لیڈروں کا بنا ہوا ہے، نہ کہ دیوبندی مدرسہ کا دیا ہوا۔ مسٹر وویک کاٹجو میری باتوں کو سن کر مطمئن ہوگئے اور دیوبند کے بارے میں ان کے شبہات ختم ہوگئے۔ (ڈائری، 6 مارچ 2000)

دینی درسگاہ

دلّی سے تقریباً سومیل کے فاصلہ پر ''زمینداروں'' کا ایک قصبہ ہے۔ پچھلے دنوں یہاں چند بار جانے کا اتفاق ہوا۔ قصبہ میں کوئی قابل ذکر اسلامی مدرسہ نہیں۔ یہاں مسلمانوں کے پاس بڑی بڑی زمین داریاں تھیں۔ وہ کئی سو برس تک اس تاریخی قصبہ کے اقتدار پر چھائے رہے۔ انھوں نے اپنی عظمت کے نشان کے لیے عالی شان حویلیاں اور چوپالیں بنائیں۔ مگر اپنے دین کی حفاظت وفروغ کے لیے وہ کوئی دینی درس گاہ اپنی بستی میں قائم نہ کر سکے۔

دینی درس گاہ کا لفظ موجودہ زمانہ میں کچھ بدنام سا ہو گیا ہے۔ حالاں کہ یہ دینی درس گاہیں ہر دور میں مسلمانوں کا دینی اور تہذیبی مرکز رہی ہیں۔ دورِنبوت میں ''صفہ'' اسی قسم کی ایک درس گاہ تھی جس سے وہ لوگ تربیت پا کر نکلے جنھوں نے سارے عالم میں علوم نبوت کی اشاعت کی۔ پھر یہی دینی درس گاہیں ہیں جہاں اسلامی دورِ حکومت کے وزرا و قضاۃ تیار ہوتے تھے۔ یہی دینی درس گاہیں ہیں جنھوں نے وہ علما مصنفین پیدا کیے جنھوں نے ہر دور میں اسلام کی فکری اور علمی نمائندگی کی۔

مئی 1973 میں قصبہ کے لوگوں نے باہم مشورہ سے ایک مدرسہ کا قیام منظور کیا تھا۔ جولائی 1975 میں دوبارہ ایک اجتماع میں طے کیا گیا کہ مقامی مکتب کو ترقی دے کر ایک بڑا دینی مدرسہ بنایا جائے۔ اس کے وسائل کی فراہمی کے لیے بھی مختلف لوگوں نے فیاضانہ پیش کشیں کیں۔

13 جولائی کی ایک نشست میں، جس میں بستی کے اکثر ممتاز افراد شریک تھے۔ مدرسہ کے لیے چھ افراد مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ متفقہ طور پر طے پایا کہ ہر شخص کے پاس جتنے کھیت یا باغ ہیں۔ ایک روپیہ فی بیگھ سالانہ کی شرح سے وہ مدرسہ کی امداد کرے گا۔

اس قسم کا فیصلہ کسی بستی میں ایک معیاری درسگاہ کو وجود میں لانے کے لیے کافی ہے۔ مگر آپ کو تعجب نہ ہونا چاہیے اگر میں آپ کو یہ خبر دوں کہ یہ فیصلہ اس عام انسانی کمزوری سے مستثنیٰ نہ رہ سکا جس کو کسی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے: لوگوں میں طاقت کی اتنی کمی نہیں جتنی مستقل ارادہ کی۔ (الرسالہ، فروری، 1977)

عقل کی آنکھ سے

خطیب بغدادی نے اپنی کتاب ”تاریخِ بغداد“ (جلد 16، صفحہ 362) میں قاضی ابو یوسف کے تذکرہ کے ذیل میں لکھا ہے۔ علی بن جور کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف نے مجھ کو بتایا۔ میرے باپ ابراہیم بن حبیب کا انتقال ہوگیا۔ میری ماں نے مجھے ایک دھوبی کے یہاں خدمت کے لیے رکھ دیا۔ میں اکثر دھوبی کو چھوڑ کر امام ابوحنیفہ کے حلقۂ درس میں چلا جاتا اور وہاں حدیث اور فقہ کا علم حاصل کرتا۔ میری ماں کو معلوم ہوتا تو وہ آتی اور میرا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ دھوبی کے یہاں پہنچا دیتی۔ جب ایسا قصہ بار بار ہونے لگا تو میری ماں پر شاق گزرا اس نے امام ابوحنیفہ سے کہا، اس لڑکے کا بگاڑ صرف تم ہو۔ یہ ایک یتیم لڑکا ہے۔ اس کے پاس کچھ نہیں۔ میں چرخہ کات کر اس کو کھلاتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ وہ بھی کچھ کمانے لگے۔ امام ابوحنیفہ نے میری ماں سے کہا: وہ پِستہ کا فالودہ کھانے والا علم حاصل کر رہا ہے۔ میری ماں یہ کہتی ہوئی واپس چلی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے تمہاری عقل جاتی رہی ہے۔

امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے میری مالی مدد کی اور میں ان کے حلقۂ درس سے برابر علم حاصل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میں اس قابل ہوگیا کہ عباسی حکومت نے مجھ کو قاضی کے عہدے پر مقرر کیا۔ اب میں خلیفہ ہارون رشید کی مجلس میں بیٹھنے لگا۔ میں اس کے دسترخوان پر کھانا کھاتا۔ ایک روز دسترخوان پر ہارون رشید کے لیے فالودہ آیا۔ ہارون رشید نے کہا اس کو کھاؤ۔ میں نے پوچھا: اے امیر المومنین یہ کیا چیز ہے۔ ہارون رشید نے کہا: یہ پستہ کا فالودہ ہے۔ یہ سن کر مجھ کو ہنسی آگئی۔ ہارون رشید نے پوچھا کہ تم کیوں ہنسے۔ پھر میں نے مذکورہ قصہ شروع سے آخر تک بتایا۔ ہارون رشید یہ سن کر اچنبھے میں پڑ گیا۔ اس نے کہا: میری زندگی کی قسم، علم آدمی کو بلند کرتا ہے اور دین اور دنیا میں اس کو نفع دیتا ہے (إِنَّ الْعِلْمَ لَيَرْفَعُ وَيَنْفَعُ دِينًا وَدُنْيَا)۔ اللہ ابوحنیفہ پر رحم کرے، وہ اپنی عقل کی آنکھ سے وہ چیز دیکھ لیتے تھے جس کو وہ اپنے

سر کی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے تھے (كانَ يَنْظُرُ بِعَينِ عَقْلِهِ ما لا يَراهُ بِعَينِ رَأْسِهِ)۔ انسان کے چہرے پر اللہ نے دو خوب صورت آنکھیں دی ہیں جن سے وہ تمام چیزوں کو دیکھتا ہے۔ مگر ان آنکھوں سے جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف ظاہری چیزیں ہیں۔ زیادہ گہری اور زیادہ بامعنی چیزیں دیکھنے کے لیے ایک اور آنکھ کی ضرورت ہے۔ یہ بصیرت یا عقل کی آنکھ ہے۔ جو شخص صرف سر کی آنکھ رکھتا ہو اس کا دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مشین کے اوپر کا ڈھکن دیکھے مگر اندر کے کل پرزوں سے بے خبر رہے، ایسا دیکھنا، نہ دیکھنے سے بس برائے نام ہی مختلف ہے۔ بڑھیا کی ظاہری آنکھ نوجوان کا مستقبل صرف دھوبی کے خدمت گار کی صورت میں دیکھتی تھی مگر اسی نوجوان کو جب ایک عقل کی آنکھ والے نے دیکھا تو وہ اس کو بادشاہ کے دستر خوان پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔

عقل کی آنکھ آدمی کو کس طرح حاصل ہوتی ہے، اس کا ایک ہی جواب ہے۔ یہ صلاحیت آدمی کے اندر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ سر کی آنکھ سے نظر آنے والی چیزوں سے اوپر اٹھ جائے۔ معنوی حقیقتیں ظاہری حقیقتوں سے پرے ہیں۔ اس لیے معنوی حقیقتوں کو وہی شخص پاتا ہے جو ظاہری حقیقتوں سے گزر جائے۔ سامنے کی چیزوں سے نظر ہٹانے کے بعد ہی دور کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح گہری باتوں کو آدمی اس وقت پاتا ہے جب کہ وہ اوپری باتوں سے بلند ہو جائے۔ چیزوں کے ظاہری روپ میں گم رہنے والا کبھی چیزوں کو ان کے اندرونی روپ میں نہیں دیکھ سکتا۔ (الرسالہ، اپریل 1980)

موت کے عقیدے نے زندگی دے دی

ایک نوجوان نے عربی مدرسے سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد ان کا ارادہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ اسی دوران گھر سے ایک خبر آئی جس نے ان کے حوصلے ختم کر دیے۔ خبر یہ تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کے گھر پر معمولی کھیتی باڑی تھی۔ اسی میں محنت کر کے ان کے والد صاحب گھر کا کام چلاتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد گھر پر

صرف ان کی بیوی تھیں اور چند چھوٹے بچے۔ اب مذکورہ نوجوان ہی گھر کے بڑے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کو اپنی ذمہ داری کا شدید احساس ہوا۔ والد صاحب کی وفات کا مطلب ان کے لیے صرف ایک تھا۔ یہ کہ وہ مزید تعلیم کا ارادہ ترک کر کے اپنے گھر چلے جائیں اور اپنے والد صاحب کی طرح کھیتی باڑی کے کام میں لگ کر گھر کا انتظام سنبھالیں۔

مدرسے میں ایک بزرگ سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ اس کے بعد وہ ان سے ملے اور کہا ”حضرت اب میں یہاں سے جا رہا ہوں اور آپ سے آخری ملاقات کے لیے آیا ہوں“۔ بزرگ نے کہا: آخر کیا بات ہے۔ کہاں جا رہے ہو۔ انہوں نے بتایا کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے اور میں ہی اپنے گھر میں سب سے بڑا ہوں۔ اس لیے اب مجھ ہی کو گھر کا انتظام سنبھالنا ہے۔ شاید قدرت کو یہی منظور ہے کہ میرے ہاتھوں میں ”قلم“ کے بجائے ”ہل“ ہو۔ بظاہر اب میرے لیے مزید تعلیم کا کوئی سوال نہیں۔ بزرگ یہ سن کر خاموش ہو گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولے: ” کیا موت آپ کے لیے نہیں ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ گھر پہنچ کر آپ کا انتقال نہیں ہو جائے گا۔ پھر اگر آپ کا بھی انتقال ہو گیا تو۔“ اس کے بعد بزرگ نے کہا کہ کسی گھر کا سنبھالنے والا کوئی بڑا نہیں ہوتا۔ ہر گھر کا سرپرست اور کفیل اللہ تعالیٰ ہے۔ کسی کے جینے مرنے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ اپنے تعلیمی منصوبے کو جاری رکھیے اور گھر کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیجیے۔ ” آپ تھوڑی دیر کے لیے سمجھ لیجیے کہ میرا بھی انتقال ہو گیا ہے“۔

یہ بات نوجوان کے دل کو لگ گئی۔ انہوں نے گھر کا خیال چھوڑ دیا اور اس کے معاملے کو اللہ کے حوالے کر کے اپنی تعلیمی جدوجہد شروع کر دی۔ انہوں نے مدینہ کے جامعہ اسلامیہ میں درخواست بھیجی اور اس کے لیے ضروری کوششیں کرنے لگے۔ کوشش کامیاب رہی اور ان کا داخلہ جامعہ اسلامیہ (مدینہ) میں ہو گیا۔ انہوں نے مدینہ کا سفر کر کے جامعہ اسلامیہ میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ وہاں سے فراغت کے بعد وہ سعودی عرب کے دار الافتاء کے تحت افریقہ کے ایک ملک میں مبلّغ اور استاد کی حیثیت سے بھیج دیے گئے۔ 11 اپریل 1980 کو ایک ملاقات

میں انہوں نے راقم الحروف کو بتایا کہ افریقہ میں رہتے ہوئے اُن کو دس سال ہو چکے ہیں۔ اور ان کی موجودہ زندگی سے وہ اور ان کے گھر والے دونوں مطمئن ہیں۔ وہ اپنے کو ایک کامیاب انسان سمجھتے ہیں اور یہ کامیابی ان کو اس مختصر سے جملہ سے ہوئی کہ — سمجھ لیجیے کہ آپ کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔

موت کا عقیدہ بظاہر منفی عقیدہ ہے۔ مگر وہ اپنے اندر زبردست مثبت اثرات رکھتا ہے۔ جس کو موت کا یقین ہو، زندگی کے بارے میں اس کا یقین بڑھ جاتا ہے۔ جو اپنے کو مرتا ہوا دیکھ لے وہ اپنی زندگی میں زیادہ باعمل ہو جاتا ہے۔ (الرسالہ، جون 1980)

تعصب کی حد

جار اللہ زمخشری (538-467ھ) ایک معتزلی عالم تھے۔ معتزلہ سے عام مسلمانوں کا اختلاف اتنا بڑھا کہ وہ ان کی کتابوں کے دشمن ہو گئے۔ فرقہ معتزلہ میں کثرت سے علما تھے اور انہوں نے بہت بڑی تعداد میں کتابیں لکھیں مگر ان کی تمام کتابیں جلا دی گئیں۔ اس میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ زمخشری کا ہے۔ زمخشری اگرچہ معروف معتزلی تھا۔ تاہم اس کی دو کتابیں المفصل (نحو) اور الکشاف (تفسیر قرآن) آج بھی موجود ہیں اور علمائے اہل سنت کے درمیان بدستور مقبول ہیں، اور علمی مرجع کے طور پر کام دیتی ہیں۔

اسی طرح ابن منظور (711-630ھ) ایک شیعہ تھا۔ شیعی گروہ اور اہل سنت کے درمیان ایک ہزار سال سے زبردست اختلافات موجود ہیں۔ آج تک ان میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ شیعہ علما کی کتابیں صرف شیعہ فرقہ کے درمیان رائج ہیں۔ سنی علما ان کو دیکھتے ہیں تو تردید کے لیے، نہ کہ استفادہ کے لیے۔ مگر یہاں بھی بعض استثنا ہیں۔ مثلاً ابن منظور کی کتاب لسان العرب (لغت) کو اہل سنت کے علما کے درمیان خصوصی مقام حاصل ہے اور اہل علم عام طور پر اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

زمخشری کا اعتزال اور ابن منظور کی شیعیت ان کی کتابوں کو علمائے اہل سنت کے درمیان مقبول بنانے میں حارج نہ ہوسکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایسی کتابیں لکھی جن کے مثل اس موضوع پر کوئی دوسری کتاب موجود نہ تھی۔ ان کی مقبولیت ان کے امتیازی عمل کی قیمت ہے۔ بعض آدمی کا کام اتنا بلند ہوجاتا ہے کہ اعتقادی اختلافات ان کو قبول کرنے میں حارج نہیں ہوتے۔

زندگی کے معاملات کو سمجھنے کے لیے جن لوگوں کو صرف "تعصب" کا لفظ معلوم ہے انہیں ایک اور حقیقت کی خبر نہیں۔ وہ یہ کہ تعصب کے عمل کی بھی ایک حد ہے۔ ایک حد کے بعد تعصب غیر مؤثر ہوجاتا ہے، یہ حد ہے "امتیاز"۔

اگر آپ اپنی کارکردگی کو عام معیار سے بڑھا کر امتیاز کے درجہ میں پہنچادیں تو تعصب کی دیواریں اپنے آپ گرجاتی ہیں۔ اس کے بعد آپ کا دشمن بھی آپ کا اتنا ہی قدرداں بن جاتا ہے جتنا آپ کا دوست۔ (الرسالہ، ستمبر 1983)

علم کا حصول

عربی کا ایک مقولہ ہے: الْعِلْمُ لَا يُعْطِيكَ بَعْضَهُ حَتَّى تُعْطِيَهُ كُلَّكَ (علم تم کو اس وقت تک اپنا جزء نہیں دیتا جب تک تم اس کو اپنا کل نہ دے دو)۔ یہ مقولہ نہایت صحیح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم کے حصول کے لیے یکسوئی اور ارتکاز لازمی طور پر ضروری ہیں۔ کامل ذہنی یکسوئی کے ساتھ جب کوئی شخص لمبی مدت تک محنت کرتا ہے، اس کو علم کا کوئی حصہ ملتا ہے۔ تاہم یہ حصہ بھی صرف جزئی ہوتا ہے۔ انسان کی محدود عمر کے مقابلہ میں علم کا دائرہ اتنا زیادہ وسیع ہے کہ کوئی شخص اپنی ساری زندگی لگا دینے کے بعد بھی علم کے صرف ایک جزء تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ علم کے کل تک پہنچنا موجودہ دنیا میں کسی بھی شخص کے لیے ممکن نہیں۔

(ڈائری، 14 جون 1997)

شبلی اور علی گڑھ

مولانا شبلی نعمانی (1857-1914) کا تعلق علی گڑھ سے 1883ء میں قائم ہوا۔ اور سولہ برس تک جاری رہا۔ شبلی کا تعلق جس خاندان سے تھا، وہ سر سید کی تعلیمی تحریک سے بہت متاثر تھا۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب اس کے زبردست حامی تھے۔ اور اپنے لڑکے مہدی حسن صاحب کو حافظ بنانے کے بعد مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ کالج میں داخل کرایا تھا۔

1883ء میں کالج کو مشرقی زبانوں کے ایک معلم کی ضرورت ہوئی۔ مولانا شبلی نے اس جگہ کے لیے درخواست بھیجی جو سر سید اور مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کی اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ مولانا کو ایف اے اور بی اے کی کلاسوں کو عربی اور فارسی پڑھانے کا کام سپرد ہوا۔ مولانا کا تقرر اس وقت چالیس روپے ماہوار پر ہوا تھا۔ شروع زمانہ کا واقعہ ہے، کالج میں کوئی تقریب تھی جس میں استادوں کی کرسیاں تنخواہ کی ترتیب سے بچھائی گئی تھیں۔ اس ترتیب میں مولانا شبلی کی کرسی سب سے پیچھے تھی۔ اپنی یہ حالت دیکھ کر مولانا شبلی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر صلاحیت ایسی چیز ہے جو اپنے آپ کو منوا کر رہتی ہے۔ چنانچہ جلد ہی بعد ایسا ہوا کہ نہ صرف ان کی تنخواہ بڑھ گئی، بلکہ اپنے علم و فضل کی بدولت انہوں نے کالج کی بزم میں صدر نشینی کی حیثیت حاصل کر لی۔

سب سے پہلے تو ان کی وہ مرعوبیت ختم ہوئی، جو اس زمانے میں ایک مولوی کو عام طور پر انگریزی دانوں سے ہوتی تھی۔ علی گڑھ جانے کے چند ہی مہینے بعد ایک عزیز کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

یہاں آ کر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔

ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت (اس زمانے میں بی، اے بڑی چیز تھی) یہ خیال دلاتے تھے کہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے۔ لاحول ولا......وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے۔ (حیات شبلی، 1943، صفحہ 131)

اس کے بعد کالج کی دنیا میں شبلی کو جو مقام ملا، اس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"محمڈن کالج علی گڑھ اپنے طرز کا پہلا کالج تھا جس میں انگریز، ہندو، مسلمان، ہر قسم کے استاد اور شاگرد تھے۔ ایسے ماحول میں ایک پرانا بوریا نشیں عالم جس نے کبھی انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا، جس نے انگریزوں کی صحبت کبھی نہیں اٹھائی تھی، جو نئے تہذیب و تمدن کے سایہ میں کبھی نہیں بیٹھا تھا، یکا یک آیا اور اس پورے ماحول میں رہ کر اس طرح سب میں سما گیا کہ وہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہونے پایا— مولانا شبلی کا حال یہ تھا کہ وہ ہر محفل پر چھائے رہتے تھے اور ہر علمی بحث میں ان کا قول فیصل تھا۔ انہوں نے نہ صرف اپنی بلکہ علمائے اسلام کی قدر و منزلت کو بڑھا دیا اور قدیم علوم و فنون کے مرتبہ کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز پروفیسروں کو ان کی تحسین بلکہ تحصیل پر مجبور کر دیا۔ ایسے زمانہ میں جب کہ کالج میں ہر طرف سے نئے علوم نئے مسائل، اور نئی تحقیقات کی بارش ہو رہی تھی، ایک مولانا ہی کا وجود تھا جو اس مسلسل بارش کے طوفان میں اسلامی علم و فن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمائے ہوئے تھا کہ ان کو اس طوفان خیز سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا"۔ (حیات شبلی، صفحہ 148)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی نے علی گڑھ میں قیام کر کے ایک عظیم سبق دیا ہے۔ یہ سبق کہ عزت اور مقام حاصل کرنے کا راز صرف تنخواہ اور ڈگریاں نہیں ہیں۔ ایک خالص مولوی آدمی بھی ایک بالکل ماڈرن ماحول میں عزت اور مقام حاصل کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ علم اور قابلیت رکھتا ہو۔

شبلی کو علی گڑھ میں یہ مقام ان کی گوناگوں صلاحیتوں کی بدولت حاصل ہوا۔ اس دور میں

خیالات کو شعر کے پیراہن میں ظاہر کرنے کا خاص ذوق تھا۔ مولانا شبلی اس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ نہایت اعلیٰ مذاق کے اشعار لکھتے تھے اور نہایت موثر لہجے میں پڑھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ کالج کے ہر جلسہ اور تقریب میں مولانا کی نظم اس کے پروگرام کا ضروری جزء ہوتی تھی۔ اس وقت کے علی گڑھ میں شبلی کو شاعر کی حیثیت سے جو مقام حاصل تھا اس کا نقشہ ان کے دو شعروں میں بڑی اچھی طرح نظر آتا ہے۔ پچھلی صدی کے آخر میں مولانا شبلی نے روم اور مصر و شام کا سفر کیا تھا۔ واپس آئے تو علی گڑھ میں بڑا شاندار استقبال ہوا۔ اس سلسلہ میں طلبا کی یونین نے بھی 6 دسمبر 1892ء کو ایک بزم دعوت ترتیب دی۔ اس موقع پر مولانا نے اپنا ایک قصیدہ پڑھا جس کے دو شعر حسب ذیل تھے:

قاصد خوش خبر امروز نوا ساز آمد — کز سفر یار سفر کردۂ ما باز آمد

از سفر شبلی آزادہ بہ کالج برسید — یا مگر بلبل شیراز بہ شیراز آمد

اس زمانہ میں علی گڑھ کی تاریخ دیکھیے تو یہ الفاظ بالکل ایک واقعہ کا بیان معلوم ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کے علی گڑھ کو اگر شیراز سے تشبیہ دی جائے تو شبلی اس شیراز کے بلبل تھے۔

اسی طرح تقریر کا ملکہ بھی مولانا شبلی میں غیر معمولی تھا۔ جس جلسہ میں تقریر کرتے پورے مجمع پر چھا جاتے۔ 1900ء میں رام پور میں ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ تھا۔ اس زمانہ میں کلکتہ یونیورسٹی نے فارسی کو اپنے نصاب سے خارج کرنے کا اعلان کر کے ایک نیا سوال کھڑا کر دیا تھا۔ فارسی پر یہ اعتراض تھا کہ "فارسی کلاسیکل زبان نہیں اور دوسری زبانوں کی طرح اس میں قوت متخیلہ کو ترتیب دینے کی قابلیت نہیں اور نہ اس کے لٹریچر میں علوم وفنون کا ذخیرہ ہے"۔ (حیات شبلی، صفحہ 166) مولانا شبلی نے اس پر تقریر کی اور اس خوبی سے اعتراضات کو ردّ کیا کہ لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔ سامعین کا یہ حال تھا کہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس وقت بنگال کے لفٹننٹ گورنر سر ایڈورڈ برن بھی اجلاس میں موجود تھے۔ انہوں نے اپنی

انگریزی تقریر میں مولانا کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا — "مجھ میں اتنی قابلیت نہیں کہ مولانا شبلی کی طرح پُرتاثیر تقریر کر سکوں"۔ (حیات شبلی، صفحہ 167)

نومبر 1894 میں یونین میں اس موضوع پر مباحثہ تھا کہ کیا ہمارا گذشتہ طرز تعلیم موجودہ طرز تعلیم سے بہتر تھا۔ مولانا نے بھی تقریر کی۔ انہوں نے موافقت کا پہلو اختیار کیا۔ یہ تقریر اتنی موثر ہوئی کہ طالب علموں نے عموماً مقرر کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ سید محمود نے بھی ان کے حق میں رائے دی۔ (حیات شبلی، صفحہ 160)

اسی طرح ایک بار یونین میں یہ بحث تھی کہ جمہوری طرز حکومت بہتر ہے یا شخصی۔ جلسہ میں سرسید بھی موجود تھے۔ مولانا نے جمہوری طرز حکومت کی تائید کی اور اس موضوع پر ایسی مدلل تقریر کی کہ تمام طالب علموں نے ان کی موافقت میں رائے دی (حیات شبلی، صفحہ 161)۔ یہ بات آج کچھ عجیب نہیں معلوم ہوگی لیکن اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ واقعہ 1892ء میں پیش آیا تھا تو مولانا کی تقریری صلاحیت کی داد دینی پڑتی ہے۔ مولانا شبلی کی یہی سب خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے وہ علی گڑھ کی فضا پر چھا گئے۔

شبلی کا علی گڑھ جانا محض ایک معمولی واقعہ نہ تھا۔ بلکہ یہ جدید وقدیم کا اتصال تھا۔ شبلی گویا قدیم کے ایک قابل اعتماد نمائندے تھے اور علی گڑھ اپنے وقت میں جدید کی نمایاں ترین علامت تھا۔ اس اتحاد واتصال سے دونوں کو زبردست فائدے ہوئے۔

شبلی کا علی گڑھ سے وابستہ ہونا سرسید کے لیے زبردست تقویت کا باعث بنا۔ سرسید نے کالج کے چندہ کے لیے 1882 میں حیدرآباد کا پہلا سفر کیا تھا۔ یہ سفر ایک وفد کی شکل میں تھا جس میں تحریک کے بہت سے ممتاز لوگ شریک تھے۔ ان میں سے ایک مولانا شبلی بھی تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی کے اس سفر میں شمولیت سے یہ خیال لوگوں میں پھیل گیا تھا کہ وہ سرسید کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ (حیات شبلی، صفحہ 183)

شبلی کی وجہ سے کالج کے حلقہ میں اعلیٰ ترین سطح پر علوم اسلامیہ کی نمائندگی ممکن

ہوسکی۔ 1887ء میں لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ اس موقع پر سرسید نے اپنے دائرہ کے مختلف اہل علم کو اسلامی تعلیم کے کسی نہ کسی پہلو پر لکھنے کی فرمائش کی۔ مولانا شبلی نے ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' کا عنوان اپنے لیے پسند کیا۔ جب یہ مضمون لکھنؤ کے اجلاس میں پڑھا گیا تو مسلمانوں کے سامنے اپنے اسلاف کے عظیم کارناموں کا نقشہ پھر گیا اور سارے ملک میں اس خطبہ کی دھوم مچ گئی۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں— ''لکچر مسلمانوں کی نظر میں بالکل نئی اور دلچسپ چیز تھا۔ چنانچہ جب اس پر دلگداز انداز میں ریویو ہوا ہے تو کوئی نہ تھا جو اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہو گیا ہو''۔ (حیات شبلی، صفحہ 172)

اس زمانہ میں یورپ کی اس ''علمی تحقیق'' کا غلغلہ تھا کہ مسلمان اتنے وحشی اور جاہل تھے کہ جب حضرت عمر کے زمانے میں انہوں نے مصر اور اسکندریہ فتح کیا تو وہاں کے مشہور یونانی کتب خانہ کو جو بطلیموس کے زمانہ سے قائم تھا جلا کر خاک کر دیا۔ اور دنیا گذشتہ انسانی دماغوں کے ورثہ سے محروم ہوگئی۔

یہ منجملہ ان واقعات میں سے تھا جس کی وجہ سے مسلمان اپنے کو احساس کمتری میں مبتلا پاتے تھے۔ مولانا شبلی نے 1892 میں اس کی تردید میں کتب خانہ اسکندریہ پر ایک مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ یہ مسلمانوں سے صدیوں پہلے برباد ہو چکا تھا۔ اور مسلمانوں کی فتح مصر کے زمانہ میں اس کا وجود بھی نہ تھا۔

مولانا نے بتایا کہ یہ کتب خانہ خود عیسائیوں نے اپنے زمانہ میں برباد کیا تھا۔ بعد کو چھٹی صدی ہجری کے ایک عیسائی مورخ ابوالفرح ملطی نے عیسائیوں کو اس الزام سے بچانے کے لیے اس واقعہ کو غلط طور پر مسلمانوں کی طرف منسوب کر دیا مولانا کی یہ تحقیق مقبول ہوئی اور بعد کو خود یورپین محققین نے اس کی تائید کی۔ (حیات شبلی، صفحہ 220)

اسی طرح مثال کے طور پر مسلم سلطنتوں کے خلاف ایک نفرت انگیز پروپیگنڈا وہ تھا جو جزیہ کے نام پر کیا جا رہا تھا۔ یعنی وہ محصول جو مسلمان بادشاہ صرف اپنی غیر مسلم رعایا سے وصول

کرتے تھے۔ اس کو مخالفین اس بات کے ثبوت میں پیش کرتے تھے کہ اسلامی سلطنتوں میں غیر مذہب پر ٹیکس تھا۔ گویا کوئی غیر مسلم اس مذہبی ٹیکس کی ادائیگی کے بغیر کسی اسلامی سلطنت میں اپنی جان و مال کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ مولانا شبلی نے اس سلسلہ میں رسالہ الجزیہ لکھا جس میں تحقیق سے ثابت کیا کہ جزیہ قتل کا نہیں بلکہ نصرت کا معاوضہ ہے۔ یعنی اسلامی ملکوں میں ان غیر مسلموں سے جو فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے، اس لیے یہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا کہ وہ ان کی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا معاوضہ تھا۔

یہ تحقیق اس وقت ایسی عجیب تھی کہ علمی دنیا پر حیرت چھا گئی۔ سرسید نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا اور خود مولانا سے اس کا عربی میں ترجمہ کرایا گیا۔ بیرونی ملکوں میں بھی اس کے خلاصے اور اقتباسات شائع ہوئے۔ (حیات شبلی، صفحہ 227)

مولانا شبلی کی اس طرح کی تحقیقات سے علی گڑھ میں اسلام کی علمی بلندی کی ایسی فضا قائم ہوئی کہ سرسید کو خیال آیا کہ یورپ نے اسلام اور مسلمانوں کی نسبت جو تاریخی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان کے جواب اور تصحیح کے لیے ایک مجلس بنائی جائے۔ چنانچہ 1892 میں اس کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ مولانا شبلی کے مضامین اس سلسلہ میں داخل کیے گئے اور انھیں اس صیغہ کا سکریٹری بنایا گیا۔ ان کے مضامین کے ترجمے عربی اور انگریزی میں بھی شائع کیے گئے۔ (حیات شبلی، صفحہ 161)

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پانچواں اجلاس 1891ء میں الہ آباد میں ہوا اس اجلاس میں بڑے بڑے باکمال جمع تھے۔ مولانا شبلی نے تجویز پیش کی:

> ”اس مضمون پر ایک رسالہ لکھوایا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں جو علم یونان و مصر و ہندستان و فارس سے حاصل کیے تھے ان پر کون سے مسائل اور علوم اضافہ کیے“۔

سرسید نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا: ”یہ ایسے عمدہ امر کی تحریک ہے جس کی بہت

ضرورت ہے۔تمام علمی مجلسیں اس امر کے دریافت کرنے کی محتاج ہیں۔مگر بحث اس میں ہے کہ اس کو لکھے گا کون"۔ ہمارے ہاں ایک مثل ہے "جو بولے وہی گھی کو جادے" پس مولوی شبلی ہی اس کو لکھیں گے۔

"تمام مجمع سے بالاتفاق یہی آواز آئی کہ مولوی شبلی ہی لکھیں گے۔مولوی شبلی ہی لکھیں گے"(روداد کانفرنس الہ آباد 91 بحوالہ حیات شبلی،صفحہ 165)

"محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین" نے 1894ء میں ایک علمی رسالہ کی شکل اختیار کی تو اس کے اردو حصے کی ایڈیٹری مولانا شبلی کے سپرد کی گئی۔

بحیثیت استاد مولانا کے سپرد جو مضامین تھے ان میں بھی مولانا نے اپنی قابلیت کا سکہ جما دیا تھا۔مسعود علی صاحب محوی جو حیدر آباد دکن میں جج تھے،اور اس کے بعد دارالترجمہ کے رکن مقرر ہوئے۔مولانا کے زمانہ میں علی گڑھ کے طالب علم تھے۔وہ اپنے مجموعہ کلام کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:"علی گڑھ کالج کے بی اے کلاس کے فارسی نصاب میں قاآنی شیرازی (1808-1854) کے چند قصائد داخل تھے۔مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے۔مولانا مرحوم ان نادر الوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دینے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دل چسپی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے تھے۔(حیات شبلی،صفحہ 182)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی فرماتے ہیں:"مجھ کو بھی اگر کچھ لکھنا آیا تو انھیں صحبتوں کے اثر سے تاریخ وادب فارسی کا ذوق یہیں نشونما پذیر ہوا ہے"۔(حیات شبلی،صفحہ 152)

مقررہ درس کے علاوہ بھی طلبہ کے لیے کچھ کرتے رہتے تھے۔مثلاً کالج میں عربی زبان کی ترقی اور طلبہ میں عربی تحریر وتقریر کا شوق دلانے کے لیے انہوں نے ایک لجنۃ الادب کی بنیاد ڈالی۔اسی طرح اخوان الصفا کے نام سے ایک انجمن قائم کی جو اردو تحریر وتقریر کی مشق کے لیے تھی۔دونوں انجمنوں میں طلبہ دل چسپی سے حصہ لیتے تھے۔(حیات شبلی،صفحہ 60-159)

1892 میں مولانا شبلی نے ترکی اور مصر وشام کا ایک علمی سفر کیا۔یہ سفر بھی علی گڑھ کالج کی

شان بڑھانے کا سبب بنا۔ کیوں کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی اس وقت۔۔۔ ''کالج کے ایک پروفیسر کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا سفر تھا''۔ (حیات شبلی، صفحہ 218) چنانچہ واپسی کے بعد مولانا کے اعزاز میں مختلف تقریبات اور جلسے کیے گئے۔

اس سفر میں حکومت ترکی نے آپ کو ''تمغہ مجیدی'' عطا کیا جو ترکی کا ایک اعلیٰ اعزاز تھا۔ اس کے بعد جنوری 1894ء میں حکومت برطانیہ نے آپ کو شمس العلما کا خطاب عنایت کیا۔ یہ اس زمانہ کے لحاظ سے ایک خاص واقعہ تھا۔ نیز یہ پہلا واقعہ تھا جب کہ کالج کے کسی استاد کو علمی خطاب سے نوازا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد کالج میں متعدد جلسے ہوئے اور سرسید اور تمام لوگوں نے زبردست خراج عقیدت مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ (حیات شبلی، صفحہ 238)

مولانا شبلی کی وجہ سے کالج کو جو علمی وقار اور مادی فائدہ حاصل ہوا، اس کا اعتراف سرسید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے۔ المامون، سیرۃ النعمان، کتب خانہ اسکندریہ اور الجزیہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں۔ اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہیں کہ فاتوا بسورۃ من مثلہ تو کچھ تعجب نہ ہوگا۔ جزیہ کا ایسا بیجا اور غلط الزام اسلام پر تھا جس کا آج تک کسی نے ایسی عمدگی سے جواب نہیں دیا تھا۔ بایں ہمہ انہوں نے مثل علمائے متقدمین باخدا کوئی ذاتی فائدہ ان کتابوں کی تصنیف سے نہیں اٹھانا چاہا بلکہ بالکلیہ مدرستہ العلوم کو دیدیا''۔ (حیات شبلی، صفحہ 34-233)

اس زمانہ میں مولانا شبلی کی کتابوں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ تین تین ماہ میں ایک ایڈیشن ختم ہوجاتا تھا۔ مگر مولانا نے علی گڑھ کے زمانہ قیام میں اپنی تصنیفات سے کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا اور تمام کتابیں کالج کی نذر کردیں (حیات شبلی، صفحہ 59-158)

اس کے علاوہ بعض ریاستوں سے کالج کو امداد ملنے میں مولانا کی ذات معاون بنی۔

علی گڑھ کی تاریخ میں دینی رنگ پیدا کرنے والے سب سے پہلے مولانا شبلی تھے۔ مولانا شبلی دینی اعتبار سے علی گڑھ کو کیا سبق دینا چاہتے تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا۔ 1892 میں جب وہ ترکی گئے تو وہاں انہیں ایک کالج (مکتبہ ملکیہ) میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اتفاق سے اسی دوران ظہر کا وقت آ گیا۔ اس وقت کوٹ پتلون میں ملبوس نوجوان ترک فوراً نماز کی تیاری میں لگ گئے۔ اس واقعہ کا والہانہ انداز میں ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر مذہبی اثر سے آزاد ہو کر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزل ہزار درجہ بہتر ہے"۔ (حیات شبلی، صفحہ 202)

اسی طرح مولانا نے ایک تقریر میں فرمایا:

"دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں آگے بڑھتے جائیں لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹیں، پیچھے ہٹیں۔ یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جا کر مل جائیں"۔ (حیات شبلی، صفحہ 290)

محمد علی کے اندر اسلام اور قرآن کا ذوق مولانا شبلی کے درسوں سے پیدا ہوا۔ محمد علی اس وقت علی گڑھ کے ایک طالب علم تھے اور اس کا اعتراف انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح My Life: A Fragment میں کیا ہے۔ یہ مولانا شبلی کی بیدار مغزی کا اہم ثبوت ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ مذہبی طبقہ عام طور پر انگریزی تعلیم کی صرف مخالفت کرنا جانتا تھا۔ انہوں نے اس واقعہ کو محسوس کیا کہ اصل کام لوگوں کو انگریزی تعلیم سے روکنا نہیں، بلکہ ان کے اندر اسلامی ذہن پیدا کرنا ہے۔ تاکہ وہ جدید تعلیم کو صحیح طور پر اپنے اندر جذب کر سکیں اس سلسلہ میں انہوں نے علی گڑھ کے سولہ سالہ قیام میں جو کوششیں کیں ان میں سے ایک درس قرآن کا اہتمام بھی تھا۔ جس نے مسٹر محمد علی کو مولانا محمد علی بنایا۔ سجاد حیدر یلدرم کہا کرتے تھے کہ مولانا ایسے اچھوتے انداز سے قرآن پاک کا درس دیتے تھے کہ ہم اس کو سُن کر وجد کرتے تھے۔

طلبہ میں سنت نبوی کا ذوق پیدا کرنے کے لیے عربی سیرت کا ایک مختصر رسالہ بدء الاسلام

لکھا، جو کالج کے نصاب تعلیم میں داخل ہوا۔ میلاد کی مجالس کو وعظ و تبلیغ کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔

مولانا شبلی اس طرح مختلف سطحوں پر طلبہ میں دینی رنگ پیدا کرنے کی جو مسلسل کوشش کر رہے تھے اس نے کیا نتیجہ دکھایا۔ اس کو خود مولانا کی زبان سے سنیے۔ ایک عزیز کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> "اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھیے، نہ کوئی اور واقعہ۔ آپ سنیے اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں، یوں تو مدرستہ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں۔ مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے۔ لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے جس کو وہ لجنۃ الصلوٰۃ کہتے ہیں۔ ایک بی اے سکریٹری ہے۔ اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں۔ چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خواں لوگوں کو اس پر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے۔ الصلوٰۃ خیر من النوم پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت ہوتی ہیں۔ اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش ہے۔ بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں، مغرب کی نماز، سبحان اللہ! کیا شان وشوکت سے ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا جاتا ہے۔ خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں اور چوں کہ وہ عامل بالحدیث ہیں، آمین زور سے کہتے ہیں۔ ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے۔ میں کبھی کبھی اسلام پر لکچر دیتا ہوں۔ مسجد بننے کی تیاری ہے۔ سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اس کے پیمانۂ تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے... سید محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاوڑا لیں گے اور مسجد کی نیو کھودیں گے... مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا"۔ (حیات شبلی، صفحہ 150)

کالج کے لیے ایک یونیفارم کا تصور سب سے پہلے مولانا شبلی ہی نے دیا تھا۔قسطنطنیہ کے سفر سے اپنے والد ماجد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو بہت پسند آئی۔ ہر کالج کا ایک خاص لباس ہے اور کوٹ پر گریبان کے قریب کالج کا نام لکھا ہوتا ہے۔ ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا۔ سید صاحب قبلہ بغیر کسی پس و پیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا ہے"۔

مولانا حالی کے بیان کے مطابق سرسید نے اس تجویز کو پسند کیا اور اسی کے مطابق کالج میں یونیفام کا طریقہ رائج ہوا۔

اسی طرح قسطنطنیہ کے مسافر نے طلبہ میں معاشرت کی یکسانی پر زور دیا۔سفر نامہ میں لکھتے ہیں:

"ہر کالج میں غریب طالب علموں کی متعدد تعداد ہے اور دولت مند ترکوں کی طرف سے ان کو اس قدر امداد دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے تمام مصارف ادا کر سکتے ہیں۔ اس کا یہ اثر ہے کہ کالج کے احاطہ میں جا کر کوئی شخص تمیز نہیں کر سکتا کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے۔ طلبہ کی یکساں حالت ان میں اتحاد اور قومیت کا نہایت قوی خیال پیدا کرتی ہے۔ اور غرباء کو اعلیٰ درجہ کی معاشرت حاصل ہونا ان میں حوصلہ مندی اور بلند نظری پیدا کرتا ہے۔ بورڈنگ کا یہ طریقہ دیکھ کر مجھ کو اپنا مدرستہ العلوم یاد آتا تھا اور میں اس کے بورڈنگ کے اختلاف مراتب پر افسوس کرتا تھا... میں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس، وضع، خوراک، مکان، فرنیچر کلیتہً ایک کر دیا جائے اور جو مختلف سطحیں آج کالج میں قائم ہیں، بالکل مٹادی جائیں۔ اگر یہ نہیں تو کالج میں قومیت کی روح نہیں"۔(صفحہ 202)

جس طرح شبلی نے علی گڑھ کو بہت کچھ دیا، اسی طرح خود شبلی کو بھی علی گڑھ سے بہت کچھ ملا۔ اور انصاف کا تقاضا ہے کہ اس کا اعتراف کیا جائے۔

مولانا شبلی ایک خالصۃً قدیم طرز کے عالم تھے۔ چنانچہ تعلیم کے بعد ابتدائی زمانہ میں اس قسم کے مشاغل میں دل چسپی لینا شروع کیا جو اس زمانہ میں ان کے جیسے لوگوں کا عام مذاق تھا۔ مثلاً خاص طرح کی منطقی بحثیں اور مناظرہ وغیرہ۔ مولانا کی کتاب اسکات المعتدی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ معاشی مسائل بھی مختلف سمتوں میں کھینچتے رہے۔ کبھی وکالت کا امتحان دیا، کبھی ملازمت کی، کبھی نیل کی تجارت اور زمینداری کا کام دیکھا۔ (حیات شبلی، صفحہ 96)

علی گڑھ سے تعلق نے ایک طرف مولانا کو موقع دیا کہ وہ معاش کے لیے سوچنا چھوڑ دیں۔ دوسری طرف یہاں کے ماحول نے انھیں وقت کی علمی ضروریات کا احساس دلایا اور ان کی صلاحیتوں کو زیادہ بہتر کام کی طرف موڑ دیا۔

مولانا شبلی نے جس زمانہ میں علی گڑھ میں قدم رکھا، یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ مسلمانوں کے اوپر سیاسی غلبہ حاصل کر چکا تھا۔ اس غلبہ کو مزید ذہنی تقویت پہنچانے کے لیے یورپ کے اہل قلم یہ طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے کہ وہ مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے علوم کو بگاڑ کر مسلمانوں کے سامنے پیش کریں۔ مسلمان اب تک اپنی تاریخ پر ناز کرتے چلے آرہے تھے۔ اس کے جواب کے لیے مغربی مصنفین نے یہ کیا کہ اسلام، سلاطین اسلام اور علوم اسلامیہ کی طرح طرح کی برائیاں لکھ کر پھیلانا شروع کر دیں۔ تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل خود اپنی قوم سے نفرت کرنے لگے اور ان کے قومی غرور کو ایسا صدمہ پہنچے کہ ان کے دماغی قویٰ ہمیشہ کے لیے مضمحل ہو جائیں۔

علی گڑھ کی فضا میں مولانا شبلی کو وقت کے اس فتنہ کا احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مضامین اور کتابوں نیز گفتگوؤں اور تقریروں میں ایسی اعلیٰ علمی سطح پر اس کا ردّ پیش کیا کہ مستشرقین کا پھیلایا ہوا کنفیوزن دور ہو گیا۔ ان کا یہ جذبہ یہاں تک بڑھا کہ قدیم کتب اسلامیہ سے استفادہ کے لیے انہوں نے اسلامی ممالک کے سفر کیے تاکہ وہ کتابیں جو ابھی تک چھپ

نہیں سکی تھیں۔ ان کے قلمی نسخوں کو دیکھ کر اپنی تصنیفات کے لیے مواد حاصل کریں۔ حالانکہ یہ بھی زمانہ کی نیرنگی ہے کہ جن نادر کتابوں کی خاطر مولانا نے سفر کی محنت اٹھائی تھی وہ بعد کو انہیں کے زمانہ میں خود مخالفین کے ہاتھوں چھپ کر عام ہوگئیں، اور اب ان کی پسندیدہ کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو چھپ نہ چکی ہو۔

مولانا شبلی نے جو تحریری کام کیا ہے، اس کا مشترک خصوصی موضوع غالباً ان لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے — اسلامی تاریخ کی عظمت کو نمایاں کرنا۔ اسلامی مسائل کو علمی سطح پر مدلل کرنا، اسلام کی عظمت رفتہ کو یاد دلا کر مستقبل کا حوصلہ پیدا کرنا۔ اور یہ وہی چیزیں ہیں جن کا احساس انہیں علی گڑھ کے ماحول میں ہوا۔ کیونکہ وہیں یہ صدائیں زیادہ گونج رہی تھیں۔

علی گڑھ کے قیام سے شبلی کو دوسرا اہم فائدہ یہ ملا کہ انھیں جدید تعلیم کی اہمیت کا احساس ہوا۔ مولانا شبلی نے ایک تقریر میں اپنا یہ واقعہ بیان کیا۔

"جب میں ترکی سے واپس آیا تو اتفاق سے گھر میں علالت تھی۔ ایک رات کو 12 بجے تار آیا۔ میں نے اس کو کھولا۔ دل میں دبدھا پیدا ہوا کہ کیا واقعہ ہے۔ خدا جانے کیسا تار ہے۔ خیر میں دوڑا ہوا سر سید مرحوم کے نواسہ کے پاس گیا۔ انہوں نے پڑھ کر سنایا کہ یہ تار نواب علی حسن خاں صاحب نے بھوپال سے بھیجا ہے۔ وہ آپ کو ترکی سے بخیریت واپس آنے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ یہ حال ہم مولویوں کا ہے"۔ (حیات شبلی، صفحہ 135)

علی گڑھ میں مولانا کو اندازہ ہوا کہ اسلام پر انگریزی زبان میں جو کتابیں آرہی ہیں وہ نہایت غلط ہیں۔ اس سے انھیں خیال ہوا کہ علمائے دین کو انگریزی اور دوسری یورپین زبانیں جاننی چاہئیں۔ تاکہ وہ مغربی زبانوں میں اسلام کا صحیح لٹریچر فراہم کرسکیں۔ اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک بار ان سے عرض کیا کہ عربی کے ہر طالب علم کے لیے آپ انگریزی پڑھنا کیوں ضروری قرار دیتے ہیں۔ مثلاً جو لوگ فقیہ بننا چاہتے ہیں ان کو انگریزی کیا کام دے گی۔ فرمایا — "عجیب بات کہتے ہو۔ اگر آج ہمارے فقہا انگریزی جانتے اور ہماری فقہ کو

انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کیے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے"۔ (حیات شبلی، صفحہ 135) مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں غالباً مولانا شبلی کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ اگر وہ انگریزی جانتے ہوتے تو کیا کچھ اسلام کی خدمت کر سکتے تھے۔ اس لیے من نکردم شما حذر بکنید کے اصول پر وہ چاہتے تھے کہ اب علما ایسے ہوں جو دینی علم کے ساتھ وقت کی زبان بھی جانتے ہوں تا کہ وقت کے ذہنوں پر اسلام کا سکہ بٹھایا جا سکے۔

علی گڑھ میں عمومی طور پر مولانا شبلی کو جو کچھ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس میں ایک چیز خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ یہ شبلی اور آرنلڈ کے تعلقات ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ ایک نہایت لائق انگریز عالم تھے۔ دونوں کے علمی ذوق نے ایک دوسرے کو بے حد قریب کر دیا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی لکھتے ہیں:

"بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی کی یہ تھی کہ اس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا علم دوست استاد کالج میں تھا۔ یہ دونوں دلدادگان علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا۔ یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں۔ قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں۔ علامہ شبلی کی صداقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا... پروفیسر آرنلڈ نے عربی کا استفادہ علامہ شبلی سے کیا اور یہ دیکھا کہ پرانی زمینوں میں بھی جواہر آبدار موجود ہیں۔ اس واقفیت کا نتیجہ پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف پریچنگ آف اسلام کی صورت میں عیاں ہوا۔ علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ زبان سیکھی تھی۔ علامہ ممدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلہ کا حل کرنے والا ہے"۔ (حیات شبلی، صفحہ 140)

علی گڑھ کے تعلق سے جدید تعلیمی ضرورت کا احساس جس کی طرف مولانا شروانی نے اشارہ کیا ہے وہ اس وقت اور زیادہ پختہ ہو گیا جب مولانا شبلی اسلامی ممالک کے سفر سے واپس آئے۔ یہ سفر آپ نے علی گڑھ کے زمانہ ملازمت میں کیا تھا۔ اور راستہ میں پورٹ سعید تک آرنلڈ بھی مولانا کے ساتھ تھے۔ اب مولانا کو پختہ یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لیے نئے نظام تعلیم کی شدید ضرورت ہے۔

یہاں ہم مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ مستعار لیں گے:

"مولانا شبلی کے نزدیک مسلمانوں کی ترقی کے لیے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعلیم کا ایسا نصاب ترتیب دیا جائے جس میں ایک طرف یورپ کے تمام جدید علوم وفنون کی تعلیم ہو اور دوسری طرف خالص اسلامی علوم کی۔ اور طریقہ تربیت اور درس گاہوں کا ماحول تمام تر مذہبی ہو۔ اگر ساری قوم کی تعلیم کا یہ بندوبست نہ ہو تو کم از کم عربی درس گاہوں میں ایسی اصلاح کی جائے کہ یونان کے بوسیدہ علوم کا سارا دفتر ہٹ کر اس کی جگہ نئے علوم کی تعلیم لے لے اور خالص مذہبی علوم اپنی جگہ پر رہیں اور نصاب میں متاخرین کے شروح وحواشی کے بدلے قدماء کی اصل کتابیں جو فن کی جان ہیں پڑھائی جائیں۔ درس گاہیں عالی شان، کمرے صاف ستھرے اور تربیت ایسی ہو کہ طلبہ میں اولوالعزمی، حوصلہ مندی، بلند نظری اور خودداری پیدا ہو۔ لیکن یہ چیز ان کو نہ قسطنطنیہ میں ملی، نہ شام میں اور نہ مصر میں۔ سفرنامہ میں لکھتے ہیں — "اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی"۔ (سفرنامہ روم ومصر وشام)

مولانا شبلی کے اس تجربہ اور مطالعہ نے انھیں ایک نئے تعلیمی تصور تک پہنچایا۔ یہ کہ ایسی درس گاہیں قائم کی جائیں جہاں جدید وقدیم دونوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔ مولانا سید سلیمان ندوی آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی کا یہی احساس تھا جو ندوۃ العلما کے قیام کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلما کے نظام ودستور العمل کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس نے دارالعلوم کا یہ مرقع (مسودہ)، جس کو

سیاح روم وشام نے اپنے قلم سے کھینچا ہے، دیکھا ہے۔ اس کو نظر آئے گا کہ روم وشام میں جو کچھ محسوس ہوا ہے اس کی تصویر ہندستان میں کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے"۔
(حیات شبلی، صفحہ 217)

علی گڑھ سے مولانا شبلی کا تعلق 1883ء میں قائم ہوا اور صدی کے آخر تک جاری رہا۔ اس مدت میں مولانا کا تجربہ اور مطالعہ ان پر واضح کر چکا تھا کہ قوم کی اصلاح وترقی کے لیے کیا کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف وہ خود ایسی علمی اور تاریخی کتابیں تصنیف کرنا چاہتے تھے جو قوم کے لیے ذہنی انقلاب کی بنیاد بن سکیں۔ دوسری طرف ان کے ذہن میں کم از کم دو ایسے اداروں کا نقشہ آچکا تھا جو اگلی نسل میں شبلی جیسے انسانوں کا تسلسل باقی رکھنے والا ہو۔ ایک ایسی درس گاہ جو جدید وقدیم کی تعلیم کا مرکز ہو۔ اور دوسرے ایک ایسا تصنیفی ادارہ جو اسلامی موضوعات کے لیے اعلیٰ درجہ کے اہل قلم تیار کرے۔ ان کے پہلے خواب کی تعبیر دارالعلوم ندوۃ العلماء تھا اور دوسرے کی تعبیر دارالمصنفین۔ یہ دونوں ادارے آج بھی قائم ہیں۔ اگر چہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے شبلی کے مطلوب انسان تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

مولانا شبلی اب جو کام کرنا چاہتے تھے اس میں کالج کی ملازمت ایک رکاوٹ تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ درس وتدریس کی ذمہ داریوں سے یکسو ہو کر مندرجہ بالا قسم کے کام پر لگ جائیں۔

خوش قسمتی سے حیدر آباد نے ان کے لیے یہ موقع فراہم کر دیا۔ مولوی سید علی بلگرامی اور نواب وقار الملک کی کوششوں سے ریاست نے ان کے لیے ایک مستقل وظیفہ جاری کر دیا تا کہ وہ یکسو ہو کر اپنے مشن کی تکمیل میں لگ جائیں۔ اس سلسلے میں حیدر آباد کی طرف سے جو فرمان جاری ہوا اس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے:

"مولوی شبلی صاحب جو اس وقت علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر ہیں، ایک نہایت قابل اور لائق شخص ہیں اور تصنیف میں ایک خاص مذاق رکھتے ہیں۔ اب ان کی تمنا ہے کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے کام میں صرف کریں اور معمولی درس

وتدریس کو ترک کر دیں۔ مولوی صاحب موصوف کو تصنیف کے کام میں فارغ البالی کے ساتھ مصروف کرنا ایک قومی کام ہے اور اس وقت کوئی عالم ہندستان میں ایسا نہیں ہے جو پرانے ذخیروں سے اس طرح کام لے"۔

اس تمہید کے بعد فرمان میں کہا گیا تھا کہ چونکہ سرکار سے ایسے شخص کی اعانت ضروری ہے، اس لیے ان کے لیے وظیفہ جاری کرنے کی منظوری دی جاتی ہے۔ یہ وظیفہ ابتداءً سو روپے ماہوار تھا اور آخر میں بڑھا کر تین سو کر دیا گیا۔

شبلی نے علی گڑھ میں جو کام کیا اس کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ایک اور چیز کو شامل کیا جائے۔ اس کے بغیر یہ مطالعہ خالص علمی اعتبار سے ناقص رہے گا۔ اور وہ ہے وہ زمانہ جس میں شبلی کو کام کرنے کا موقع ملا۔

شبلی کا زمانہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں ہندستان اس سے بہت مختلف تھا جو آج ہمیں نظر آتا ہے۔ اس وقت مسلم غلبہ کا تسلسل نوابوں اور زمینداروں کی سطح پر بدستور جاری تھا۔ اردو ملک کی زبان تھی، حتیٰ کہ اس وقت کے بیرونی حکمراں (انگریز) بھی عام طور پر اردو کو سمجھتے تھے۔ ماضی کے نتیجہ میں شعروشاعری کی عظمت ابھی تک لوگوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے اسباب تھے جنھوں نے شبلی کو وہ اعلیٰ مواقع کار دیے جن کی مثالیں ان کی زندگی میں ملتی ہیں۔

اسی کے ساتھ ایک اہم بات یہ تھی کہ قدیم روایات کے نتیجہ میں ابھی تک قدر دانی کا ماحول موجود تھا۔ ایک شخص کے اندر جو ہر دیکھ کر وقت کے بڑے لوگ کھلے طور پر اس کا اعتراف کر سکتے تھے۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو آج کل بالکل ختم ہو چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج شبلی جیسی شخصیتیں بھی کہیں نظر نہیں آتیں۔

مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں کہوں گا کہ شبلی کو علی گڑھ کا بہترین انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح شبلی کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے سولہ سال جو علی گڑھ میں گزرے وہ

ان کی زندگی کے بہترین سال تھے۔اس طرح دونوں کو وہ چیز ملی جس کی دونوں میں سے ہر ایک کو ضرورت تھی۔شبلی نے علی گڑھ کے اوپر اسلام کی تاریخی اور علمی عظمت قائم کی جس کا وہ اس وقت بے حد محتاج تھا۔اسی طرح علی گڑھ نے شبلی کو جدید کا عرفان دیا جس کے نتیجہ میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے درمیان وہ اسلامی شخصیت ابھر سکی جس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے ''عہد جدید کا معلّم اول'' کا لقب دیا ہے۔شبلی اور علی گڑھ کے دو مختلف دھاروں کا ملنا اس امتزاج کو وجود میں لا سکا جس نے اسلامی تاریخ پر اعلیٰ ترین کتابیں تخلیق کیں جس نے دار العلوم ندوۃ العلما کی بنیاد رکھی، جو دار المصنفین کی شکل میں ظاہر ہوا۔اور اس سے بھی بڑھ کر جس نے قوم کی اگلی نسلوں کو وہ ہیجان اور شعور دیا جو آج بھی جدید پر قدیم کو غالب کرنے کی امانت اپنے سینوں میں لیے ہوئے ہے۔جو زمانہ کی وقتی قدروں پر اسلام کی دائمی قدروں کو بالا کرنے کے لیے بے چین ہے۔جس طرح علی گڑھ زندہ ہے، اسی طرح شبلی بھی زندہ ہے اور دونوں پھر اسی طرح ایک دوسرے سے ملیں گے جس طرح وہ ماضی میں باہم ملے تھے۔یہ تاریخ کا فیصلہ ہے اور تاریخ کا فیصلہ بہر حال پورا ہو کر رہتا ہے۔

نوٹ: ''شبلی ڈے'' کے موقع پر 3 مارچ 1968 کو یونین ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا۔(الرسالہ، ستمبر 1986)

اقرب الاسلام

مولانا جمیل الرحمن سیوہاروی نائب مفتی دار العلوم دیوبند نے ایک مرتبہ مولانا انور شاہ کشمیری سے پوچھا فلسفہ قدیم وجدید میں کون سا اسلام سے قریب ہے؟ تو فرمایا کہ فلسفہ قدیم ابعد عن الاسلام (قدیم فلسفہ اسلام سے سب سے زیادہ دور) ہے اور فلسفہ جدید اقرب الی الاسلام (جدید فلسفہ اسلام سے سب سے زیادہ قریب) ہے۔(ملفوظات محدث کشمیری، صفحہ 95-94) (ڈائری، 18 مئی 2000)

ذہاب العلما

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی ایک ممتاز مسلم رہنما اور ایک مستند عالم دین تھے۔ وہ 9 اکتوبر 1939ء کو دربھنگہ میں پیدا ہوئے۔ وہ مختلف اعلیٰ حیثیتوں کے ساتھ اسلام اور ملت اسلام کی قابل قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ اپنی آخری عمر میں وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے چیئرمین تھے۔ 4 اپریل 2002ء کو دہلی میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ اِنا للہ و اِنا الیہ راجعون۔

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کی موت دور آخر کے اس ظاہرہ کی ایک مثال ہے جس کو حدیث میں ذہاب العلما کہا گیا ہے۔ یعنی علما کا چلے جانا یا علما کا اُٹھ جانا۔ عام طور پر اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ علما ایک کے بعد ایک مرجائیں گے اور پھر کوئی عالم دنیا میں باقی نہ رہے گا۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہاں علما سے مراد اجتہادی صلاحیت کے علما ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس حدیث میں علما سے مراد بلند پایہ علما ہیں۔ تاہم اس کا مطلب سادہ طور پر بلند پایہ علما کی رحلت نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد ملت کے بلند پایہ افراد کا علما کی صف میں شامل نہ ہونا ہے۔ یعنی علما بننے کے قابل لوگ علما بننا چھوڑ دیں گے۔ اس سے مراد اشخاص کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ دور کا خاتمہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی بہت سی حدیثیں صنعتی دور میں پیدا ہونے والے حالات کی پیشین گوئی ہیں۔ صنعتی دور میں ترقی کے مواقع اور مادی چمک دمک بہت بڑھ جائے گی، اس بنا پر دنیا کی طرف رغبت (temptation) میں اتنا زیادہ اضافہ ہوجائے گا کہ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ دنیوی شعبوں کی طرف بھاگنے لگیں گے۔ اس صورت حال کو ایک شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

فریبِ جلوہ اور کتنا مکمل اے معاذ اللہ — بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اُٹھا پایا

خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ (مسند احمد، حدیث نمبر 10296) کے

مطابق، اعلیٰ صلاحیت کا آدمی ہی اعلیٰ عالم بنتا ہے۔ جب اعلیٰ اذہان دین کی طرف راغب نہ ہوں گے تو فطری طور پر یہ ہوگا کہ دین کی صفیں اعلیٰ قسم کے علما سے خالی ہو جائیں گی۔ اس کے بعد صرف وہ لوگ دینی شعبوں اور دینی اداروں کو مل سکیں گے جو اپنی کم تر صلاحیت کی بنا پر مادی ترقی کے بڑے مناصب میں اپنی جگہ بنانے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں۔

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ وہ تقریر اور تحریر، انتظام اور معاملہ فہمی، بصیرت اور تدبر میں اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ وہ اگر سیکولر ڈگری اور سیکولر پروفیشن کو اپنا میدان بناتے تو یقیناً وہ بڑے بڑے دنیوی مناصب پر فائز ہو سکتے تھے۔ اس طرح یہ ذہاب العلما کا ایک واقعہ ہوتا۔ مگر انہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیت کو اسلام اور ملت اسلام کی خدمت میں لگانے کو ترجیح دی۔ دنیا کے مادی بازار میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بڑی قیمت لینے کے بجائے قناعت کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے انہوں نے اپنے آپ کو دین کے لیے وقف کر دیا۔ وہ ایک ایسے عالم بن گئے جنہوں نے مادی ترقی کے حصول کو اپنا نشانہ نہیں بنایا۔ انہوں نے دنیا کی طرف جانے کے بجائے دین کی طرف جانے کو اپنی توجہات کا مرکز بنالیا۔

وہ ان خوش قسمت افراد میں سے تھے جنہوں نے اپنی اعلیٰ فطری صلاحیت کے باوجود اپنی صلاحیت کو دنیا کے بازار میں کیش نہیں کرایا بلکہ اس کو دین کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے مختلف مقامات پر سیکڑوں کی تعداد میں ملّی ادارے قائم کیے۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر بہت سی ممتاز علمی اور ملی تنظیموں میں انہیں اعلیٰ مناصب دیے گئے، وغیرہ۔

مولانا اشرف علی تھانوی (وفات 1943) سے کسی نے کہا کہ آپ کے مدرسوں میں آج کل اعلیٰ قابلیت کے علما پیدا نہیں ہوتے۔ مولانا نے جواب دیا کہ اصل بات یہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ اعلیٰ قابلیت کے لوگ اب مدرسوں میں نہیں آتے۔

یہی مطلب ذہاب العلما کا ہے جس کو مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے سادہ انداز میں اس طرح بیان کر دیا۔ یہ نئی صورت حال جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوئی، اس کا سبب کیا ہے۔ جیسا

کہ عرض کیا گیا، اس کا سبب یہ ہے کہ جدید صنعتی انقلاب نے دولت کمانے کے جو نئے طریقے پیدا کیے ہیں اُس میں اعلیٰ صلاحیت کے لوگوں کو ایسے برتر امکانات نظر آنے لگے جو پہلے کبھی نہیں تھے۔

قدیم زمانہ میں معیشت کا دارومدار زیادہ تر روایتی انداز کی زراعت پر تھا۔اس نظام کے تحت کمائی کے مواقع بہت محدود ہوتے تھے۔مگر جدید ٹیکنالوجی اور جدید تجارتی شعبوں نے کمائی کے مواقع لاکھوں گُنا زیادہ بڑھا دیے ہیں۔ اب ''عاجلہ'' میں اتنی زیادہ کشش پیدا ہوگئی ہے جو پہلے کبھی نہیں تھی۔مادی ترقی کی یہی بڑھی ہوئی کشش ہے جس نے اعلیٰ صلاحیت کے لوگوں کا رُخ اُن تعلیمی اداروں سے ہٹا دیا جہاں علما پیدا کیے جاتے ہیں۔وہ تیزی کے ساتھ اُن سیکولر تعلیمی اداروں کی طرف بھاگنے لگے جہاں وہ افراد پیدا کیے جاتے ہیں جو جدید ترقیاتی شعبوں میں اعلیٰ مناصب پا سکیں۔

اس اعتبار سے دیکھیے تو مولانا مجاہد الاسلام قاسمی حقیقی معنوں میں دورِ جدید کے اسلامی مجاہد تھے۔موجودہ زمانہ میں سب سے بڑا اجہاد یہ ہے کہ ایک باصلاحیت آدمی مواقعِ دنیا کے مقابلہ میں مواقعِ دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کرسکے۔ یہ قربانی کی وہ قسم ہے جو کسی آدمی کو عظیم مجاہد بنا دیتی ہے، اور مولانا مرحوم بلاشبہ اس معنیٰ میں دورِ جدید کے مجاہدِ اسلام تھے۔

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کی متنوع خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے ہر دل عزیز اوصاف کی بنا پر ہر طبقہ کے درمیان مقبول تھے۔مسلمانوں کے ہر مکتبِ فکر کے درمیان اُن کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔وہ ایک ممتاز عالم ہونے کے ساتھ ایک مقبول رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نئی نسل کے درمیان ایسے لوگ پیدا ہوں جو مولانا مرحوم کی راہ پر چلیں۔ملت کے درمیان ایسے افراد کا خلا نہ ہونے پائے جن کو بیک وقت علمی استناد بھی حاصل ہو اور اسی کے ساتھ عوام کی مقبولیت بھی۔مولانا مرحوم کی زندگی جدید مسلم نسل کو یہ مثبت پیغام

دیتی ہے کہ — میری موت کو ماتم کا عنوان نہ بناؤ، بلکہ اُس کو عزمِ نو کا عنوان بناؤ۔ ملت کے کام کو ہیں نے جہاں چھوڑا ہے وہاں سے آغاز کرکے آگے بڑھو۔ تعمیرِ ملت کے عمل کو مسلسل جاری رکھو۔ یہاں تک کہ تم اُس کی آخری منزل پر پہنچ جاؤ۔ (الرسالہ، جون 2002)

فقہ کا مطلب

حضرت عمر فاروق نے فرمایا: تَفَقَّهُوا قَبْلَ أَنْ تُسَوَّدُوا (صحیح البخاری، جلد 1، صفحہ 25)۔ یعنی سردار بننے سے پہلے تفقہ حاصل کرو۔ حضرت عمر کے اس قول سے موجودہ زمانہ کے بہت سے لوگ اُس فن کی اہمیت پر استدلال کرتے ہیں، جس کو فقہ کہا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سردار یا قائد کو فقہ کا علم ہونا ضروری ہے۔

مگر یہ استدلال صحیح نہیں۔ حضرت عمر کے اس قول سے اس فن کی اہمیت ثابت نہیں ہوتی، جو امام ابو حنیفہ اور دوسرے فقہا کے ذریعہ وجود میں آیا۔ حضرت عمر کے اس قول سے فقہ کی اہمیت ثابت کرنے والے لوگ بھول جاتے ہیں کہ موجودہ فقہ حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں موجود ہی نہ تھی۔ اگر مذکورہ قول کے یہ معنی لیے جائیں تو تمام صحابہ (بشمول عمر فاروق) سرداری اور قیادت کے لیے نااہل قرار پائیں گے۔ کیوں کہ ان کا زمانہ موجودہ فقہ سے پہلے کا تھا۔ چنانچہ ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ موجودہ فقہ میں تبحر حاصل کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر کے قول میں تفقہ سے مراد حکمت وبصیرت حاصل کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرداری اور قیادت کے لیے دین کا سادہ علم کافی نہیں ہے، بلکہ دین میں گہری بصیرت ضروری ہے۔ گہری بصیرت کے بغیر جو شخص دینی قائد بنے گا، وہ قوم کو ہلاکت کے گڑھے میں لے جائے گا۔ (اوراقِ حکمت، ڈائری، 4 مارچ 1985)

رجل موھوب

عالمِ اسلام کی معروف شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا 31 دسمبر 1999 کو انتقال ہوگیا۔ مولانا موصوف 1913ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی شخصیت گویا سوسالہ دور کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ تاریخ میں وہ اس دور کی علامت کے طور پر دیکھے جائیں گے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بیک وقت مختلف اور متنوع خصوصیات کے مالک تھے۔ وہ ایک ممتاز عالم تھے۔ دارالعلوم ندوۃ (لکھنؤ) کو ان کے زمانے میں غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ اوراسی طرح دوسرے بہت سے اداروں کی کامیاب قیادت کی۔ بیسویں صدی میں اٹھنے والی تقریباً تمام بڑی بڑی اسلامی تحریکوں سے ان کا براہِ راست یا بالواسطہ تعلق تھا۔ وہ ہر حلقہ اور ہر گروہ میں یکساں طور پر عزت و اعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کو بلااختلاف ایک بین اقوامی شخصیت کہا جاسکتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک فرد اپنی قوم میں نمائندۂ قوم کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔ مولانا موصوف کو یہی حیثیت حاصل تھی۔ ایسا شخص کسی قوم کے لیے بے حد قیمتی ہے۔ اپنی اس حیثیت کی بنا پر وہ پوری قوم کے لیے شیرازۂ اتحاد بن جاتا ہے۔ وہ اپنی قوم اور دوسری قوموں کے درمیان عملاً رابطہ کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔ وہ تمام لوگوں کے لیے مرجعِ قوم بن جاتا ہے۔ یعنی ایک ایسا شخص جس سے پوری قوم کے معاملے میں رجوع کیا جاسکے۔ وغیرہ۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات میں یہ تمام حیثیتیں بہ تمام وکمال جمع ہوگئی تھیں۔ مولانا محمد منظور نعمانی نے ایک بار مولانا موصوف کو ”رجل موھوب“ کہا تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے لیے یہ خطاب لفظ بلفظ درست ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا کارنامۂ حیات تقریباً پوری صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک متحرک صدی تھے۔ صدی کی آخری

تاریخ کو یہ متحرک شخصیت خاموش ہوگئی۔ وہ انسانوں سے جدا ہو کر اپنے رب سے جا ملی۔ إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے اندر بیک وقت مختلف اور متنوع خصوصیات موجود تھیں۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے کہا تھا کہ یورپ میں جو کام اکادمی کرتی ہے، وہ ہمارے یہاں "اک آدمی" کرتا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس قول کا ایک زندہ نمونہ تھے۔ وہ ایک فرد تھے مگر انہوں نے کئی اداروں کے برابر کام کیا۔

مولانا موصوف نے ایک طرف دارالعلوم ندوہ جیسے ادارے کے ذریعے مسلمانوں کو علم دین سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف مؤسسہ مطالعات وتحقیقات اسلامی لگزمبرگ جیسے اداروں کے ذریعے لوگوں کے لیے عصری معرفت کا سامان کیا۔ ایک طرف انہوں نے اپنی موثر تقریروں کے ذریعے مسلمانوں میں عملی جوش کو ابھارا اور دوسری طرف انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے انھیں گہرے علمی شعور سے آشنا کیا۔

ایک طرف انہوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعے مسلمانوں کے ملی تحفظ کا انتظام کیا تو دوسری طرف "پیامِ انسانیت" کی تحریک کے ذریعے انھیں داعی کے مقام پر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی تقریروں وتحریروں ذریعے مسلمانوں کو تعمیر نو کی طرف متوجہ کیا۔ ایک طرف انہوں نے رابطہ العالم الاسلامی کے اہم رکن کی حیثیت سے عالمی مسلم اتحاد کی کوشش کی اور دوسری طرف رابطۂ ادب اسلامی کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے اندر علم وادب کے حصول کا شوق ابھارا۔ ایک طرف انہوں نے مدارس دینیہ کے قیام کے ذریعے قدیم علوم کو زندہ کیا اور دوسری طرف آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے اندر جدید علوم کے ماہر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات بہت سی اعلیٰ قدروں کا نمونہ بن گئی تھی۔ انہیں میں سے ایک چیز وہ ہے جس کی بابت کہا گیا ہے کہ — دنیا سے بے نیاز ہو جاؤ، دنیا خود تمہاری

طرف دوڑ کر آئے گی۔ مولانا موصوف دنیا کی چیزوں سے بے نیاز ہو گئے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا نے خود اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا۔

ایک بار ایک عرب سلطان ندوۃ (لکھنؤ) آئے۔ ان کے استقبالیہ میں جو جلسہ ہوا اس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایک عرب بزرگ کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا تھا: نَعِمَ الأَمِيرُ عَلَى بَابِ الفَقِيرِ، وَبِئْسَ الفَقِيرُ عَلَى بَابِ الأَمِيرِ۔ مولانا موصوف ساری زندگی اہل دنیا سے بے نیاز رہے۔ مگر اہل دنیا نے خود اپنی ساری متاع ان کے سامنے پیش کر دی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ ان کو بڑے بڑے ایوارڈ دیے گئے۔ مثلاً کنگ فیصل ایوارڈ اور اسی طرح برونائی اور عرب امارات کے خصوصی ایوارڈ، وغیرہ۔

مولانا موصوف کی ذات اس حقیقت کی ایک عملی مثال تھی کہ مال، عہدہ، عزت، سب انسان کے تابع ہیں، نہ کہ انسان ان چیزوں کے تابع ہے۔ انسان اگر اپنی انسانیت کو بلند کر لے تو بقیہ تمام چیزیں اپنے آپ اس کو حاصل ہو جائیں گی، بغیر اس کے کہ اس نے ان چیزوں کے لیے براہِ راست جدوجہد کی ہو۔

ایک شاعر نے کسی کے بارے میں کہا تھا: وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ اپنی ذات میں ایک عالَم تھے۔ ان کی موت بلاشبہ موت العَالِم موت العَالَم کی مصداق ہے۔ تاہم قابلِ اطمینان بات یہ ہے کہ مولانا موصوف نے اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کی عظیم تعداد چھوڑی ہے۔ یقین ہے کہ مولانا موصوف کے بعد ان کی تربیت سے فیض یافتہ یہ حضرات اس عربی شعر کا مصداق ثابت ہوں گے: إِذَا مَاتَ مِنَّا سَيِّدٌ قَامَ سَيِّدٌ۔ یعنی، جب ہمارا ایک سردار وفات پاتا ہے تو دوسرا سردار کھڑا ہو جاتا ہے۔
(الرسالہ، مارچ 2000)

ایک قابل تقلید مثال

مولانا حافظ سید عبدالکبیر عمری، جامعہ دارالسلام، عمرآباد (تامل ناڈو) میں شیخ التفسیر تھے۔ 90 سال سے زیادہ عمر پانے کے بعد انہوں نے 3 مارچ 2015 کو وفات پائی۔ ان کی صحت آخر وقت تک اچھی رہی۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ کی اچھی صحت کا راز کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا: سادہ کھانا، سادہ زندگی۔ یہ تندرستی کا ایک فطری اصول ہے۔ جو شخص اس پر عمل کرے، وہ یقیناً اپنی پوری زندگی میں صحت مند رہے گا۔

ایک مرتبہ مدرسے کی انتظامیہ اور طلبہ کے درمیان کسی وجہ سے نزاع ہوگیا۔ مولانا کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے انتظامیہ سے کہا کہ طلبہ کو فریق مت بناؤ، رفیق بناؤ۔ معاملہ حل ہو جائے گا۔ انتظامیہ نے اس مشورے پر عمل کیا، اور مسئلہ آسانی کے ساتھ حل ہوگیا۔ یہ فارمولا بلاشبہ ایک درست فارمولا ہے۔ وہ نہ صرف مدرسے کے معاملات کے لیے مفید ہے، بلکہ وہ تمام اختلافی معاملات کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ خواہ وہ معاملہ خاندانی زندگی کا ہو یا سماجی زندگی کا۔

ایک مرتبہ وہ کلاس میں تفسیر کی کتاب بیضاوی کا درس دینے کے لیے آئے۔ وہ دیر تک خاموشی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ طلبہ نے پریشان ہوکر سوال کیا کہ مولانا طبیعت تو ناساز نہیں ہے۔ مولانا نے آبدیدہ ہوکر جواب دیا کہ آج میں مطالعہ کے بغیر آیا ہوں۔ طلبہ نے سوال کیا کہ مولانا آپ تو 50 سال سے زیادہ عرصے سے بیضاوی کا درس دے رہے ہیں، پھر بھی کیا آپ کو مطالعے کی ضرورت ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ ہر دن مطالعہ کرنے کی وجہ سے میں آپ لوگوں کو کچھ نئی بات دے پاتا ہوں، آج آپ کو دینے کے لیے میرے پاس کوئی نئی بات نہیں۔ کل خدا کے یہاں اس بات پر میری پکڑ ہوگی تو میں کیا جواب دوں گا۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگے۔ یہی اچھے استاد کا معیار ہے۔ جس استاد کے اندر یہ اسپرٹ موجود ہو، وہ بلاشبہ اچھا استاد ہے۔

جس ادارے کو ایسے استاد حاصل ہوں، وہ ایک خوش قسمت ادارہ ہے۔ ایسے ادارے میں تعلیم پا کر جو نوجوان نکلیں، وہ یقیناً اپنی زندگی میں کامیاب رہیں گے۔ (الرسالہ، مئی 2015)

زندگی کا ایک اصول

مولانا مرغوب الرحمن قاسمی (وفات 2010) دار العلوم دیوبند کے مہتمم تھے۔ اپنی زندگی کے آخری تیس سال تک وہ اِس عہدے پر فائز رہے۔ اپنے کام کی نسبت سے، اُن کے تعلقات بہت سے لوگوں کے ساتھ قائم تھے۔ اِن تعلقات کے لیے مولانا مرحوم کا ایک اصول تھا۔ اِس اصول کو مولانا نور عالم خلیل امینی نے اپنے ایک مضمون میں اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اِس مسئلے میں مولانا کے ذہن میں خانے بنے ہوئے تھے اور وہ اُن میں سے ہر ایک کو اُس خانے میں رکھتے جو انھوں نے اُس کے لیے متعین کیا ہوتا تھا، اور اسی "درجہ بندی" کے اعتبار سے، وہ اُن کے ساتھ حسنِ سلوک اور شفقت کا معاملہ کرتے تھے"۔ (ماہ نامہ الفرقان، لکھنؤ، مارچ 2011، صفحہ 36)

یہ اصول ہر شخص کے لیے ایک قابلِ تقلید اصول ہے۔ یہ اصول آدمی کو غیر ضروری ٹنشن سے بچاتا ہے۔ ایسا آدمی غیر ضروری قسم کی شکایتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ ایک عملی اصول (practical formula) ہے اور تعلقات کے معاملے میں عملی اصول ہی ہمیشہ بہتر اصول ہوتا ہے۔

لوگوں کو ایک دوسرے سے شکایتیں کیوں ہوتی ہیں، اِس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اکثر لوگ دوسروں سے زیادہ امید قائم کر لیتے ہیں اور جب وہ شخص ان کی زیادہ امید (over-expectation) پر پورا نہیں اترتا تو وہ اس کی شکایت کرنے لگتے ہیں۔

اِس مسئلے کا سادہ حل یہ ہے کہ آپ لوگوں کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ آپ کسی شخص سے وہی

امید رکھیے جو باعتبارِ حقیقت اُس سے رکھنا چاہیے۔ جب بھی ایسا ہو کہ ایک شخص آپ کی امید پر پورا نہ اترے تو آپ صرف یہ کیجیے کہ اس کا "خانہ" بدل دیجیے۔ پہلے اگر آپ نے اُس کو کٹیگری "اے" میں رکھا تھا، تو اب آپ اس کو کٹیگری "بی" یا کٹیگری "سی" میں ڈال دیجیے۔ اس کے بعد اُس آدمی کو لے کر آپ کے اندر نہ کوئی ٹنشن ہوگا اور نہ کوئی شکایت۔ (الرسالہ، مئی 2011)

ایک سبق آموز واقعہ

مولانا نور عالم خلیل امینی (استاد ادبِ عربی، دار العلوم، دیوبند) نے دیوبند کا ایک واقعہ اِن الفاظ میں بیان کیا ہے: "24 جولائی 2002 کو دار العلوم دیوبند کے ایک طالب علم کے ساتھ کسی وجہ سے چند شہریوں نے زدو کوب کا معاملہ کیا۔ دار العلوم کے طلبا کی ایک تعداد نوجوانی کے جوش سے مغلوب ہوگئی اور اُن سے دار العلوم کے چوراہے کی چند دکانوں کو ذرا بہت نقصان پہنچ گیا۔ متعلقہ شہریوں کو بہت تکلیف ہوئی اور انھوں نے حضرت مرحوم (مولانا مرغوب الرحمن قاسمی، مہتمم دار العلوم، دیوبند) سے بڑھا چڑھا کر اِس معاملے کی شکایت کی۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ تحریری طور پر دیجیے کہ آپ لوگوں کا واقعۃً کتنا اور کیا کیا نقصان ہوا ہے۔ انھوں نے مبالغے کے ساتھ نقصانات کا اندازہ تحریراً پیش کیا تو حضرت نے فرمایا— دیکھیے، دار العلوم کو قوم جو چندہ دیتی ہے، وہ دار العلوم کے ضروری مفادات پر خرچ کرنے کے لیے دیتی ہے۔ یہ حقیر اُس کا امین ہے۔ اس میں کوئی خیانت اس کے لیے جائز نہیں، اِس لیے میں دار العلوم کی رقم سے آپ کے نقصانات کی تلافی نہیں کرسکتا۔ آپ لوگ مہینے دو مہینے کا موقع دیجیے کہ میں اپنی زمین کا کوئی حصہ مناسب قیمت پر فروخت کرکے آپ کے نقصانات کا معاوضہ ادا کرسکوں۔ حضرت کی بات سن کر شہریوں کا وفد آب دیدہ ہوگیا اور اُس نے حضرت سے معافی کی درخواست کی کہ حضرت، ہم لوگوں سے شدید غلطی ہوئی کہ ہم نے آپ کو پریشان کیا اور آپ

کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بنے۔ ہمیں کوئی معاوضہ نہیں چاہیے۔ دار العلوم جیسے آپ کا ہے، ویسے ہی وہ ہمارا بھی ہے“۔ (ماہ نامہ الفرقان، لکھنؤ، مارچ 2011، صفحہ 44)۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی آدمی پیدائشی طور پر برا نہیں ہوتا۔ جب بھی کوئی شخص مذکورہ قسم کا کام کرتا ہے تو ایسا ہمیشہ وقتی جذبے کے تحت ہوتا ہے۔ آپ اگر جوابی ردّعمل کا طریقہ اختیار نہ کریں، بلکہ نرمی اور خیر خواہی کے ساتھ گفتگو کریں تو عین ممکن ہے کہ فریقِ ثانی کو اپنے کام پر شرمندگی ہو جائے اور وہ خود ہی اپنا رویہ بدل لے — منفی ردّعمل معاملے کو بگاڑ دیتا ہے، اور مثبت ردّعمل معاملے کو درست کر دیتا ہے۔ (الرسالہ، مئی 2011)

مجھے آخر تک جانا ہے

مولانا اشرف علی تھانوی ایک بار ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ ان کو اعظم گڑھ جانا تھا۔ ایک ریلوے گارڈ جو ان کا معتقد تھا اسٹیشن پر ان سے ملنے کے لیے آیا۔ اتنے میں ایک دیہاتی آدمی بھی آ گیا۔ اس نے گنّے کا ایک گٹّھا تحفے کے طور پر مولانا کو پیش کیا۔ مولانا نے قبول کر لیا اور اپنے ساتھی سے کہا کہ ان گنوں کا وزن کرا کے ان کو بک کروالو۔ گارڈ نے کہا: بک کروانے کی ضرورت کیا ہے۔ اس ٹرین سے جو گارڈ جا رہا ہے میں اس سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ خیال رکھے گا۔ مولانا نے کہا کہ تمھارا گارڈ تو اسی ٹرین تک ساتھ رہے گا اور مجھے آگے جانا ہے۔ گارڈ نے سمجھا کی مولانا کو آگے کسی اسٹیشن پر یہ ٹرین بدل کر دوسری ٹرین پکڑنا ہے۔ اس نے کہا: کوئی ہرج نہیں۔ میں گارڈ کو بتا دیتا ہوں وہ آگے والے گارڈ سے بھی کہہ دے گا اور آپ کو کوئی زحمت نہ ہوگی۔ مولانا نے کہا: مجھے اس سے بھی آگے جانا ہے۔ گارڈ نے حیرت سے پوچھا: آخر آپ کہاں تک جائیں گے۔ ابھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ آپ اعظم گڑھ جا رہے ہیں۔ مولانا نے کسی قدر خاموشی کے بعد کہا: مجھے آخرت تک جانا ہے، وہاں تک کون سا گارڈ میرے ساتھ جائے گا“۔

یہ معاملہ محض ریل کے سفر کا نہیں بلکہ تمام معاملات کا ہے۔ آدمی کا ہر معاملہ آخرت کا معاملہ ہے۔ دنیا میں کوئی ''گارڈ'' وقتی طور پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔ مگر آخرت کی منزل پر پہنچ کر کوئی گارڈ ساتھ دینے والا نہیں۔ جس کا ذہن یہ ہو کہ مجھے آخرت تک جانا ہے وہ ہر اس چیز کو بے قیمت سمجھے گا جو آخرت میں بے قیمت ہو جانے والی ہو، خواہ وہ کتنی ہی قیمتی نظر آئے۔ اسی طرح وہ ہر اس چیز کو وزن دینے پر مجبور ہوتا ہے جو آخرت میں باوزن ثابت ہونے والی ہو، خواہ آج کی دنیا میں بظاہر وہ کتنی ہی بے وزن دکھائی دے۔

آدمی حق کا انکار کرنے کے لیے آج خوبصورت الفاظ پالیتا ہے۔ مگر آخرت میں اس کو معلوم ہوگا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گئے۔ آدمی طاقت کے بل پر بے انصافی کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ مظلوم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ مگر آخرت میں وہ دیکھے گا کہ اس کی طاقت پیچھے کی دنیا میں رہ گئی ہے، آخرت میں وہ اس کا ساتھ دینے کے لیے موجود نہیں ہے۔ آدمی کے ساز وسامان اس کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ اپنے گھمنڈ کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ مگر آخرت میں وہ پائے گا کہ اس کے وہ ساز وسامان اس سے بہت دور ہو چکے ہیں جن کے اوپر وہ گھمنڈ کیا کرتا تھا۔

مومن اور غیر مومن کا فرق ایک لفظ میں ہے کہ غیر مومن یہ سمجھ کر زندگی گزارتا ہے کہ اس کو اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور مومن اس نفسیات کے ساتھ جیتا ہے کہ اس کو آخرت تک جانا ہے۔ نفسیات کا یہ فرق دونوں کی زندگیوں میں اتنا زیادہ عملی فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ایک جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور دوسرا جنت کا۔ (الرسالہ، اپریل 1981)

کامیابی بھی ناکامی ہو سکتی ہے!

امریکہ کے ایک ناشر نے جب اپنی پہلی کتاب چھاپی تو وہ ایک مہینہ میں پانچ لاکھ کی تعداد میں فروخت ہو گئی۔ بظاہر یہ ایک نہایت شاندار کامیابی تھی۔ مگر دوسرے ہی مہینہ وہ ناشر

دیوالیہ ہوگیا۔اس کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ اس نے کتاب کی لاگت کا کم اندازہ لگایا۔ چنانچہ اس نے جو قیمت مقرر کی اس پر اس کو آٹھ سنٹ فی نسخہ نقصان ہو رہا تھا۔ اگر کتاب کم بکتی تو وہ گھاٹے سے بچ سکتا تھا۔مگر جب اس کو اپنی غلطی کا علم ہوا تو نقصان کی مقدار اس کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔نتیجہ یہ ہوا کہ اتنی زبردست کامیابی کے باوجود اس کا کاروبار ختم ہو گیا۔

یہی حال تمام اجتماعی اقدامات کا ہے۔ہوسکتا ہے کہ ایک نعرہ کسی وجہ سے لوگوں کو اپیل کر جائے اور بہت سے لوگ اس کے ساتھ چل پڑیں۔لیکن اگر اس میں دور اندیشی اور حقیقت پسندی نہیں ہے، اگر اقدام کے وقت حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا ہے۔تو عین ممکن ہے کہ نعرہ اور اس کے ساتھ دینے والے سارے لوگ ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہو جائیں۔

آخرت کے پہلو سے بھی اس کے اندر نصیحت موجود ہے — ہوسکتا ہے کہ ایک دینی کام کافی پھیل جائے۔لاکھوں لوگ اس حلقہ میں شامل ہو جائیں۔اس کے رہنماؤں کو اعزاز اور قدر و منزلت حاصل ہو جائے۔لیکن اگر اس کے پیچھے صحیح اسلامی جذبہ نہیں ہے تو آخرت کے اعتبار سے اس کا وہی انجام ہوگا جو امریکی ناشر کا ہوا۔(ہفت روزہ الجمعیۃ، 20 دسمبر 1967، صفحہ 10)

زمانے سے بےخبری

علما نے کہا ہے کہ جو شخص اپنے زمانے کے احوال سے واقف نہ ہو، وہ جاہل ہے: مَنْ لَمْ یَدْرِ بِعُرْفِ أَهْلِ زَمَانِهِ فَهُوَ جَاهِلٌ (ردالمحتار لابن عابدین، جلد 3، صفحہ 724)۔یہ بات ذاتی عمل کے لیے نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں کے لیے ہے، جو دوسروں کے درمیان کام کرنے کے لیے اٹھیں۔ذاتی عمل کے لیے محدود علم بھی کافی ہے۔مگر اجتماعی معاملات پر لکھنے اور بولنے کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے کہ آدمی دوسروں کے بارے میں بھرپور واقفیت رکھتا ہو۔جو اپنے زمانہ کے احوال سے بےخبر ہو اس کے لیے مفتی یا قائد بننا سرے سے جائز ہی نہیں۔

(ڈائری، 12 جنوری 1996)

تعلیمی پیغام

(زیر نظر پیغام مولانا وحید الدین خاں صاحب نے مدینہ ٹیکنیکل کالج، حیدرآباد، کے سوینیر کے لیے لکھا تھا)

تعلیم صرف روزگار کا سرٹیفکٹ نہیں۔ اس کا اصل مقصد قوم کے افراد کو باشعور بنانا ہے۔ افراد کو باشعور بنانا ملت کی تعمیر کی راہ کا پہلا قدم ہے۔ ملت کا سفر جب بھی شروع ہوگا یہیں سے شروع ہوگا۔ اس کے سوا کسی اور مقام سے ملت کا سفر شروع نہیں ہوسکتا۔

باشعور بنانا کیا ہے۔ باشعور بنانا یہ ہے کہ ملت کے افراد ماضی اور حال کو ایک دوسرے سے جوڑ سکیں۔ وہ زندگی کے مسائل کو کائنات کے ابدی نقشہ میں رکھ کر دیکھ سکیں۔ وہ جانیں کہ وہ کیا ہیں، اور کیا نہیں ہیں۔ وہ اس راز سے واقف ہوں کہ وہ اپنے ارادہ کو خدا کے ارادہ سے ہم آہنگ کر کے ہی خدا کی اس دنیا میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ باشعور انسان ہی حقیقی معنوں میں انسان ہے۔ جو باشعور نہیں وہ انسان بھی نہیں۔

باشعور آدمی اپنے اور دوسرے کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ اس کی کون سی رائے جانب دارانہ رائے ہے اور کون سی غیر جانب دارانہ۔ جب بھی کوئی موقع آتا ہے تو وہ پہچان لیتا ہے کہ یہاں کون سی کارروائی ردعمل کی کارروائی ہے اور کون سی مثبت کارروائی۔ وہ شر کو خیر سے جدا کرتا ہے اور باطل کو الگ کر کے حق کو پہچانتا ہے۔ ایک آنکھ وہ ہے جو ہر آدمی کی پیشانی پر ہوتی ہے۔ تعلیم آدمی کو ذہنی آنکھ عطا کرتی ہے۔ عام آنکھ آدمی کو ظاہری چیزیں دکھاتی ہے، تعلیم کی آنکھ آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ معنوی چیزوں کو دیکھ سکے۔

جس طرح ایک کسان بیج کو درخت بناتا ہے، اسی طرح تعلیم گاہ کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو فکری حیثیت سے اس قابل بنائے کہ وہ ارتقائے حیات کے سفر کو مکمل کر سکے۔ تعلیم آدمی کو ملازمت بھی دیتی ہے۔ مگر یہ تعلیم کا ثانوی فائدہ ہے۔ تعلیم کا اصل پہلو یہ ہے کہ وہ آدمی کو زندگی کی سائنس بتائے۔ وہ آدمی کو حقیقی معنوں میں آدمی بنا دے۔ (الرسالہ، مئی 1985)

پیغام

(مدرسہ باب العلوم، کولکاتا، کے سالانہ مجلہ کے لیے ان کی فرمائش پر زیرِ نظر پیغام روانہ کیا گیا تھا)

زندگی ایک امتحان ہے۔ یہ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اور اسی حقیقت کو سمجھنے میں ہماری تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے، خواہ وہ دنیا کی کامیابی ہو یا آخرت کی کامیابی۔

آخرت کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو دنیا میں جو کچھ ملا ہوا ہے وہ بطور آزمائش ہے، نہ کہ بطور استحقاق۔ آدمی کو چاہیے کہ اس کو وہ اپنی ذاتی چیز نہ سمجھے، بلکہ اس کو خدا کی چیز سمجھے۔ یہ چیزیں صرف اس وقت تک آدمی کے قبضہ میں ہیں جب تک اس کی مدت امتحان پوری نہ ہو۔ مدّت پوری ہوتے ہی سب کچھ اس سے چھین لیا جائے گا۔ اس کے بعد آدمی کے پاس جو کچھ بچے گا وہ صرف اس کے اپنے اعمال ہوں گے، نہ کہ وہ ساز وسامان جن کے درمیان آج وہ اپنے آپ کو پاتا ہے۔

دنیا کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جس طرح ایک شخص کو آزادی حاصل ہے اسی طرح یہاں دوسرے شخص کو بھی پوری آزادی حاصل ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے یہ دنیا اس چیز کا ایک میدان بن گئی ہے جس کو مقابلہ (competition) کہا جاتا ہے۔ یہاں ہر آدمی آزاد ہے، اس لیے یہاں ہر ایک شخص اور دوسرے شخص یا ہر ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کھلا مقابلہ جاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر کامیابی دوسروں کے بالمقابل اپنے آپ کو کامیاب بنانے کا نام ہے۔ یہاں وہی شخص جیتا ہے جو زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے بازی لے جائے۔ یہاں اسی شخص کو ملتا ہے جو دوسروں سے آگے بڑھ کر لے لینے کا حوصلہ کر سکے۔

جن لوگوں کے پاس غیر اللہ کے سہارے ہوں وہ آخرت کی دنیا میں اپنے آپ کو بے قیمت پائیں گے۔ اسی طرح جو لوگ صرف تعصب اور امتیاز کی اصطلاحوں میں سوچنا جانتے ہوں وہ موجودہ دنیا میں بے جگہ ہو کر رہ جائیں گے، وہ مقابلہ کی اس دنیا میں اپنے لیے کوئی حقیقی مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ (الرسالہ، نومبر 1985)

اسلام کا نیا دور

(مدرسہ مصباح العلوم، آسنسول، کی فرمائش پر زیر نظر ''پیغام'' دیا تھا)

چودھویں صدی ہجری پر اسلام کا ایک دور ختم ہوا ہے، پندرہویں صدی ہجری میں اسلام کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج وہ تمام موافق حالات مکمل طور پر پیدا ہو چکے ہیں جو اسلام کا نیا دور شروع کرنے کے لیے درکار ہیں۔

جب رات کا اندھیرا ختم ہوتا ہے اور نئے دن کا سورج نکلنے کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، تو یہ فطرت کی طرف سے اس بات کا خاموش اعلان ہوتا ہے کہ روز و شب کی ایک گردش پوری ہوگئی۔ اب اس کی دوسری گردش شروع ہونے والی ہے۔ جو شخص چاہے اس کی روشنی میں اپنا سفر شروع کرے اور منزل پر پہنچ جائے۔

صبح کے وقت سورج کا نکلنا ہر آدمی کو دو چیزوں کے درمیان کھڑا کر دیتا ہے۔ ایک وہ موقع جو گزر چکا۔ دوسرا وہ موقع جو سامنے کھلا ہوا موجود ہے۔ جو شخص بھی ان مواقع کو استعمال کرے گا، وہ لازماً اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔ تاہم امتحان کی اس دنیا میں مواقع صرف انھیں کے لیے ہوتے ہیں، جو مواقع کو استعمال کریں۔ جو لوگ مواقع کو استعمال کرنے میں ناکام رہیں، ان کے لیے کوئی موقع موقع نہیں۔ کامیابی دوسرے لفظوں میں موجود مواقع کو استعمال کرنے ہی کا دوسرا نام ہے۔

کوئی شخص پچھلے کل میں اپنا سفر شروع نہیں کر سکتا۔ سفر جب بھی شروع ہوگا آج سے شروع ہوگا، نہ کہ گزرے ہوئے ''کل'' سے۔ جو لوگ آج کے دن بھی گزرے ہوئے کل میں جئیں ان کے لیے اس دنیا میں بربادی کے سوا اور کوئی چیز مقدر نہیں۔ جو مواقع گزر چکے انھیں بھول جائیے۔ جو مواقع آج موجود ہیں ان کو جانیے اور انہیں استعمال کیجیے، ان شاء اللہ، آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ یاد رکھیے، گزرا ہوا دن کبھی کسی کے لیے واپس نہیں آیا۔ گزرا ہوا دن آپ کے لیے بھی واپس آنے والا نہیں۔ (الرسالہ، جون 1985)

اسفارِ مدارس

زیر نظر باب کے مضامین مولانا وحید الدین خاں صاحب کے
سفرناموں سے منتخب کیے گئے ہیں۔

اعظم گڑھ کا سفر

ایک پروگرام کے تحت، اعظم گڑھ (یوپی) کا سفر ہوا۔ میرے سوا اِس سفر میں ہماری ٹیم کے پانچ افراد اور شریک تھے — مولانا محمد ذکوان ندوی، مسٹر رامش صدیقی، سعدیہ خان، نغمہ صدیقی، ڈاکٹر فریدہ خانم۔ ہم لوگ 29 دسمبر 2008 کی شام کو دہلی سے اعظم گڑھ گئے، اور 2 جنوری 2009 کو دہلی واپس آئے۔ یہ سفر دہلی اعظم گڑھ ایکسپریس کے ذریعے ہوا۔ دہلی سے ہم لوگ شام کو تقریباً آٹھ بجے روانہ ہوئے اور اگلے دن بارہ بجے اعظم گڑھ پہنچے۔

اعظم گڑھ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہاں ایک مسلم نواب تھے، اُن کا نام اعظم شاہ تھا۔ اُن کے نام پر تقریباً 1665ء میں شہر اعظم گڑھ بسایا گیا۔ نواب اعظم شاہ کی فیملی کے لوگ اب بھی شہر کے ایک حصے میں رہتے ہیں، جس کا نام سِدھاری ہے۔ میرے استاد مولانا نجم الدین اصلاحی (وفات 1994) اپنے آخری زمانے میں اِسی سدھاری کی مسجد میں رہتے تھے۔ مولانا نجم الدین اصلاحی کی دو کتابیں مشہور ہیں — یادگارِ سلف، مکتوباتِ شیخ الاسلام۔

اعظم گڑھ ریلوے اسٹیشن سے ہم لوگ دو بڑی کاروں کے ذریعے قافلے کی صورت میں شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں کئی ایسے مقامات آئے جن سے زمانہ ماضی کی کچھ یادیں تازہ ہوگئیں۔ مثلاً راستے میں سڑک کے کنارے ایک قدیم اسکول ہے جو مشن اسکول (قائم شدہ 1884) کے نام سے مشہور ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن کے زمانے میں ایک بار میں اِس اسکول کے سامنے سے گزرا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں طلبا کی بھیڑ ہے۔ وہ ایک کھڑکی کے سامنے لائن لگائے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں طلبا کو انعامات تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ خوش فہمی کے تحت میں بھی اِس لائن میں کھڑا ہو گیا۔ چلتے ہوئے جب میں ونڈو کے پاس پہنچا تو اندر بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا — آئڈنٹٹی کارڈ دکھاؤ۔ میں نے کہا کہ میرے پاس تو کوئی آئڈنٹٹی کارڈ نہیں۔ اِس کے بعد اُس نے مجھ کو ونڈو سے ہٹا دیا۔

اُس وقت تو میں نے سادگی کے تحت ایسا کیا تھا۔ بعد کو میں نے سوچا کہ ایسا ہی معاملہ آخرت میں پیش آنے والا ہے۔ وہاں بھی لوگوں کو خدا کے انعامات تقسیم کیے جائیں گے۔ بھیڑ کا ہر شخص چاہے گا کہ اس کو یہ خدائی انعام حاصل ہوجائے، اُس وقت ایسا ہوگا کہ کچھ لوگ جن کے پاس استحقاقی کارڈ ہوگا، اُن کو انعام تقسیم کرنے والے فرشتے مبارک باد دیتے ہوئے انعام عطا کریں گے اور بہت سے لوگ وہ ہوں گے جن کے ساتھ استحقاقی کارڈ موجود نہ ہوگا اور وہ اُس دن خدائی انعام کو پانے سے محروم رہ جائیں گے۔ یہ صرف خدا کو معلوم ہے کہ آخرت کے دن کون مستحق قرار پائے گا، اور کون ابدی طور پر استحقاق سے محروم ہو کر قابلِ رد قرار دے دیا جائے گا۔

آگے بڑھتے ہوئے ہم لوگ شبلی نیشنل کالج کے کیمپس میں داخل ہوئے۔ یہاں کالج کے گیسٹ ہاؤس میں میرے لیے اور میرے ساتھیوں کے لیے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ گیسٹ ہاؤس جدید طرز پر بنایا گیا ہے۔ اُس میں ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں۔ ہمارے میزبان نے بتایا کہ اِس گیسٹ ہاؤس کے کمروں کو رزرو کرنے کے لیے ہم اِس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر افتخار احمد کے پاس گئے۔ اُن کو جب میرا نام بتایا گیا تو انھوں نے کہا کہ اُن سے اور ان کی ٹیم سے کوئی کرایہ نہیں لیا جائے گا۔ جب تک وہ یہاں ہیں، وہ ہمارے مہمان ہیں۔ میزبان نے بتایا کہ گیسٹ ہاؤس کے اِن کمروں کا یومیہ کرایہ پندرہ ہزار روپئے ہے۔

اِس تعلیمی ادارے کو مولانا شبلی نعمانی (وفات 1914) نے 1883 میں قائم کیا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی خاندانی زمین اس کے لیے وقف کی تھی اور اس کے لیے اپنے رشتے داروں کو بھی راضی کیا تھا۔ پہلے یہ شبلی نیشنل اسکول کے طور پر قائم ہوا تھا۔ اب ترقی کرکے وہ ایک بڑے ڈگری کالج کی صورت اختیار کرچکا ہے۔ اِس وقت اُس کے تین بڑے شعبے ہیں — پرائمری اسکول، ہائی اسکول، ڈگری کالج۔ شبلی نیشنل کالج کے گیسٹ ہاؤس میں مولانا نظام الدین اصلاحی اور جامعۃ الفلاح (بلریا گنج) کے کئی اساتذہ ملاقات کے لیے آگئے۔ اُن سے دیر تک گفتگو ہوئی۔

اعظم گڑھ میں میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ان کے گھر باقی منزل کے ایک کمرے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اعظم گڑھ میں میری بیوی کی ایک سہیلی تھیں، اُن کا نام رضیہ تھا۔ رضیہ کے شوہر اور باپ دونوں وکیل تھے۔ معاشی اعتبار سے بظاہر اُن کا تعلق ایک آسودہ فیملی سے تھا۔

ایک دن میں کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ واپس آ کر جب میں باقی منزل میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں میری بیوی سابعہ خاتون (وفات 2006) بیٹھی ہوئی تھیں۔ داخل ہوتے ہی انہوں نے جو پہلی بات کہی، وہ یہ تھی کہ رضیہ کہتی ہیں کہ تمھارے شوہر کوئی معاشی کام نہیں کرتے۔ وہ اپنے بڑے بھائی کی کمائی پر رہتے ہیں۔ ان کی زندگی تو اِس طرح گزر جائے گی، لیکن اُن کے بعد تمھارا اور تمھارے بچوں کا کیا حال ہوگا۔ اُس وقت میری بیوی کمرے میں ایک چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور میں وہاں ان کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔ مجھے وہ الفاظ اب تک یاد ہیں جو میں نے اُس وقت کہا تھا۔ میں نے کہا کہ — رضیہ سے کہہ دو کہ یہ کشتی اپنے تمام سواروں سمیت بس اللہ کے حوالے ہے۔

یہ الفاظ جو اچانک میری زبان سے نکلے تھے، غالباً الہامی الفاظ تھے۔ میری بعد کی پوری زندگی اِن الفاظ کی تصدیق بن گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے کہ قرآن کے یہ الفاظ پوری طرح میری زندگی پر صادق آتے ہیں: وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ (65:3)۔ یعنی، اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے گا تو اللہ اس کے لیے کافی ہے۔

اعظم گڑھ میں جب میں شبلی نیشنل کالج کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا، اُس وقت مجھے اِس کالج سے متعلق ایک واقعہ یاد آیا۔ یہ واقعہ میری زندگی کا ایک بے حد سبق آموز واقعہ ہے۔

یہ 1966 کی بات ہے جب کہ میں اعظم گڑھ میں مقیم تھا اور انگریزی زبان اور انگریزی علوم کے حصول میں بہت زیادہ غرق تھا، اُس زمانے میں مجھے یہ احساس ہوا کہ میں جدید مغربی افکار کو سمجھوں۔ برطانیہ کا مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل (وفات 1970) کو مغربی فکر کا امام

سمجھا جاتا ہے۔ میں نے چاہا کہ میں برٹرینڈ رسل کی کتابوں کو پڑھوں۔ اس کی تلاش میں میں شبلی کالج کی لائبریری میں گیا۔ وہاں ایک الماری میں برٹرینڈ رسل کی کتابوں کا ایک سیٹ رکھا ہوا تھا۔ میں نے لائبریرین سے کہا کہ میں اِن کتابوں کو پڑھنا چاہتا ہوں۔ آپ بہ یک وقت اِن میں سے کتنی کتابیں مجھے دے سکتے ہیں۔ لائبریرین نے کہا کہ یہاں اِن کتابوں کو کوئی پڑھتا نہیں ہے، یہ صرف یہاں رکھی ہوئی ہیں۔ آپ پورا سیٹ لے جائیے۔ پڑھ کر واپس کر دیجیے گا۔

میں تمام کتابوں کو لے کر واپس اپنے گھر آ گیا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ اُس رائٹر کی کتابیں ہیں جو موجودہ زمانے میں سب سے بڑا ملحد (atheist) انسان سمجھا جاتا ہے۔ یہ سن کر میری بیوی متوحش ہوگئیں۔ انہوں نے کہا کہ اب آپ ضرور گم راہ ہو جائیں گے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ برٹرینڈ رسل اِس دور کا سخت ترین ملحد ہے۔ اِس لحاظ سے، اس کی تصنیفات کو پڑھنا عام ذوق کے مطابق، خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میں رسل کی دنیا میں داخل ہو کر اُس سے اِس طرح نکلا کہ میرا ایمان پہلے سے زیادہ پختہ ہو چکا تھا۔ برٹرینڈ رسل کی کتابوں کو پڑھ کر میں نے جو کچھ پایا، اُس کا مختصر ذکر میں نے اپنی کتاب "مذہب اور سائنس" میں کیا ہے۔ یہ کتاب اردو کے علاوہ، عربی اور انگریزی زبان میں بھی چھپ چکی ہے۔ میرے مذکورہ علمی تجربے کو اِس کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اپنی عمر کے ابتدائی دور میں جب میں اعظم گڑھ میں مقیم تھا تو اکثر میں دار المصنفین جایا کرتا تھا، جو میرے گھر سے بہت قریب تھا۔ یہ علمی ادارہ مولانا شبلی نعمانی نے اپنے آخری زمانے میں قائم کیا تھا۔ اِس ادارے سے میری دلچسپی کا سبب زیادہ تر ہوا کرتا تھا— اہلِ علم سے ملنا، اور یہاں کے کتب خانے سے استفادہ کرنا۔

اُس وقت مولانا مجیب اللہ ندوی (وفات 2006) یہاں بطور رفیق رہا کرتے تھے۔ ایک بار مولانا مجیب اللہ ندوی سے اِس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ آدمی کو کب لکھنے کا کام کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے استاد مولانا سید سلیمان ندوی (وفات 1953) سے یہ

سوال کیا تھا۔ انہوں نے اِس کا جواب اِن الفاظ میں دیا تھا— اتنا پڑھو، اتنا پڑھو کہ ابلنے لگے۔ اس کے بعد لکھو۔

اعظم گڑھ کے زمانۂ قیام میں میرا سارا وقت کتابوں کے مطالعے میں گزرتا تھا۔ اُس زمانے میں میرا حال یہ تھا کہ میں نہ صرف اپنے گھر پر یا لائبریریوں میں کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا، بلکہ راستہ چلتے ہوئے بھی میرے پاس کتاب ہوتی تھی اور دونوں ہاتھ میں لیے ہوئے میں اس کو پڑھتا رہتا تھا۔ میری عادت تھی کہ میں ہمیشہ ٹریفک اصول کے مطابق، بالکل بائیں طرف (extreme left) چلتا تھا۔ میری ماں زیب النسا (وفات 1985) کو معلوم ہوا کہ میں راستہ چلتے ہوئے کتاب پڑھتا ہوں تو انہوں نے کہا کہ یہ شخص ضرور ایک دن سڑک پر کسی سواری سے ٹکرا کر مرے گا۔

دارالمصنفین کا کتب خانہ مولانا شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی کوششوں سے قائم ہوا تھا۔ اِس کتب خانے میں قرآن کی عربی تفاسیر، حدیث کی کتابیں اور اسلامی تاریخ کے موضوع پر عربی زبان میں تقریباً تمام مستند کتابیں موجود تھیں۔ اِس طرح مجھے ایک ہی کتب خانے میں اسلام کے بنیادی موضوعات پر گہرے مطالعے کا موقع مل گیا۔

کارل مارکس (وفات 1883) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے اقتصادیات اور اُس کے متعلق موضوعات کا تفصیلی مطالعہ جرمنی کے کتب خانے میں کیا تھا۔ اُس زمانے میں اُس کے انہماک کا حال یہ تھا کہ صبح کو جب لائبریری کا دروازہ کھلتا تو کارل مارکس پہلا شخص تھا جو اُس کے اندر داخل ہوتا۔ اِسی طرح شام کو جب لائبریری کا دروازہ بند ہوتا تو کارل مارکس آخری شخص تھا جو اُس سے باہر نکلتا تھا۔ دارالمصنفین کے کتب خانے میں مطالعے کے دوران میرا بھی عرصہ دراز تک یہی حال رہا۔

دوپہر کے وقت لنچ (lunch) کے لیے کتب خانہ بند کیا جاتا تھا۔ میں نے وہاں کے لائبریرین سے کہہ دیا تھا کہ آپ باہر سے دروازہ بند کر کے چلے جائیں اور مجھ کو کتب خانے

کے اندر چھوڑ دیں۔ اُس زمانے میں مجھے دوپہر کے کھانے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ اِس بنا پر کبھی کبھی بھوک سے مجھے چکر آجاتا تھا۔ اُس زمانے کا ایک واقعہ میں نے اپنی کتاب ''تعبیر کی غلطی''، میں اِن الفاظ میں نقل کیا ہے:

''دار المصنفین (اعظم گڑھ) کے کتب خانے کا وسطی کمرہ ہے۔ چاروں طرف تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، علمِ کلام اور لغت کی ایک درجن سے زیادہ الماریاں دیواروں سے لگی ہوئی رکھی ہیں۔ ایک بجے دن کا وقت ہے۔ کتب خانے کے بیرونی دروازے بند ہو چکے ہیں اور تمام لوگ دوپہر کے وقفے میں اپنے اپنے ٹھکانوں کو جا چکے ہیں۔ مکمل تنہائی کا ماحول ہے۔ ایک طرف میں ہوں اور دوسری طرف کتابیں۔ مسلسل مطالعے کی وجہ سے اُس وقت میری کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے میرے سارے بدن کا خون نچوڑ لیا ہو۔ تفسیر ابن جریر کی ایک جلد دیکھ کر میں اٹھا کہ اُس کو الماری میں رکھ کر دوسری کتاب نکالوں، مگر اٹھا تو کمزوری کی وجہ سے مجھے چکر آ گیا اور میں سمت بھول گیا۔ یہ میرا مدت کا جانا پہچانا کمرہ ہے، مگر تھوڑی دیر تک میں وہاں اس طرح کھڑا رہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کدھر جاؤں اور کس الماری سے کتاب نکالوں۔ کچھ دیر کے بعد ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ کتابوں کی متعلقہ الماری فلاں سمت میں موجود ہے'' (صفحہ 14)۔

30 دسمبر 2008 کو میں اپنی ٹیم کے کچھ افراد کے ساتھ شبلی نیشنل کالج کے گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ جامعۃ الفلاح (بلریا گنج، اعظم گڑھ) کے کچھ اساتذہ، مولانا نظام الدین اصلاحی کے ہم راہ ملاقات کے لیے آئے۔ ان حضرات سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ پھر انھوں نے ہم لوگوں کو جامعۃ الفلاح آنے کی دعوت دی۔ میں نے اِس دعوت کو قبول کرلیا اور اِس کے مطابق، اگلے دن صبح کو مولانا نظام الدین اصلاحی کے ساتھ جامعۃ الفلاح کا سفر ہوا۔

جامعۃ الفلاح عربی اور دینی تعلیم کا ایک مشہور ادارہ ہے۔ جامعۃ الفلاح پہنچ کر اس کے مختلف شعبوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور یہاں اساتذہ اور طلبا سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اِس تعلیمی ادارے کا آغاز 1954 میں ایک معمولی مکتب سے ہوا تھا۔ اِس کے بعد حکیم محمد ایوب (وفات 2004) اور دوسرے اصحاب کی مسلسل کوشش سے وہ اب ایک بڑے جامعہ کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اِس وقت جامعہ کے دو بڑے حصے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ ایک حصے کا تعلق طلبا سے ہے، اور دوسرے حصے کا تعلق طالبات سے۔ دونوں میں عالمیت اور فضیلت تک تعلیم ہوتی ہے۔ طلبا کی مجموعی تعداد تقریباً چار ہزار ہے۔ طلبا کے مقابلے میں طالبات کی تعداد زیادہ ہے۔

جامعۃ الفلاح میں میرے دو خطابات ہوئے۔ ایک، طلبا کے درمیان اور دوسرا، طالبات کے درمیان۔ طلبا سے خطاب کا انتظام یہاں کے بڑے ہال میں کیا گیا تھا۔ طلبا اور اساتذہ دونوں یہاں موجود تھے اور پورا ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ طلبا کے سامنے خطاب کرتے ہوئے میں نے جو کچھ کہا، اُس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

میرے سامنے نوجوان طلبا بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا کہ جب میں نوجوانوں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل بھر آتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ خدا نے نوجوانوں کی شکل میں اپنی زمین پر کچھ پھول کھلائے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ یہ پھول مہکیں اور دنیا کو اپنی خوش بو سے معطر کردیں۔ میں نے کہا کہ اِس مدرسے کا نام الفلاح ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کسی مدرسے کا سب سے زیادہ درست نام ہے۔ کیوں کہ مدرسہ آدمی کو حقیقی فلاح کا راز بتاتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو سب سے پہلے شعوری طور پر یہ جاننا چاہیے کہ آپ نے یہاں آکر زندگی کا صحیح آغاز پالیا ہے۔ آپ نے یہاں آکر علم سے اپنی زندگی کا آغاز کیا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کا آغاز علم (اقرأ) سے ہوا ہے۔ جس آدمی نے زندگی کا صحیح آغاز پالیا، وہ ضرور اس کے صحیح

انجام تک پہنچے گا۔ اِسی حقیقت کو ایک مغربی مفکر نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے — میرے آغاز کار کا طریقہ شروع سے آغاز کرنا ہے:

My way is to begin from the beginning.

اِس موقع پر طلبا کی نسبت سے جو باتیں میں نے بتائیں، اُن میں سے ایک یہ تھی کہ حصولِ علم کے لیے روحِ تجسس (spirit of inquiry) لازمی طور پر ضروری ہے۔ آپ لوگوں کو اپنے اندر تجسس کی اسپرٹ نہایت گہرائی کے ساتھ پیدا کرنا چاہیے۔ پھر میں نے کہا کہ زندگی کی کامیابی کے لیے حضرت علی کا ایک قول بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ وہ قول یہ ہے — قِيمَةُ كُلِّ امْرِئٍ مَا يُحْسِنُهُ:

The value of a person lies in excellence.

اِس کے بعد کلّیۃ البنات میں جامعہ کی طالبات سے خطاب کرنے کا موقع ملا۔ یہ طالبات نہایت ڈسپلن کے ساتھ جامعہ کے ایک حصے میں بٹھائی گئی تھیں۔ میں نے اپنی تقریر میں ایک مغربی مفکر کے اِس قول کو دہرایا — ہر بڑے کام کے آغاز میں ایک عورت موجود ہوتی ہے:

There is a woman at the beginning of all great things.

اِس کی تفصیل کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ کا یہ مدرسہ آپ کو اِسی قسم کی عظیم خاتون بنانے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ تاریخ کی عظیم خاتون عائشہ صدیقہ تھیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ مدرسۂ نبوت کی ایک کامیاب طالبہ تھیں۔ تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے اندر اخذ (grasp) کی صلاحیت مَردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اُس کا ایک ثبوت حضرت عائشہ کی مثال ہے۔

صحیح البخاری کی روایت کے مطابق، حضرت عائشہ نے رسول اللہ ﷺ کی عام پالیسی کو بتاتے ہوئے کہا: مَا خُيِّرَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلَّا اخْتَارَ أَيْسَرَهُمَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6786)۔ یعنی، جب بھی رسول اللہ ﷺ کو دو امور کے درمیان اختیار دیا گیا تو آپ نے ہمیشہ آسان تر کا انتخاب کیا۔ یہاں قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ

رسول اللہ نے لفظی طور پر کبھی یہ بات نہیں کہی تھی۔ اِس کے باوجود عائشہ نے رسول اللہ کی پالیسی کے بارے میں اِس اہم اصول کو اخذ کیا۔ اِس قسم کی اخّاذیت کا ثبوت کسی مرد کے یہاں نہیں ملتا۔

میں نے کہا کہ انگریزی کا ایک مقولہ ہے — لیڈیز فرسٹ (ladies first)۔ اِس مقولے کی سب سے اعلیٰ مثال پیغمبرانہ تاریخ میں ہے، اور وہ حضرت ہاجرہ کی مثال ہے۔ یہ دراصل ہاجرہ کی عظیم قربانی تھی جس کے ذریعے ہیروؤں کی وہ نسل (nation of heroes) ظہور میں آئی جس میں رسول اور اصحابِ رسول جیسے اعلیٰ افراد پیدا ہوئے۔ یہ ایک عظیم تاریخی عمل (process) تھا جس کا آغاز ایک عورت کی بے مثال قربانی سے ہوا۔

میں نے کہا کہ ہر عورت کے لیے اِس دنیا میں ایک بڑا رول مقدر ہوتا ہے۔ اِس رول کو ادا کرنے کی صرف ایک خاص شرط ہے، اور وہ ہے اپنے آپ کو ڈسٹریکشن (distraction) سے بچانا۔ ہر وہ چیز جو آپ کو اپنے مقصدِ اعلیٰ کی طرف کامل توجہ دینے سے ہٹائے، وہ ڈسٹریکشن کا ذریعہ ہے۔ مثلاً شاپنگ، آؤٹنگ، فیشن، تقریبات اور اولاد، وغیرہ۔ اسلام کے مطابق، اولاد ایک آزمائش (التّغابن، 64:15) ہے۔ اولاد کے بارے میں والدین کی ذمے داری اُن کی حقیقی ضرورت کو پورا کرنا ہے، نہ کہ اُن کو قلبی محبت کا مرکز بنانا۔ قلبی محبت کا مرکز صرف خداوندِ ذوالجلال ہے، نہ کہ اولاد۔

ہر انسان کے اندر پلس پوائنٹ کے ساتھ ایک مائنس پوائنٹ ہوتا ہے۔ یہی معاملہ عورت کا ہے۔ عورت کے اندر پلس پوائنٹ کے ساتھ ایک مائنس پوائنٹ موجود ہے، اور وہ اُس کا آرائش پسندانہ مزاج ہے۔ عورت کو اپنی اِس کمزوری کے بارے میں شعوری طور پر زیادہ بیدار رہنا چاہیے۔ ورنہ ایسا ہوگا کہ عورت کے اوپر اُس کا آرائش پسندانہ مزاج غالب آجائے گا اور وہ زندگی میں اپنا تعمیری رول ادا کرنے سے قاصر رہے گی۔

جامعۃ الفلاح کے پروگرام میں شرکت کے بعد ہم لوگ بذریعہ کار بڈھریا گئے۔ اعظم

گڑھ شہر سے بڈھریا کا فاصلہ 27 کلومیٹر ہے۔ بڈھریا میرا آبائی وطن ہے۔ راستے میں سڑک کے کنارے چند مقامات آئے۔ اُن میں سے ایک پھریہا تھا۔ پھریہا اعظم گڑھ کا وہ گاؤں ہے جہاں 1863 میں مشہور مفسر قرآن مولانا حمید الدین پیدا ہوئے۔ مولانا حمید الدین نے پھریہا کی تعریب کر کے اُس کو فراہا بنایا اور پھر اس میں یائے نسبت شامل کر کے اپنے نام کے ساتھ فراہی لکھنا شروع کیا۔ تعریب کا یہ ذوق اِس علاقے میں کافی بڑھا اور کئی گاؤں کے لوگوں نے اس کی تقلید کی۔ مثلاً سیدھا کے لوگ اپنے کو مستقیمی لکھنے لگے۔ چھاؤں کے لوگ اپنے کو ظلّی لکھنے لگے۔ اَساڑھا کے لوگ مطری لکھنے لگے، وغیرہ۔

مولانا حمید الدین فراہی کا انتقال 1930 میں ہوا۔ میں نے اُن کو دیکھا نہیں۔ لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے دو خاص شاگردوں سے مجھے حصول علم کا موقع ملا— مولانا امین احسن اصلاحی (وفات 1998)، اور مولانا اختر احسن اصلاحی (وفات 1985)۔ مولانا حمید الدین فراہی کے بارے میں کئی لوگوں نے اُن کے مختصر تذکرے شائع کیے ہیں۔ مثلاً سید سلیمان ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی، وغیرہ۔ لیکن مولانا حمید الدین فراہی پر زیادہ جامع کتاب ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی (مقیم اسلام آباد، پاکستان) نے ''ذکرِ فراہی'' کے نام سے شائع کی ہے۔ یہ کتاب 840 صفحات پر مشتمل ہے۔ اِس کتاب کی تیاری میں تقریباً 18 سال صرف ہوئے ہیں۔ میرے پاس کتاب کا وہ نسخہ ہے جو 2001 میں دائرۂ حمیدیہ (مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ) سے شائع ہوا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اِس کتاب کا ایک ایڈیشن دار التذکیر (لاہور) نے شائع کیا ہے۔ اِس میں مصنف نے کچھ اضافے بھی کیے ہیں۔

پھریہا کا گاؤں ایک سڑک کے کنارے واقع ہے۔ یہ سڑک انگریزوں کے زمانے میں بنائی گئی تھی۔ لیکن پھریہا سے ہمارے گاؤں تک پختہ سڑک نہ تھی۔ اب یہاں اچھی سڑک بن گئی ہے۔ ہماری گاڑی اِس سڑک پر گزرتے ہوئے وہاں پہنچی جہاں کُنور ندی واقع ہے۔ یہ ندی ہمارے گاؤں کی سرحد پر ہے۔ اِس ندی کے اوپر ایک پُل ہے۔ اُس زمانے میں یہ پل

میرے لیے غارِ حرا کی مانند بن گیا۔ میں صبح وشام یہاں آتا اور پل کی فصیل پر بیٹھ کر سورج کے نکلنے اور سورج کے ڈوبنے کا منظر دیکھتا رہتا۔ پل کے نیچے دریا بہہ رہا ہوتا تھا۔ چاروں طرف دور تک درخت اور کھیت کے سرسبز مناظر تھے جن کے اوپر چڑیاں اڑتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اوپر نیلے آسمان کا پُرشکوہ منظر ہوتا تھا۔ یہاں میں دیر تک اکیلا بیٹھا رہتا تھا اور فطرت کے مناظر میں کھویا ہوا اُس کو دیکھتا رہتا تھا۔ یہ پل گویا کہ میرے لیے تلاشِ حق کے طویل سفر کا ایک ابتدائی مرحلہ تھا۔ فطرت کی یہ دنیا میرے لیے ایک کھلی تربیت گاہ کے ہم معنی بن گئی۔

کنور ندی کے اِس پل سے آگے بڑھ کر ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے ہمارے سامنے وہ اسکول تھا جس کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے مجھے بلایا گیا تھا۔ ہمارے گاؤں میں تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے ڈاکٹر عبد العلی کے خاندان نے ”درس گاہِ اسلامی“ کے نام سے ایک مکتب قائم کیا تھا۔ اس میں اب کافی توسیع ہو چکی ہے۔ میری ابتدائی تعلیم اِسی درس گاہ میں ہوئی۔ میرے بچپن کے زمانے میں یہاں مولانا فیض الرحمن اصلاحی (وفات 1972) اُس کے معلم تھے۔ وہ مدرسۃ الاصلاح کے بانی مولانا محمد شفیع (وفات 1945) کے صاحب زادے تھے۔ اُن سے میں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اِس کے بعد میرے چچا صوفی عبد المجید خاں (وفات 1949) نے مزید تعلیم کے لیے مجھے مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڑھ) میں داخل کرایا۔

بڈھریا میرا مسقطِ رأس (birth place) ہے۔ یکم جنوری 1925 کو جب کہ میں پیدا ہوا، اُس وقت بڈھریا صرف ایک دور افتادہ (remote) معمولی گاؤں تھا۔ سیاسی سرگرمیاں یا تمدنی ترقیاں ابھی تک یہاں نہیں پہنچی تھیں۔ میری ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں ہوئی۔ یہاں میرے استاذ مولانا فیض الرحمن اصلاحی تھے۔ میرے بچپن اور جوانی کی پوری عمر اِسی ماحول میں گزری۔

میری زندگی کا سب سے انوکھا واقعہ یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں کس طرح دعوت الی

اللہ میرا مشن بن گیا۔ اُس وقت میرے خاندان میں زیادہ تر شعر وشاعری کا ماحول تھا۔ ہم لوگ اکثر بیت بازی کیا کرتے تھے۔ 1938 میں میرے چچا صوفی عبد المجید خاں نے مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) میں میرا داخلہ کرایا تو یہاں بھی کوئی شہری ماحول نہ تھا۔ مدرسے کا تعلیمی ماحول بھی تمام تر نظمِ قرآن کے مخصوص فراہی فکر پر مبنی تھا۔ اِس پوری مدت میں کہیں بھی میں نے یہ بات نہیں سنی کہ غیر مسلموں کے درمیان دعوتی کام کرنا لازمی طور پر مسلمانوں کی شرعی ذمے داری ہے۔ مدرسے میں اور مدرسے کے باہر میں نے اسلامیات کا جو مطالعہ کیا، اُس میں بھی دعوت کا یہ تصور حذف تھا۔ قرآن کی تفسیروں میں سے کوئی بھی تفسیر دعوت الی اللہ کے تصور کے تحت نہیں لکھی گئی۔ حدیث کے مجموعوں میں جو تراجمِ ابواب ہیں، اُن میں سے کسی بھی کتاب میں دعوت کو ترجمہ باب نہیں بنایا گیا ہے۔ فقہ کے موضوع پر بہت زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن میں بھی سیاسی اور غزواتی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ مسلم تاریخ میں جو بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن میں بھی سارے ابواب ہیں، مگر اُس میں دعوت کا باب موجود نہیں۔ مثلاً الغزالی، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ دہلوی، وغیرہ کی کتابیں۔ ایسی حالت میں یہ ایک انتہائی انوکھی بات ہے کہ کس طرح بعد کے دور میں دعوت الی اللہ میری زندگی کا واحد مشن بن گیا۔

اسی طرح میری زندگی کا ایک انوکھا پہلو یہ ہے کہ میرے زمانے میں، مسلم دنیا میں ہر طرف، ادبی ذہن چھایا ہوا تھا۔ ادب اور شاعری کا اسلوب غالب اسلوب کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ ذہن اتنا زیادہ عام تھا کہ اِس معاملے میں مسلمانوں کے روایتی طبقہ اور انگریزی داں طبقہ کے درمیان کوئی فرق موجود نہ تھا۔ مسلمانوں کا یہ عمومی ذہن آج تک بدستور قائم ہے۔ ایسی حالت میں یہ انتہائی عجیب بات ہے کہ اِس معاملے میں کس طرح میں پوری مسلم ملت میں ایک واحد استثنا بن گیا۔ میرے اندر سائنٹفک تھنکنگ پیدا ہوئی۔ میں نے حوصلہ شکن ماحول میں انگریزی زبان سیکھی۔ میں نے جدید علوم کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اور یہ سب کچھ صرف اِس لیے تھا کہ میں عصری ذہن کے سامنے اسلام کی دعوت کو موثر انداز میں پیش کرسکوں، حتی کہ عصری

اسلوب میں اسلامی لٹریچر تیار کرنا ہی میرا اصل موضوع بن گیا۔

میرے ساتھ یہ جو استثنائی معاملہ پیش آیا، اُس پر جب میں غور کرتا ہوں تو اِس کی کوئی بھی توجیہ اِس کے سوا سمجھ میں نہیں آتی کہ اُس کو قرآن کے الفاظ میں اجتباء (انتخاب) کا ایک معاملہ سمجھا جائے۔ اجتباء کے لفظی معنیٰ ہیں — چن لینا (to choose)۔ اجتباء کے بارے میں قرآن کا تصور یہ ہے کہ خدا، دعوت الی اللہ کے مقصد کے لیے کسی انسان کو چن لیتا ہے، پھر اُس کے لیے ایسے اسباب فراہم کیے جاتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے میں دعوت الی اللہ کے کام کو مطلوب انداز میں کر سکے۔ دعوت کا کام کوئی سادہ کام نہیں۔ یہ موجودہ دنیا میں خدا کی نمائندگی کا کام ہے۔ اِس قسم کی نمائندگی بلاشبہ اِس دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ یہ کام صرف وہی انسان کر سکتا ہے جس کو خداوندِ ذوالجلال کی خصوصی نصرت اور توفیق حاصل ہوئی ہو۔

اجتباء کا لفظ مختلف صورتوں میں قرآن میں 10 بار استعمال ہوا ہے۔ امام راغب الاصفہانی (وفات 1108ء) نے لکھا ہے کہ قرآن کے مطابق، اجتباء کا معاملہ پیغمبر اور غیر پیغمبر دونوں کے ساتھ پیش آتا ہے (مفردات القرآن، صفحہ 87)۔ اجتباء کے اِس معاملے کا تعلق صُلحاء اور اَتقیاء سے نہیں ہے۔ اُن کا معاملہ ایک مختلف معاملہ ہے۔ اجتباء کا تعلق دراصل اُس مخصوص عمل سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت قرار دیا ہے (الحج، 22:40) یعنی دعوت الی اللہ کا عمل۔

میری شخصیت کا ارتقا جو بڈھریا اور سرائے میر اور اعظم گڑھ جیسے ماحول میں ہوا، وہ اتنا زیادہ انوکھا ہے کہ بظاہر اس کو اجتباء کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مدرسۃ الاصلاح کے ذمے داروں کو معلوم ہوا کہ میں اعظم گڑھ آرہا ہوں تو انھوں نے ٹیلی فون کے ذریعے مولانا محمد ذکوان ندوی سے ربط قائم کیا۔ اس کے بعد مدرسۃ الاصلاح کا ایک پروگرام بنا۔ پروگرام کے مطابق، مدرسۃ الاصلاح کے دو اساتذہ مولانا انیس احمد اصلاحی، مولانا سرفراز احمد ندوی بڈھریا آئے۔ ان کے ساتھ 31 دسمبر 2008 کی شام کو

مدرسۃ الاصلاح کا سفر ہوا۔ ہمارے ساتھ سی پی ایس انٹرنیشنل کی ٹیم کے افراد بھی شامل تھے۔

مدرسۃ الاصلاح 1908 میں قائم ہوا۔ اِس علاقے کے ایک مسلم زمین دار نے مدرسے کے لیے ایک بڑی زمین وقف کردی۔ اِسی زمین پر مدرسۃ الاصلاح کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانی مولانا محمد شفیع (وفات 1945) تھے، جو ایک قریبی گاؤں سیدھا سلطان پور کے رہنے والے تھے۔ مولانا اقبال احمد خاں سہیل کے تذکرے کے تحت بتایا گیا ہے کہ ابتدائی دور میں اُن کی عربی اور فارسی تعلیم کے لیے مولانا محمد شفیع صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ میری براہِ راست ملاقات مولانا محمد شفیع صاحب سے نہیں ہوئی، البتہ میں اُن کے صاحب زادگان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اُن سے میرے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی، مولانا عبد الرحمن پرواز اصلاحی، وغیرہ۔ مدرسۃ الاصلاح کے تعارف نامے میں بتایا گیا ہے کہ — مولانا شبلی نعمانی نے اس کے ابتدائی اَغراض ومقاصد اور طریقۂ کار کا اجمالی خاکہ تیار کیا۔ مولانا حمید الدین فراہی نے اس کے ابتدائی دور سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحے تک بحیثیت ناظم مدرسۃ الاصلاح کی خدمت کی۔ مولانا فراہی نے اس کے اغراض ومقاصد کی تکمیل کی اور اس کے لیے نصاب تعلیم مقرر کیا۔

مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہونے کے بعد ایک شخص جو پہلی چیز محسوس کرتا ہے، وہ یہاں کی سادگی ہے۔ ہم لوگ مدرسے کے مختلف حصوں میں گئے۔ ہر جگہ ہم نے نمایاں طور پر جو چیز دیکھی، وہ اس کی سادگی تھی۔ یہاں کے لوگ بھی سادہ اور متواضع نظر آئے۔ مدرسۃ الاصلاح کا یہ ماحول غالباً اُس کے بانیوں کے تصور کی بنا پر ہے۔ یہ روایت وہاں اب تک باقی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کو یہاں کی سادگی سب سے زیادہ پسند تھی، اور انھوں نے اس کو قائم رکھنے کی سخت تاکید کی تھی۔ مولانا حمید الدین فراہی اُس زمانے میں دار العلوم حیدر آباد میں پرنسپل تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے اُن کو مدرسۃ الاصلاح کے متعلق اپنے ایک خط مورخہ 19 اپریل 1910 میں لکھا کہ — ” کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسے میں قیام کرسکتے ہو۔ میں بھی

شاید آؤں۔ اُس کا نظم ونسق درست کر دیا جائے۔ اُس کو گروُکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی، قناعت اور مذہبی خدمت اس کا مطمحِ زندگی ہو" (مکاتیبِ شبلی، جلد 2، صفحہ 33)۔

مجھ کو 1938 میں مدرسۃ الاصلاح میں داخل کیا گیا۔ اُس وقت یہ مدرسہ چند چھوٹی عمارتوں پر مشتمل تھا۔ اب وہاں کئی بڑی بڑی عمارتیں بن گئی ہیں۔ مثلاً اُس وقت یہاں کا کتب خانہ (دارالمعلومات) صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ اب یہاں کتب خانے کے لیے ایک مستقل عمارت بن گئی ہے جس میں کتب خانہ قائم ہے۔

اِس دارالمعلومات سے میری کئی یادیں وابستہ ہیں۔ یہاں میں تقریباً روزانہ آتا تھا اور کتابوں اور جرائد کا مطالعہ کرتا تھا۔ اُس وقت یہاں مصر کا ایک عربی جریدہ آتا تھا۔ اُس کا نام "المقتطَف" تھا۔ اُس میں ایک بار ایک دل چسپ چیز چھپی تھی۔ اُس میں ایک عمل بتایا گیا تھا جس کے مطابق، آدمی اپنے مستقبل کے بارے میں جان سکتا تھا۔ وہ عمل یہ تھا کہ مخصوص تعداد میں "ابراکادابیسن کاتن" کہو۔ اس کے بعد ایک خاص عمل کرکے اپنا نتیجہ نکالو۔ اُس وقت امتحان کا زمانہ تھا اور جلد ہی مجھے سالانہ امتحان دینا تھا۔ میں نے مذکورہ عمل کو دہرایا۔ اُس کے بعد اِن الفاظ میں نتیجہ نکلا: سَتَنْجَحُ نَجَاحًا کَبِيرًا (تم جلد ہی ایک بڑی کامیابی حاصل کروگے)۔ اِس کے بعد امتحان ہوا تو میں اپنے درجے میں فرسٹ آیا۔ یہ صرف ایک اتفاق تھا، ورنہ کسی بھی عمل کے ذریعے مستقبل کو جاننا ممکن نہیں۔

31 دسمبر 2008 کو مغرب کی نماز کے بعد مدرسے کی وسیع مسجد میں طلبا اور اساتذہ کا ایک اجتماع ہوا۔ اِس موقع پر مجھے خطاب کے لیے یہ عنوان دیا گیا تھا— عصرِ جدید اور نوجوانوں کی ذمے داریاں۔ اِس موضوع پر میں نے تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کی۔ میں نے اپنی تقریر میں جو باتیں کہیں، اُن میں سے ایک بات یہ تھی کہ دورِ جدید کو معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ دورِ جدید کے ذہن کو معلوم کیا جائے۔ اِس معاملے میں علامہ

الشاطبی نے اپنی کتاب میں درست طور پر لکھا ہے کہ استدلال نام ہے فریقِ ثانی کے مسلّمۂ عقلی پر اس کو ایڈریس کرنے کا (الموافقات للشاطبی، جلد 5، صفحہ 415)۔ اِس لیے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آج کے انسان کو موثر طور پر اسلام کا پیغام پہنچائیں تو آپ کو سب سے پہلے یہ جاننا ہوگا کہ آج کے انسان کا طرزِ فکر کیا ہے اور کون سا طرزِ استدلال اس کے لیے قابلِ قبول استدلال بن سکتا ہے۔

مدرسۃ الاصلاح کے زمانہ قیام کی بہت سی یادیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اِس سفرنامے کے ذیل میں اُن میں سے کچھ کا تذکرہ کر دیا جائے۔ گاؤں کے مدرسے میں میرے استاد مولانا فیض الرحمن اصلاحی تھے۔ میں نے اِسی مدرسے میں عربی اور فارسی کی تعلیم شروع کر دی تھی۔ اسی زمانے میں میں نے عربی کی کئی کتابیں پڑھیں۔ مثلاً کتاب النحو، کتاب الصرف (مولانا عبد الرحمن، امرت سری)۔ اِسی طرح میں نے یہاں فارسی کی کئی کتابیں پڑھیں۔ مثلاً گلستاں اور بوستاں (شیخ سعدی شیرازی)۔ اُس زمانے میں یہ سب کتابیں مجھ کو ایک معمّہ کی طرح نظر آتی تھیں۔ اُس زمانے میں میرے اندر نہ عربی کا کوئی ذوق پیدا ہوا تھا اور نہ فارسی کا کوئی ذوق۔

1938 میں مجھے مدرسۃ الاصلاح میں داخل کرایا گیا۔ یہاں میں نے دوبارہ عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کیا۔ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے کہ میں اندھیرے سے نکل کر اجالے میں آ گیا ہوں۔ اب ہر مضمون میری سمجھ میں آنے لگا، یہاں تک کہ میں امتحانات میں اچھے نمبر سے پاس ہونے لگا۔

اِس ذاتی تجربے سے میں نے یہ جانا کہ تعلیم کے لیے ایک پورا ماحول درکار ہوتا ہے۔ عربی علوم کی تعلیم کے لیے مدرسے کا ماحول ضروری ہے۔ اِسی طرح انگریزی علوم کی تعلیم کے لیے کالج اور یونی ورسٹی کا ماحول ضروری ہے۔ انفرادی طور پر پڑھنے سے نہ کسی کو عربی علوم میں درک حاصل ہوسکتا ہے اور نہ انگریزی علوم میں۔ اِس عموم میں استثنا ہوسکتا ہے، لیکن ایسا استثنا صرف ایک نادر استثنا (rare exception) ہے۔

میرے زمانہ تعلیم میں مولانا امین احسن اصلاحی (وفات 1998) مدرسۃ الاصلاح کے

صدر مدرس تھے۔ میرے تجربے کے مطابق، مولانا موصوف ایک بہترین مدرس تھے۔ وہ اگر مدرسے میں مستقل قیام کرتے تو وہ زیادہ بڑا کام کرسکتے تھے۔ تقسیم ملک (1947) کے وقت وہ پاکستان چلے گئے اور وہیں اُن کا انتقال ہوگیا۔ میرے نزدیک، مولانا موصوف کا مدرسۃ الاصلاح چھوڑ کر پاکستان جانا کوئی درست فیصلہ نہ تھا۔ اگر وہ آخر وقت تک مدرسے میں قیام کرتے تو وہ تعمیرِ افراد کی صورت میں ملت کو زیادہ بڑا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے اندر ایک خاص صفت تھی جو میں نے اپنے تجربے میں کسی اور استاد کے اندر نہیں پائی، وہ ہے تدریس کے دوران ذہنی تربیت کی غذا دیتے رہنا۔ اِس نوعیت کا ایک نمایاں واقعہ وہ ہے، جو اونٹ کے سم کے حوالے سے زیرِ نظر کتاب کے ایک باب ''اسلامی تعلیم'' میں نقل کیا گیا ہے۔ مدرسے کا یہ واقعہ میرے لیے اتنا موثر ثابت ہوا کہ یہ میرا عمومی مزاج بن گیا کہ میں ہر معاملے میں اپنی ناواقفیت کو جانوں، تاکہ میں اس کو واقفیت بنا سکوں۔ علمی تلاش کا یہ جذبہ مجھے ابتداءً مدرسہ سے ملا تھا۔ بعد کو میں نے اس موضوع پر مغربی مصنفین کی کچھ کتابیں پڑھیں، مثلاً اسپرٹ آف انکوائری (Spirit of Inquiry)۔ ان سے معلوم ہوا کہ تجسس کا یہی جذبہ تمام علمی ترقیوں کی اصل بنیاد ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سائنسی دریافتوں کا آغاز شبہات (doubts) سے ہوا۔ سائنس داں ایک واقعے کو دیکھتا ہے، پھر اس کے اندر ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ وہ اس کی تحقیق میں لگ جاتا ہے۔ آخرکار وہ ایک ایسی حقیقت کو دریافت (discover) کرتا ہے جو اِس سے پہلے اس کو معلوم نہ تھی۔ برٹرینڈ رسل کی کتاب وِل ٹو ڈاؤٹ (Will to Doubt) خاص اِسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔

اِس معاملے کی ایک مثال بھاپ کی طاقت (steam power) کی دریافت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ برٹش سائنس داں جارج اسٹفنسن (George Stephenson, 1781-1848) ایک دن اپنے گھر پر تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اس کے گھر والے ایک برتن

میں پانی گرم کررہے ہیں۔ جب اُس کا درجہ حرات ایک خاص نقطے پر پہنچا تو اندر سے اُبال آیا اور برتن کے اوپر رکھا ہوا ڈھکن اٹھ گیا۔ اُس کو دیکھ کر جارج اسٹفنسن اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے جاننا چاہا کہ برتن میں ابال کیوں آیا اور ڈھکن اوپر کیوں اٹھ گیا۔

اِس پر غور کرتے ہوئے وہ اِس دریافت تک پہنچا کہ پانی کا درجۂ حرارت جب 100 ڈگری سے زیادہ ہوجاتا ہے تو پانی کے سالمات (molecules) ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اس کے ایٹم (atoms) منتشر ہونے لگتے ہیں۔ اِس ایٹمی انتشار (atomic disintegration) سے جو طاقت پیدا ہوتی ہے، اس کا نام اسٹیم پاور (steam power) ہے۔ جارج اسٹفنسن نے اِس اسٹیم پاور کو دریافت کرکے اس کو انجن میں استعمال کیا اور اس طرح اس نے پہلی بار 1814 میں ایک دخانی انجن (locomotive) کو چلایا۔

دینی مدارس میں عام طور پر تقدس (holiness) کا مزاج چھایا ہوا ہوتا ہے۔ جہاں تقدس آیا، وہاں پُراسراریت آ گئی۔ اِس ماحول میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگ چیزوں کو مقدس سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اُن پر مزید غور وفکر کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اِس طرح تقدس کا مزاج فکری ارتقا کے لیے قاتل بن جاتا ہے۔ فکری ارتقا کا آغاز شبہ (doubt) سے ہوتا ہے۔ شبہ سے آغاز کرکے آدمی حقیقت کی شعوری دریافت تک پہنچتا ہے۔ جہاں شبہ کو عیب سمجھ لیا جائے، وہاں ذہنی ارتقا کا آغاز بھی نہیں ہوگا۔ (اس حقیقت کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنے کے لیے دیکھیے مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتاب، اسلام دورِ جدید کا خالق)۔

مدرسۃ الاصلاح ریلوے لائن کے قریب واقع ہے۔ اس علاقے میں یہ ریلوے لائن برٹش دور میں 1901 میں بچھائی گئی تھی۔ میرے ایک استاد مولانا نور الہدی اصلاحی (وفات 1972) تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ ہماری کلاس چل رہی ہے۔ اِس دوران ریلوے اسٹیشن سے انجن کی سیٹی کی آواز آئی اور پھر مخصوص آواز کے ساتھ ٹرین چلنے لگی۔ اُس وقت مولانا نور الہدی اصلاحی اپنا یہ شعر پڑھتے تھے:

رِل گڑی، رِل گڑی، رِل گڑی پُو سے سیٹی دیا اور پھر چل پڑی

اُس زمانے کا جو ماحول تھا، اُس کی یہ ایک مثال ہے۔ اپنی نوجوانی کی عمر میں، میں ریلوے کے بارے میں اِس سے زیادہ اور کچھ نہ جان سکا۔ بعد کو میں نے جواہر لال نہرو (وفات 1969) کی کتاب خودنوشت (Autobiography) پڑھی۔ اُس میں مصنف نے لکھا تھا کہ انگریزوں نے انڈیا میں جو ریلوے لائن بچھائی ہے، وہ ریلوے نہیں ہے، بلکہ یہ لوہے کی زنجیریں ہیں۔ ان کو انگریزوں نے انڈیا کو اپنی غلامی میں جکڑنے کے لیے بچھایا ہے۔

آزادی سے پہلے کے دور میں، میں ریلوے کے بارے میں اتنا ہی جان سکا تھا۔ اُس زمانے میں ہر طرف اِسی قسم کی منفی باتیں چھائی ہوئی تھیں جو دوسروں کی طرح میرے ذہن کی بھی کنڈیشننگ کررہی تھیں۔ بعد کو جب میں نے براہِ راست طور پر چیزوں کا مطالعہ کیا تو میں نے ذاتی دریافت کے ذریعے یہ جانا کہ برٹش جو نوآبادیاتی نظام کے تحت انڈیا میں آئے، وہ ایک تاریخی عمل کا جز تھے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، انڈیا میں اُن کا آنا جدید سائنس اور انگریزی زبان کا انڈیا میں آنا تھا۔ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب (The Discovery of India) میں لکھا ہے کہ عرب جو ہندستان میں آئے، وہ یہاں ایک شان دار کلچر (brilliant culture) لے کر آئے۔ اِسی طرح برٹش جو انڈیا میں آئے، وہ انڈیا میں ایک شان دار سائنس لے کر آئے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اُن کا انڈیا میں آنا تاریخ کا ایک مثبت واقعہ تھا، نہ کہ معروف معنوں میں کوئی منفی واقعہ۔

انڈیا میں جو بڑے بڑے عربی مدارس ہیں، اُن سب میں مشترک طور پر ایک نقص پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ یہ تمام مدارس، تعلیم برائے مسلک کے اصول پر قائم کیے گئے ہیں۔ جب کہ صحیح یہ ہے کہ مدارس کو تعلیم برائے تعلیم کے اصول پر قائم کیا جائے۔ ہر مدرسے کا اپنا ایک مسلک ہے اور یہی مسلک اس کی تمام تعلیمی سرگرمیوں میں چھایا رہتا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کا اِس معاملے میں کوئی استثنا نہیں۔ مدرسۃ الاصلاح کا مسلک مولانا حمید الدین فراہی کے تصورِ نظمِ قرآن پر قائم ہے۔ نظم قرآن کی الگ سے جو بھی حیثیت ہو، لیکن اس کو مدرسے کا مسلک قرار دینا ہرگز درست نہیں۔

اہلِ علم عام طور پر یہ شکایت کرتے ہیں کہ مدارس میں تعلیم پائے ہوئے افراد کے اندر عام طور پر تعصب اور کٹرپن کا مزاج ہوتا ہے، جب کہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں تعلیم پائے ہوئے افراد کے اندر عام طور پر تعصب اور کٹرپن کا مزاج نہیں ہوتا۔ اِس کا سبب یہی ہے کہ مدارس میں ''تعلیم برائے مسلک'' کا اصول رائج ہے، جب کہ سیکولر ادارے 'تعلیم برائے تعلیم'' کے اصول پر چلائے جاتے ہیں۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ ''تعلیم برائے مسلک'' کا ایک بہت بڑا نقصان ہے، وہ یہ کہ اِن اداروں میں آزادانہ تفکیر کا ماحول نہیں ہوتا۔ اور آزادانہ تفکیر کا خاتمہ ہمیشہ ایک بھاری قیمت پر ہوتا ہے، وہ یہ کہ ایسے ماحول میں تخلیقی فکر (creative thinking) ختم ہوجاتی ہے۔ تخلیقی فکر کا نشوونما نہ پانا اتنا بڑا نقصان ہے جس کی تلافی کسی بھی دوسری چیز سے ممکن نہیں۔

مدرسۃ الاصلاح سے رات ہی کو ہم لوگ بڈھریا واپس آئے، جو تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہم نے بڈھریا میں رات گزاری۔ یکم جنوری 2009 کی صبح کو ہم لوگ قافلے کی صورت میں چھاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ چھاؤں میں ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور یہاں کئی گھنٹے قیام کیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر احمد صفی انصاری کے ساتھ ہم لوگ اعظم گڑھ ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ واپسی میں ہماری گاڑی بارہ گھنٹے لیٹ تھی۔ یہ تاخیر کہر (fog) کی وجہ سے ہوئی تھی۔ دوبارہ ہم لوگ اسٹیشن پہنچے تو گاڑی آچکی تھی۔ ہم لوگ گاڑی پر سوار ہوگئے۔ اعظم گڑھ اسٹیشن سے ہم دہلی کے لیے روانہ ہوئے تو رات کے تقریباً بارہ بج چکے تھے۔ یہ رات کا وقت تھا، اِس لیے زیادہ وقت سونے میں گزرا۔ اگلے دن 2 جنوری 2009 کو رات ایک بجے ہم لوگ دہلی پہنچے۔
(الرسالہ، مئی 2009)

دارالعلوم دیوبند کا سفر

صحیح آغاز اور استقلال — اسی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

دیوبند بظاہر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔(تادم تحریر) ساٹھ کرور انسانوں کے اس عظیم ملک میں جس کا رقبہ تقریباً 12 لاکھ میل ہے۔ دیوبند جیسے چھوٹے قصبہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ مگر تاریخ اور انسانی عمل جغرافیائی حقیقتوں کا پابند نہیں ہوتا۔ پہلے سو سال کے اندر اس چھوٹے سے قصبہ میں وہ تاریخ بنی جس نے پورے ہندستان پر اثر ڈالا ہے اور شاید آج کے مسلمانوں کا تو سب سے بڑا سرمایہ وہی ہے جو اس قصبہ کے اندر دفن ہے۔

النادی الادبی (دارالعلوم دیوبند) کی دعوت پر دیوبند کا چند روزہ سفر ہوا۔ 2 ستمبر 1971 کی دوپہر کو میں وہاں پہنچا اور 5 ستمبر کی شام کو دہلی واپسی ہوئی۔

2 ستمبر کی شام کو النادی الادبی کا سالانہ اجتماع تھا۔ یہ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کی عربی مجلس ہے، جو عربی تحریر وتقریر کی مشق کے لیے قائم کی گئی ہے۔ یہ اس تعمیری طریقِ کار کا ایک اچھا نمونہ ہے، جس کی ترغیب ہفت روزہ الجمعیۃ مسلسل دیتا رہتا ہے۔

دیگر عربی مدارس کی طرح، دارالعلوم دیوبند میں بھی عربی تحریر وتقریر کا کوئی ماحول نہیں تھا۔ مگر چھ سال پہلے ایک استاد نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ اور آج یہاں سینکڑوں ایسے طالب علم پیدا ہو چکے ہیں، جو بے تکلف عربی بول سکتے ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے خود اپنی ذاتی جدوجہد سے عربی لکھنا، بولنا سیکھا اور اس کے بعد طلبہ کو سکھانا شروع کر دیا اور اس کا نتیجہ النادی الادبی ہے جو آج یہاں کے طلبہ کی سب سے زیادہ زندہ اور فعال انجمن ہے۔

النادی الادبی صرف عربی لکھنے بولنے کی مشق کی انجمن نہیں ہے، بلکہ وہ طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی موثر ادارہ بن گئی ہے انجمن کے سربراہ ایک بلند حوصلہ انسان ہیں اور وہ طلبہ کے اندر مسلسل حوصلہ اور امنگ اور اعلیٰ انسانی اوصاف پیدا کرنے کی جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ اس

کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانی زندگی الگ الگ تقسیموں میں بٹی ہوئی کوئی چیز نہیں، بلکہ وہ ایک وحدت ہے۔ پانی کے گلاس میں رنگ کی ایک بوند ڈالی جائے تو وہ ایک طرف نہیں پڑی رہے گی بلکہ سارے پانی میں پھیل جائے گی اور پورے گلاس کو رنگین بنا دے گی۔ چنانچہ النادی الادبی طلبہ کے اندر عربی لکھنے بولنے کا جو جذبہ پیدا کر رہی ہے، وہ جذبہ ان کی پوری زندگی میں ایک نیا جوش وخروش پیدا کر رہا ہے—— ان کی نحو وصرف اچھی ہو رہی ہے، ان کی درسیات مضبوط ہو رہی ہیں۔ ان کے اسلامی جذبات میں اضافہ ہو رہا ہے، ان کے اندر اخلاقی اوصاف ترقی کر رہے ہیں۔ اس طرح ایک اعتبار سے جوش وخروش پیدا کرنا پوری زندگی کو جوش وخروش میں تبدیل کرنے کا سبب بن رہا ہے اور سارے وجود میں ایک نئی عملی روح پھونک رہا ہے۔

النادی الادبی کے سالانہ اجتماع میں مجھے ''مہمانِ خصوصی'' کے طور پر بلایا گیا تھا۔ چار گھنٹے کی بڑی پُرکیف مجلس تھی۔ ساری کارروائی عربی میں ہوئی اور اتنی خوبی سے ہوئی کہ بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں بھی اس سے بہتر نظر نہ آئے گی۔ دارالعلوم کے بڑے ہال میں سات سو سے زیادہ طلبہ جمع تھے۔ ہال کو اتنی نفاست سے سجایا گیا تھا اور اتنے نظم اور سلیقے کے ساتھ سب کچھ ہو رہا تھا کہ میں بار بار یہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہی وہ ''مولوی'' ہیں جن پر دقیانوسیت اور زمانہ سے بے خبری کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔

اس انتہائی منظم اور جدید ترین معیار کے اجتماع میں مجھے ایسا نظر آتا تھا گویا میں ملی صلاحیت کو دیکھ رہا ہوں۔ ہال میں بیٹھے ہوئے باوقار نوجوان ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ملت کی امنگیں ان کی شکل میں مجسم ہو گئی ہیں، وہ امنگیں جو سنگین ترین حالات میں بھی زندہ رہنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔ تقریریں، مقالات، مکالمے اور عربی نظمیں نہایت عمدہ عربی لہجے میں اور بے تکلف انداز میں دہرائے جا رہے تھے۔ وقت ختم ہونے کی گھنٹی کے بعد مقرر فی الفور اسٹیج چھوڑ دیتا تھا۔ یہ سب چیزیں ''الاحتفال السنوی للنادی الادبی'' کو عجیب پُرکیف بنا رہی تھیں۔

میں نے اپنی ڈیڑھ گھنٹے کی تقریر میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ عربی تحریر وتقریر کی

اہمیت کیا ہے۔ ادب کیا چیز ہے اور موجودہ زمانہ میں ادب نے کیا ہیئت اختیار کی ہے اور یہ کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کی خدمت کے لیے کس قسم کے ادب کی ضرورت ہے۔

اوپر کے درجات کے منتخب طلبہ کا ایک اجتماع ہوا جس میں تقریباً پچاس طلبہ شریک ہوئے اس موقع پر میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ موجودہ زمانے میں مادّیت نے ایسے سوالات کو جنم دیا ہے جنہوں نے اسے خود فکری تضاد میں مبتلا کر دیا ہے، اور اب ایک نیا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ دین کی دعوت کے ذریعہ انسان کو مادہ پرستی سے آخرت پسندی کی طرف لایا جائے۔

شام کو سجاد لائبریری کے زیرِ اہتمام دیو بند کی جامع مسجد میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں مجھے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ اس موقع پر میں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ موجودہ زمانہ میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں اور بدلے ہوئے حالات کے لحاظ سے ہمیں کیا طریق کار اختیار کرنا چاہیے۔

جمعیت علما دیو بند کے دفتر میں ایک نشست ہوئی جس میں مقامی جمعیت کے لوگ شریک ہوئے، اس موقع پر میں نے علما ہند کی تاریخ اور نئے حالات میں اس کی اہمیت کی وضاحت کی۔

ستمبر کی 15 تاریخ کو صبح میں طلبہ کی ایک نشست ہوئی، جس میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ ایک شخص عربی مدرسہ سے فارغ ہو کر جب عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو موجودہ حالات میں وہ کن مسائل سے دوچار ہوتا ہے اور ان کا حل کیا ہے۔

ان اجتماعات کے علاوہ دیو بند کے چند روزہ قیام میں مختلف لوگوں سے ملاقاتیں رہیں، اور مختلف دینی، علمی اور ملکی موضوعات پر تبادلۂ خیال جاری رہا ہے۔

ملت کی تعمیرِ نو کے لیے اس وقت ہمیں جو کام کرنے ہیں، ان میں سے ایک نوعیت کے کام تو وہ ہیں جو عمومی سطح پر درکار ہیں۔ مثلاً دینی تعلیم، مسلمانوں کی اجتماعی رہنمائی، مسلمانوں کے اندر ایمان اور عملِ صالح پیدا کرنا، جدید ضروریات کے مطابق اسلامی لٹریچر تیار کرنا، وغیرہ۔ ان کاموں کے لیے ہمارے یہاں بہت سے ادارے اور جماعتیں سرگرمِ عمل ہیں۔

اسی کے ساتھ ایک اور ضروری کام یہ ہے کہ ہر جگہ کے حالات و وسائل کے لحاظ سے مقامی نوعیت کے کام کیے جائیں۔ ہر بستی کو ایک اکائی مان کر بستی کی سطح پر منصوبہ بندی کی جائے اور اپنے موجودہ وسائل کو منظم کر کے اس طرح استعمال کیا جائے کہ وہ مستقبل کی تعمیر میں مددگار ہو سکے۔ یہ دوسرا کام وہ ہے جس میں ہر فرد شریک ہو سکتا ہے۔ ہر شخص اپنے حالات کے لحاظ سے اپنے مواقعِ کار کا اندازہ کرے اور اپنی ذاتی سطح پر ملت کی تعمیر کے لیے وہ جو کچھ کر سکتا ہے اس کے کرنے میں لگ جائے۔ موجودہ حالات خواہ کتنے ہی دل شکن ہوں، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی کتنا ہی لٹ گیا ہو، پھر بھی کوئی چیز اس کے پاس "اپنی" موجود ہوتی ہے، اور اگر دانش مندی سے کام لے کر اس حاصل شدہ چیز کو استعمال کرنا شروع کر دیا جائے تو ہر بربادی کے اندر ایک نئی تعمیر کا امکان نکل آتا ہے۔

آج ہم میں ہزاروں، لاکھوں لوگ ایسے ملیں گے جو ملت کا مرثیہ پڑھتے ہوئے نظر آئیں گے، جن کے پاس اصلاحِ ملت کی بڑی بڑی تجویزیں ہوں گی، مگر مشکل ہی سے اس کی کوئی مثال ملے گی کہ کسی مقام پر کچھ لوگ کوئی ایسا تعمیری کام کر رہے ہوں جو دوسروں کے لیے مثال بن سکے۔

آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے مقام پر اپنے حالات کے لحاظ سے کسی تعمیری کام کا انتخاب کرے اور بس اس کی تکمیل میں لگ جائے۔ اسی طرح ہر بستی تعمیری سرگرمیوں کی ایک اکائی بن جائے۔ جب بہت سی اکائیوں میں تعمیری کام ہونے لگے گا تو ان کے مجموعہ سے جو چیز وجود میں آئے گی، اسی کا نام ملی تعمیر ہے۔

آج ملت میں کچھ ایسا انتشار ہے کہ کوئی ایسی بستی نہیں جس کو نام لے کر یہ کہا جا سکے کہ وہاں ایسا کام ہو رہا ہے اور دوسروں کے سامنے اس کی مثال پیش کی جائے۔ تاہم دیوبند میں مجھے نظر آیا کہ، اگرچہ بستی کی سطح پر نہیں، تاہم افراد کی سطح پر اس نوعیت کے کام کی کچھ اچھی مثالیں قائم ہو رہی ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔

اس سلسلے میں ملت کی تعمیرِ نو کے لیے اس وقت تین قسم کے کاموں کی ضرورت ہے:

1۔ فرد سازی: یعنی اپنے قریبی افراد کو لے کر ان کے اندر حالات کا شعور اور عمل کی

امنگ پیدا کرنا اور ان کو موجودہ حالات میں صحیح انداز سے کام کرنے کے قابل بنانا۔

2۔ بچوں کی تعلیم: دینی تربیت کے ساتھ مضبوط ابتدائی تعلیم، خاص طور پر حساب اور انگریزی کی، تاکہ آئندہ وہ اچھے طالب علم ثابت ہوں۔

3۔ اقتصادی تنظیم: یعنی مقامی موجودہ وسائل کو اس طرح استعمال کرنا کہ وہ آئندہ تعمیر کی ابتدائی بنیاد بن سکیں۔

یہ تینوں کام خدا کے فضل سے کسی نہ کسی درجہ میں دیوبند میں ہورہے ہیں۔ فرد سازی کا عمدہ نمونہ دار العلوم میں النادی الادبی کی کوششیں ہیں۔ بچوں کی تعلیم کے لیے پبلک نرسری اینڈ جونیئر اسکول قائم ہوگیا ہے۔ اقتصادی تنظیم کی کامیاب مثال مسلم فنڈ ہے جس کا تعارف اس سے پہلے الجمعیۃ کے صفحات میں آچکا ہے۔

اسی طرح ہر بستی میں اپنی مقامی سطح پر اس قسم کے کام ہونے لگیں تو، ان شاء اللہ، وہ واقعہ وجود میں آجائے گا جس کو ہم تعمیر ملت کے آغاز سے تعبیر کرتے ہیں۔ صحیح آغاز کے ساتھ اگر استقلال کو شامل کرلیا جائے تو اسی کا دوسرا نام کامیابی ہے (ہفت روزہ الجمعیۃ، 17 ستمبر 1971، صفحہ 6)۔

دشمنی یا چیلنج

ایک مسلمان عالم نے کہا کہ ایک خیال بہت پریشان کررہا ہے۔ آج کل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا کو مسلمانوں سے عداوت ہوگئی ہے۔ ہر جگہ مسلمان مارے جارہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ عداوتی مسئلہ نہیں ہے بلکہ تحدیاتی مسئلہ ہے۔ اور وہ کسی نہ کسی شکل میں ہر ایک کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ تحدی (چیلنج) کی یہ صورتِ حال جاری رہے گی۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ آپ اس دنیا میں تحدیات (challenges) کا سامنا کرکے ہی جی سکتے ہیں۔ شکایت اور فریاد سے آپ کو کچھ بھی ملنے والا نہیں۔ (ڈائری، 5 جنوری 1995)

ایک طالبِ علم کو نصیحت

دار العلوم دیو بند کے ایک طالب علم کی فرمائش پر میں نے حسب ذیل سطریں اس کی ڈائری میں لکھیں:

بسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

زندگی اس کائنات کی سب سے قیمتی متاع ہے۔مگر اس متاع کی قیمت بازارحیات میں اس وقت ملتی ہے، جب کہ آدمی خود اس کی قیمت دے چکا ہو۔زندگی وہ سودا ہے جو خارجی بازار میں فروخت ہونے سے پہلے خود انسان کے اپنے اندر فروخت ہوتا ہے۔

یہ آپ کے حوصلہ کا امتحان ہے، آپ خود اپنی جتنی زیادہ قیمت لگائیں گے بازار عالم میں اتنی ہی زیادہ اس کی قیمت لگے گی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی دوسروں کی نظر میں زیادہ قیمتی ٹھہرے، تو خود سب سے پہلے اس کے خریدار بنئے۔ یہ دوسرے نہیں، بلکہ خود آپ ہیں، جو اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ بازار عالم میں آپ کی قیمت کتنی مقرر ہوگی (دیو بند، 3 ستمبر 1971)۔
(ہفت روزہ الجمعیۃ، 17 ستمبر 1971، صفحہ 6)

ترقی کا زینہ

ایک صاحب ایک عربی مدرسہ میں استاذ تھے۔ کچھ لوگ ان کے خلاف غصہ ہو گئے۔ انھوں نے ان کو اتنا زیادہ پریشان کیا کہ ان کو مدرسہ سے استعفیٰ دینا پڑا۔ وہ مجھ سے ملے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں یہ آپ کے لیے نئی ترقی کا زینہ ہے۔ باغبان کبھی ایک پودے کو اکھاڑتا ہے صرف اس لیے کہ اس کو دوبارہ کسی زیادہ بہتر جگہ پر نصب کیا جائے۔ (ڈائری، 5 دسمبر 1996)

مدرسہ قادریہ کا سفر

مفتی عبدالعزیز صاحب رائے پوری نے ستمبر 1979 میں مسروالا (ہماچل پردیش) میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنے شیخ مولانا عبدالقادر رائپوری کے نام پر اس کا نام مدرسہ قادریہ رکھا۔ اس کے بعد جلد ہی اپنے شاگرد مولانا کبیرالدین فاران مظاہری کو بلا کر اس کا انتظام ان کے حوالے کر دیا۔ 1980 سے مولانا کبیرالدین صاحب اس کے ناظم ہیں۔

پچھلے دس سال سے وہ برابر مجھ کو اپنے مدرسہ میں آنے کی دعوت دے رہے تھے، کبھی براہ راست اور کبھی ٹیلی فون پر۔ مگر کسی نہ کسی سبب سے وہاں کا سفر نہ ہو سکا۔ 17 نومبر 1995 کی صبح کو وہ دہلی آئے اور کچھ اس انداز سے اصرار کیا کہ میرے لیے انکار ناممکن ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اچھا، میں ابھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ چنانچہ اپنے پھیلے ہوئے کاموں کو چھوڑ کر صبح 10 بجے ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

ہماری گاڑی چلتے ہوئے اس سڑک پر پہنچی جہاں ایک طرف تاریخی جامع مسجد ہے اور دوسری طرف لال قلعہ کی سرخ دیواریں کھڑی ہوئی ہیں۔ لال قلعہ کو دیکھ کر مجھے اردو شاعر کی طویل نظم کا ایک شعر یاد آیا:

اے قلعہ سرخ اے اثر شاہجہانی   بربادشدہ عظمتِ ماضی کی نشانی

یہ شعر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نفسیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ ماضی کی گزری ہوئی عظمتوں میں اتنا گم ہوئے کہ وہ حال کی حقیقتوں کا صحیح ادراک نہ کر سکے۔ پدرم سلطان بود کی نفسیات نے انہیں مثبت نقطۂ نظر سے محروم کر دیا۔ اس المناک صورت حال کا سبب یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں جو لوگ مسلمانوں کے رہنما بن کر اٹھے وہ زیادہ تر شاعر اور خطیب اور انشاء پرداز قسم کے لوگ تھے انہوں نے رجز خوانی کی، جب کہ اس وقت اصل ضرورت حقیقت بیانی کی تھی، چنانچہ ان لوگوں نے اپنی غیر حقیقی باتوں سے پوری ملت کے مزاج کو بگاڑ دیا۔ موجودہ زمانہ

میں شاید کوئی بھی ایسا رہنما نہیں جس نے معاملات کو گہرائی کے ساتھ سمجھا ہو اور پھر حقیقت پسندانہ انداز میں مسلمانوں کو درست رہنمائی دی ہو۔

لال قلعہ اور قطب مینار کی حیثیت آج صرف آثار قدیمہ کی ہے۔ جو گروہ لال قلعہ اور قطب مینار کی فضاؤں میں جیتا ہو وہ خود بھی آثار قدیمہ کی ایک مثال بن کر رہ جائے گا، وہ دور جدید میں باعزت مقام حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔

دہلی سے نکل کر آگے بڑھے تو سڑک کے دونوں طرف دور تک درخت اور سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ ساری کائنات کے مقابلہ میں زمین اس سے بھی زیادہ چھوٹی ہے جتنا کہ پوری زمین کے مقابلہ میں ایک ذرہ۔ مگر اب تک کی معلومات کے مطابق، زمین ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں پانی اور سبزہ ہے۔ ساری وسیع کائنات میں کہیں بھی پانی اور سبزہ موجود نہیں۔

اسی پانی اور سبزہ نے زمین کو انسان جیسی زندہ مخلوق کی لیے قابل رہائش بنا دیا ہے۔ یہاں اس کی لیے نہ صرف رہائش کا سامان ہے بلکہ تمدنی ترقیوں کی لیے تمام ممکن اسباب بھی موجود ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی انتہائی عظیم نعمت ہے۔ اس کا شکر صرف یہ ہے کہ آدمی دل سے اس عطیہ کا اعتراف کرے اور اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی تابعداری میں دے دے۔

یہ سفر مدرسہ کی کار سے ہوا۔ راستہ میں میں نے مولانا کبیر الدین صاحب سے پوچھا کہ 1947 میں جب ملک تقسیم ہوا اس کے بعد ہندستان میں کتنے ایسے مولوی تھے جن کے پاس کار اور ٹیلی فون تھے۔ انہوں نے کچھ دیر سوچا اور پھر بولے کہ شاید ایک بھی نہیں۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ آج کیا حال ہے، انہوں نے کہا کہ آج تو ملک میں ہزاروں مولویوں کے پاس کار اور ٹیلی فون موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ایسے مولوی ہیں جن کو آج براہ راست یا بالواسطہ طور پر کار اور ٹیلی فون کی سہولت حاصل ہے۔

پھر میں نے کہا کہ مگر کوئی بھی مولوی ایسا نہیں جو تحریر یا تقریر کے ذریعہ یہ اعلان کرتا ہو کہ مسلمان اس ملک میں ترقی کر رہے ہیں، نہ اکابر میں اور نہ غیر اکابر میں، بلکہ یہی لوگ ہیں

جو اپنی تقریروں اور تحریروں میں روزانہ ہندستانی مسلمانوں کی بربادی کا چرچا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ باہر کے ملکوں میں بھی جا کر وہ اسی قسم کی خبریں لوگوں کو سناتے ہیں۔ مثلاً مکہ کے اخبار ''العالم الاسلامی'' کے تازہ شمارہ 12 نومبر 1995 میں ایک معروف ندوی عالم کا انٹرویو چھپا ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ انڈیا کے مسلمان مخالفانہ موامرات (conspires) کا اور ہندوؤں کی عداوت کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس کا عنوان ہے: انڈیا کے مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان (مُسْلِمُوْ الْهِنْدِ بَيْنَ فَكَّيِ الرَّحَیٰ)۔

انٹرویو لینے والا اگر سمجھدار ہوتا تو وہ ان سے پوچھتا کہ جب تمام ہندستانی مسلمان ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں تو تم کس طرح اتنے شاندار طور پر اس سے بچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم کو تو تم وہی تدبیر بتاؤ تا کہ ہم بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا (بشارت دو، نفرت نہ پھیلاؤ) کے اسلامی اصول پر ہندستان کے مسلمانوں کو اس کی خوشخبری دے سکیں۔

اپنے ملک کے پڑھے لکھے مسلمانوں کی سوچ کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک ماضی کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ 1947 سے پہلے مسلمانوں کے لیڈروں نے سمجھایا کہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ اس لیے ہمیں علیحدہ ملک چاہیے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے تمام دماغ آج تک ماضی کے اسی بے بنیاد پروپیگنڈے میں گم ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ماضی کے مسلمان لیڈروں کی تقسیم کے مطابق، ہم ''ہندو انڈیا'' میں ہیں، اس لیے ہم ضرور تباہ حال ہوں گے۔ چنانچہ وہ ابھی تک وہی ماضی کی بولی بولے چلے جا رہے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آج ہندستان کے مسلمان پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے بھی زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ خود لکھنے اور بولنے والے طبقہ میں ایک ایک شخص اپنی 1947 کی حالت کے مقابلہ میں آج بہت زیادہ ترقی حاصل کیے ہوئے ہیں۔ مگر تخلیقی فکر کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے قریبی واقعہ تک کا علم نہیں۔

ماضی کے مسلم رہنماؤں کی سوچ قانون فطرت کے خلاف تھی۔ چنانچہ ان مسلم رہنماؤں کی

باتیں فضا میں گم ہوگئیں۔ اور فطرت کا قانون خود اپنی طاقت سے قائم ہوگیا۔ مگر موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ انہیں صرف اپنے اکابر کی باتوں کا علم ہے، انہیں خدا کے مقرر کیے ہوئے فطری قانون کا کوئی علم نہیں۔

دہلی سے مسروالا کا فاصلہ ڈھائی سو کلومیٹر سے کچھ زیادہ ہے۔ سڑک اچھی ہے۔ راستہ میں سونی پت، پانی پت، کرنال، جمنا نگر وغیرہ پڑتے ہیں۔ ہم لوگ ایک کے بعد ایک ان مقامات سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ میں نے سوچا کہ ان جگہوں کے نام اسی طرح صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔ لیکن ان کے قدیم باشندے آج پیدا ہوں تو ان جگہوں کی بدلی ہوئی صورت کی بنا پر شاید وہ انہیں پہچان نہ سکیں۔

ڈیڑھ بجے ہم لوگ کرنال پہونچے۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک مسجد ہے جس کے اوپر ''مسجد صغرا'' لکھا ہوا ہے۔ اس میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ مسجد بظاہر قدیم تھی۔ مگر مزید تعمیر کرکے اس کو اندر سے نیا کر دیا گیا ہے۔ پوری مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ مجھے قرآن کی آیت یاد آئی کہ جمعہ کی نماز کی اذان ہو تو نماز کے لیے اکٹھا ہو جاؤ اور جب نماز ختم ہو تو خدا کی زمین میں منتشر ہو جاؤ (الجمعۃ، 62:9-10)۔ میں نے سوچا کہ مسجد منتشرین کا مقام اجتماع ہے۔ اہل ایمان خدا کی زمین میں پھیلنے والے لوگ ہیں۔ وہ صرف وقتی طور پر مسجد میں ٹھہرتے ہیں تاکہ اس سے نئی توانائی لے کر دوبارہ آگے بڑھ سکیں۔

کرنال میں ایک بہت بڑی مسجد ہے۔ اس کو اندر جا کر دیکھا۔ اس کے امام سید انور حسین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ امام صاحب نے چائے کے لیے اصرار کیا مگر ہمارے پاس وقت کم تھا اس لیے معذرت کرنی پڑی۔ مسجد کے باہر ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ اس پر لکھا ہے — تعمیر کردہ نواب عظمت علی خاں، رئیس اعظم کرنال۔ وہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے چچا تھے۔ انھوں نے یہ مسجد 1925 میں بنوائی تھی۔ 1947 میں کرنال مکمل طور پر مسلمانوں سے خالی ہوگیا تھا۔ اب دوبارہ مسلمان آکر یہاں آباد ہوگئے ہیں۔ اس وقت کرنال میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔

عصر کی نماز ہم نے جمنا نگر میں پڑھی۔ وہاں سڑک کے کنارے ایک مسجد تھی۔ اس میں چار پانچ زیادہ عمر کے اور سیدھے سادے مسلمان نظر آئے۔ ان سے پوچھا کہ جمنا نگر میں کتنی مسجدیں ہیں، کسی نے کہا ایک۔ کسی نے کہا تین۔ غرض کافی پوچھ گچھ کے بعد معلوم ہوا کہ وہاں پانچ مسجدیں ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے 1947 سے پہلے کے دور میں یہ شکایت کی تھی کہ:

بازار میں ہیں لاکھوں، مسجد میں فقط جمّن

آج اگرچہ کمیت کے اعتبار سے مسجد کے نمازیوں کی آبادی کافی بڑھ گئی ہے مگر جہاں تک کیفیت کا تعلق ہے، اب بھی مسجد کی آبادی میں زیادہ تر "جمن" قسم کے لوگ ہی دکھائی دیتے ہیں۔

کرنال کے ریستوران سے کھانا کھا کر ہم لوگ نکلے تو مولانا کبیر الدین صاحب پاس کی ایک دکان پر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے پان خریدا جس کی قیمت دو روپیہ تھی۔ پان والا ایک ہندو نوجوان تھا۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ اس نے کہا کہ سہارن پور۔ پھر پان والے نے کہا، کیا آپ کبھی سہارن پور گئے ہیں۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ ہاں، میں نے وہاں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے بعد اس نے پان کی قیمت نہیں لی۔ اس نوجوان کا نام ارن تھا۔ وہ دکان سے آکر مجھ سے ملا۔

مذکورہ واقعہ احساس قربت کا کرشمہ تھا۔ سامنے کے آدمی کو اگر کسی طرح آپ قربت کا احساس دلا دیں، خواہ وہ قربت بالکل معمولی نوعیت کی کیوں نہ ہو تو فوراً وہ آپ کا گرویدہ ہو جائے گا۔ دو آدمیوں یا دو گروہوں کے درمیان اجنبیت ہمیشہ نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، قرابت اپنے آپ سارے معاملات کو درست کر دیتی ہے۔

ہم لوگ صبح 10 بجے دہلی سے روانہ ہوئے تھے۔ شام کو عشاء کے قریب مسر والا پہنچے، اس سفر میں ہم کبھی آبادی کے درمیان سے گزرے اور کبھی خالی سڑک سے، کبھی ہمارا راستہ کھلے میدان سے طے ہوا اور کبھی ایسے راستہ سے جہاں دونوں طرف جنگل تھا۔ کبھی ہماری گاڑی نشیب پر چلی اور کبھی اس کو اونچائی کے اوپر چڑھنا پڑا۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح پوری زندگی ایک سفر

ہے جو آخرت پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ دنیا میں آدمی مختلف احوال سے گزرتے ہوئے چلا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آتی ہے اور وہ آخری طور پر اگلی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔

نماز عشاء کے بعد مدرسہ کے دفتر میں اساتذہ اکٹھا ہوئے۔ اس موقع پر مختلف باتیں ہوئیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ کچھ لوگ آپ کے پیغام کے مخالف کیوں ہیں۔ میں نے کہا کہ میں تو سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی شخص میرے پیغام کا مخالف نہیں۔ کیونکہ میرا پیغام وہی ہے جو خود فطرت کا قانون ہے۔ اور فطرت کے قانون کو نظر انداز کرنا کسی کے لیے ممکن ہی نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ میری تحریریں 99 فیصد اسلام کے تعارف پر مبنی ہوتی ہیں۔ کوئی بھی شخص ان کا مخالف نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ اس میں میں نے صرف یہ کیا ہے کہ اسلام کی متفقہ تعلیمات کو جدید اسلوب میں پیش کیا ہے، اس کا کوئی مخالف نہیں ہوسکتا۔

ایک فیصد وہ ہیں جن کا تعلق برادران وطن سے ہے۔ اس سلسلہ میں میرا کہنا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ برادران وطن کے ساتھ مل جل کر رہیں اور اگر کبھی کسی کی طرف سے اشتعال انگیزی ہو تو اس سے اعراض کریں تاکہ پر امن فضا باقی رہے۔ اس پر بھی تمام کے تمام مسلمان عامل ہیں۔ آپ کسی بھی مسلمان کو لیجیے اور دیکھیے کہ اس کا ذاتی معاملہ جن ہندوؤں سے ہے اس کے ساتھ وہ کس قسم کا سلوک کرتا ہے۔ آپ پائیں گے کہ یہ عین وہی ہے جس کی طرف الرسالہ میں توجہ دلائی جا رہی ہے۔ میں نے صرف یہ کیا ہے کہ میں لوگوں کے عمل کا اعلان کر رہا ہوں۔

عشاء کی نماز مدرستہ قادریہ کی مسجد میں پڑھی۔ مسجد بالکل جدید طرز کی ہے اور سادگی کے ساتھ خوبصورتی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کی خصوصیات کی تصویر کشی لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس کو آنکھوں سے دیکھ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

عشاء کی نماز کے بعد طلبہ نے مصافحہ کیا۔ اکثر ایسے موقع پر لوگ بھیڑ کی صورت میں مصافحہ کرتے ہیں۔ مگر یہاں یہ ہوا کہ طلبہ نے مسجد کی دیوار سے مل کر قطار بنالی اور ایک ایک طالب علم آگے بڑھ کر مصافحہ کرتا رہا۔ اس طرح تقریبا دو سو طلبہ نے مصافحہ کیا۔

مدرسہ کے قریب سے ایک اہم سڑک گزرتی ہے۔ مگر اس سڑک کو مدرسہ سے جوڑنے کے لیے درمیان میں پختہ راستہ نہیں تھا۔ 1984 میں مدرسہ میں ایک بڑا جلسہ ہو رہا تھا۔ منتظمین نے ریاستی حکومت کے نام ایک درخواست بھیجی کہ ہمارے یہاں ایک بڑا مذہبی جلسہ ہونے والا ہے۔ لوگ دور دور سے اس میں شرکت کے لیے آئیں گے۔ مگر عام سڑک اور مدرسہ کے درمیان اچھا راستہ نہیں ہے۔ اس کے بعد حکومت کی طرف سے مدرسہ تک ایک پختہ سڑک بنادی گئی۔ میں نے چل کر دیکھا تو وہ 280 قدم لمبی تھی۔

مدرسہ کے مہمان خانہ میں بیٹھا ہوا میں چائے پی رہا تھا۔ اتفاق سے میرا ہاتھ ہلا اور چائے میری چادر پر گر گئی۔ مولانا کبیر الدین فاران مظاہری نے فوراً میری چادر لے کر ایک طالب علم کو دیا کہ اسے لے جا کر ابھی دھو دو۔ یہ رات کا وقت تھا۔ میں نے سوچا کہ اس وقت تو چادر سوکھے گی نہیں۔ کل اس کو دھوپ میں ڈالنا ہوگا۔ پھر غالباً دوپہر تک وہ سوکھ کر مجھے ملے گی۔ میں اسی خیال میں تھا کہ 20 منٹ کے بعد طالب علم نے صاف چادر لا کر میرے پاس رکھ دی۔ اتنی دیر میں وہ دھوئی گئی، سکھائی گئی اور پریس کر کے تہہ کی گئی اور پھر میرے پاس واپس آ گئی۔

اس کا راز یہ تھا کہ یہاں مدرسہ میں جدید طرز کی واشنگ مشین موجود ہے جو دھونے کے بعد فوراً سکھانے کا کام بھی کر دیتی ہے۔ یہ ایک علامتی واقعہ ہے جس سے مدرسہ کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نصاب کے اعتبار سے یہ ایک ”قدیم طرز“ کا مدرسہ ہے۔ مگر نظام اور تعمیرات کے اعتبار سے وہ بالکل جدید اور اپٹوڈیٹ ہے۔ اس کو دیکھ کر میں نے کہا کہ آپ نے تو اپنے مدرسہ کو ایک ماڈرن مدرسہ بنا دیا۔ اسی طرح مدرسہ میں آٹا پیسنے کی مشین ہے۔ مدرسہ کی ضرورت کا آٹا خود اپنی مشین میں پیسا جاتا ہے، وغیرہ۔

ایک بار ایک مسلمان تاجر مدرسہ قادریہ میں آئے۔ انہوں نے طلبہ کو دیکھ کر کہا آپ کے طلبہ کے کپڑے صاف نہیں ہیں۔ پھر یہی تبصرہ انہوں نے تمام مدراس کے بارے میں کیا۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ آپ لوگ تنقید تو کر رہے ہیں مگر آپ اس کا حل نہیں

بتاتے۔ انہوں نے کہا کہ حل کیا ہے۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ حل بہت سادہ ہے۔ آپ پیسہ دیجیے ہم واشنگ مشین منگاتے ہیں۔ اور پھر آپ دیکھیں گے کہ ہمارے مدرسہ کے بچے کتنے صاف ستھرے ہیں۔

مذکورہ تاجر کو یہ بات اثر کر گئی۔ وہ فوراً اس پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ دہلی جا کر انہوں نے مدرسہ کے لیے گودریج کی واشنگ مشین بھجوادی جو اس وقت سب سے اچھی سمجھی جاتی تھی۔ یہ ایک صحت مند مثال ہے۔ مدرسہ والے باعزت انداز میں تعاون مانگیں اور اصحاب خیر بھی باعزت انداز میں اپنا مالی تعاون دیں تو دینی اداروں کا کام نہایت حسن وخوبی کے ساتھ چلنے لگے گا۔

عشاء کی نماز کے بعد مدرسہ کے دفتر میں نشست ہوئی۔ اساتذہ بھی آگئے۔ دیر تک ملی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے مولانا کبیر الدین مظاہری سے کہا کہ آپ نے اپنے مدرسہ کو جدید انداز میں بنایا ہے۔ اب یہاں ایک اور روایت قائم کیجیے۔ میں نے کہا کہ باہر سے جب کوئی شخص کسی مدرسہ میں آتا ہے تو عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ گفتگو یک طرفہ انداز میں ہوتی ہے۔ یعنی آنے والا بولتا ہے، اور مدرسہ کے لوگ صرف سامع بنے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں تبادلۂ خیال کے انداز میں گفتگو ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے یہاں یہ روایت پہلے سے قائم ہے۔ چنانچہ اسی انداز میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

مدرسہ کا دفتر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ بالکل جدید طرز کا ایک دفتر تھا۔ ایک خوبصورت میز کے گرد خوبصورت کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز پر کیلکولیٹر، ٹیلی فون، اور دوسری جدید نوعیت کی دفتری چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ مولانا کبیر الدین مظاہری برابر ٹیلی فون پر رابطہ قائم کر کے لوگوں کو میری آمد کی اطلاع دیتے رہے اور پروگرام مرتب کرتے رہے۔ کیونکہ میں اچانک یہاں آیا تھا، اور اب ٹیلی فون ہی کے ذریعہ پروگرام کو منظم کیا جا سکتا تھا۔

ہماچل پردیش کا علاقہ 1947 میں مکمل طور پر فرقہ پرستی کی زد میں تھا جو ملک کی تقسیم کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ مدرسہ قادریہ کے ساتھ بھی بار بار یہاں اشتعال انگیزی اور فساد کے

مسائل پیدا ہوئے۔ مگر مولانا کبیر الدین صاحب نے حکمت اور تحمل کے ذریعہ ہر موقع پر کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے چنگاری کو ہوا دینے کے بجائے اس کو پہلے مرحلہ ہی میں بجھا دیا۔

یہاں کی کئی چیزیں دوسرے مدارس کے لیے قابل تقلید ہیں۔ مثلاً یہاں کا اصول ہے کہ دو استاد اگر آپس میں جھگڑیں تو دونوں ہی کو باعزت طور پر رخصت کر دیا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہاں ایسا ہے کہ دو استادوں کے درمیان اگر نزاع پیدا ہو تو وہ آپ ہی آپ اس کو ختم کر لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مسئلہ نظامت تک پہنچا تو دونوں کو علیٰحدہ کر دیا جائیگا۔

طلبہ کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اساتذہ کی ذاتی خدمت کریں۔ مثلاً کوئی طالب علم کسی استاذ کا سر اور پاؤں نہیں دبا سکتا اور نہ ہی سر میں تیل لگا سکتا ہے۔ اسی قاعدہ کو برقرار رکھنے کے لیے یہاں جوان العمر اساتذہ رکھے گئے ہیں کیونکہ اس قسم کے رواج اکثر انہیں مدارس میں پائے جاتے ہیں جہاں بوڑھے اور زیادہ عمر کے اساتذہ ہوں۔ تاہم اسی کے ساتھ طلبہ کو یہ تاکیدی حکم ہے کہ وہ ہرگز اپنے استاد کی نافرمانی نہ کریں۔

18 نومبر کی صبح کو سوا پانچ بجے مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ یہ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر تھی۔ یہاں چاروں طرف فطرت کا ماحول ہے۔ اس ماحول میں اذان کی دھیمی آواز بہت اثر انگیز تھی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے موذن نے فطرت کے دھیمے لہجہ میں ذکر خداوندی کا نغمہ بکھیر دیا ہو۔

فجر کی نماز میں امام صاحب نے سورۃ الجمعۃ کی تلاوت کی۔ نماز کے بعد میں نے ایک صاحب سے کہا کہ دیکھیے قرآن میں ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کی تسبیح کر رہی ہیں (62:1) مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ تسبیح سنائی نہیں دیتی۔ گویا فطرت کی زبان خاموشی کی زبان ہے۔ شور کی زبان فطرت کی زبان نہیں۔

مولانا کبیر الدین صاحب نے یہاں کی مسجد میں لاؤڈ اسپیکر نہیں لگایا ہے۔ اس کا علاقہ پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ یہاں کے ہندو کہتے ہیں کہ دیکھو، یہ کتنا اچھا مولانا ہے۔ وہ شور والا کام نہیں کرتا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنے دھرم کی سیوا کر رہا ہے۔

میں نے مولانا کبیر الدین صاحب سے کہا کہ آپ جو کر رہے ہیں وہ عین اسلامی طریقہ ہے۔ مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال تو مجھے ایک بدعت معلوم ہوتا ہے۔ حدیث میں فتنہ کے زمانہ کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بتائی گئی ہے کہ اس وقت مسجدوں میں آوازیں بلند ہوں گی: اِرْتَفَعَتِ الْأَصْوَاتُ فِي الْمَسَاجِدِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2357)۔

فجر کی نماز ختم ہوئی تو ایک بچہ نے کھڑے ہو کر مختلف اوقات کی دعائیں بلند آواز سے بتائیں۔ مثلاً کھانے کے بعد یہ دعا پڑھیں، سونے کے وقت یہ دعا پڑھیں، وغیرہ۔

نماز کے بعد طالب علموں کے اٹھ کر جانے کا انداز بھی نہایت منظم تھا۔ طالب علم اچانک بھیڑ کی صورت میں نہیں اٹھے۔ میں نے دیکھا کہ لمبی صف کے دائیں طرف سے باری باری صرف ایک طالب علم اٹھتا اور خاموشی سے باہر چلا جاتا۔ اس طرح تمام طلبہ قطار بنا کر باہر نکلے۔ مسجد کے گیٹ کے باہر آتے ہی تمام طلبہ نے دوڑ لگانا شروع کی۔ دوڑ ایک استاد کی نگرانی میں ہوئی۔

میں نے سوچا کہ یہ منظر اگر ٹی وی پر دکھا دیا جائے تو لوگوں کو حقیقت معلوم ہو۔ کچھ غیر مسلم حضرات غلط طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ مسجد اور مدرسہ میں ہتھیاروں کی ٹریننگ ہوتی ہے۔ انہیں برعکس طور پر نظر آئے گا کہ مسجد میں آداب حیات سکھائے جاتے ہیں۔ یہاں طلبہ کو جسمانی ورزش کرائی جاتی ہے۔ یہاں ایک ایک طالب علم کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ شہری تقاضوں کو نبھائے۔ وہ ڈسپلن والی زندگی گزار سکے۔ وہ یہاں تربیت پا کر ایک اچھا انسان بن جائے۔

نماز اوّل وقت میں ہوئی۔ چنانچہ مسجد کے باہر ابھی زیادہ اجالا نہیں ہوا تھا۔ اب پروگرام کے مطابق تمام طلبہ سڑک پر پہنچے اور کچھ دیر تک دوڑ لگاتے رہے۔ یہ یہاں کا روزانہ کا معمول ہے۔ واپس آکر تمام طلبہ تلاوت قرآن میں مشغول ہو گئے۔

یہ مدرسہ 36 بیگھہ زمین میں واقع ہے۔ وسیع رقبہ میں ایک شاندار اسلامی دنیا ابھر رہی ہے۔ مگر ایک صاحب کے الفاظ میں ”کبھی کوئی ہندو نہیں بولا۔ کبھی کوئی ہندو ڈنڈا لے کر نہیں آیا۔ اتنا بڑا کام نہایت پرسکون طور پر یہاں انجام پا رہا ہے“۔ میں نے کہا کہ یہ سب حکمت کا نتیجہ ہے جس کو آپ لوگوں نے خدا کے فضل سے اختیار کیا ہے۔

ایک استاذ نے کہا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ سیکولر لوگ سیاسی پلیٹ فارم پر آپس میں لڑتے ہیں اور پھر دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ مگر علما کا یہ حال ہے کہ دو عالم اگر ایک بار کسی بات پر لڑ گئے تو دوبارہ وہ کبھی نہیں ملیں گے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک عالم سے میں نے یہ بات کہی تو انھوں نے جواب دیا کہ سیکولر لوگ مکار ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسا کرتے ہیں۔ مگر علما تو مخلص لوگ ہیں۔ جب میں اپنے کو حق پر سمجھوں تو میں کس طرح دوسرے سے مل سکتا ہوں۔

استاذ نے کہا کہ آپ کا یہ جواب درست نہیں۔ اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے کہ دو مسلمانوں کے درمیان تین دن سے زیادہ ترک کلام اور ترک تعلق شریعت میں جائز نہیں: لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6237)۔ اس کا مذکورہ عالم کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اپنے مخالف کو غلط ثابت کرنے کے لیے وہ اسلام کے اصولوں کا حوالہ دے رہے تھے، مگر خود اپنے اوپر اسلام کے اصول کو منطبق کرنے پر وہ راضی نہ ہوئے۔

مدرسہ سے ملحق ایک زمین تھی۔ اس پر عملاً مدرسہ کا قبضہ تھا۔ تاہم کاغذی اعتبار سے وہ کچھ ہندوؤں کی تھی۔ چونکہ نئے قانون کے مطابق قابض ہی مالک ہوتا ہے۔ اس لیے وہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ زمین اب ہم کو نہیں ملے گی۔

ایک بار زمین کے مالکان یہاں آئے۔ انھوں نے مولانا کبیر الدین صاحب سے کہا کہ یہ زمین جو آپ کے قبضہ میں ہے، اس کے اصل مالک ہم لوگ ہیں۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ اسلام میں قبضہ کوئی چیز نہیں۔ زمین کا جو مالک ہے وہی اس کا مالک رہے گا۔

مولانا کبیر الدین صاحب کی زبان سے یہ غیر متوقع بات سن کر وہ لوگ بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس زمین کو بیچنا چاہتے ہیں۔ مگر آپ کو خریداری کا پہلا حق ہوگا۔ مزید یہ کہ انھوں نے مارکٹ ریٹ سے بہت کم قیمت میں اس زمین کو مدرسہ کے لیے دینا منظور کرلیا۔ حالانکہ مولانا کبیر الدین صاحب نے ان سے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا تھا۔

بہت سے ہندی اخبار والے مدرسہ کو دیکھنے کے لیے آئے۔ انھوں نے اس کے بارے میں اچھی رپورٹیں شائع کیں۔ ایک ہندی اخبار نے لکھا کہ یہ ہماچل پردیش کا شانتی نکیتن ہے۔

چنڈی گڑھ کے ہندی روزنامہ دینک ٹریبون (13 اگست 1994) میں ایک رپورٹ مسلم مدارس کے بارے میں چھپی۔ اس کی سرخی تھی۔ "بھارت کے مدرسوں میں ہو رہی ہے کٹرپنتھی کی پڑھائی"۔ اسی طرح پنجاب کیسری (دسمبر 1994) میں رپورٹ چھپی جس کی سرخی یہ تھی: "ہماچل میں چلائے جارہے مدرسے شکچھا پرسار کے بجائے آتنک واد کا پرشکشن دے رہے ہیں"۔ اسی طرح انڈین اکسپریس کی چنڈی گڑھ اشاعت (22 اگست 1994) میں رپورٹ چھپی جس کی سرخی یہ تھی:

ISI Bid to Recruit HP Youths Via Madrasa.

اس قسم کی خبروں کے ذریعہ علاقہ میں دینی مدارس کے خلاف پروپیگنڈہ بڑھا۔ اس کا خاص نشانہ مسروالا کا مدرسہ قادریہ تھا۔ مگر یہ پروپیگنڈہ زحمت میں رحمت ثابت ہوا۔ پریس اور انتظامیہ دونوں تحقیق کے لیے متحرک ہو گئے۔ اور آخری رپورٹ عین مدرسہ کے حق میں نکلی۔ اس سلسلہ میں بہت سی موافق باتیں پریس میں آئیں جن سے فضا مزید اضافہ کے ساتھ مدارس کے حق میں ہو گئی۔ مثلاً جن ستا (11 جون) میں رپورٹ چھپی۔ اس کا عنوان تھا: بھائی چارہ کا پرتیک ہے مسروالا (کا مدرسہ)۔ حتی کہ ہماچل کے چیف منسٹر راجہ ویربھدر سنگھ نے اسٹیٹ اسمبلی میں اس کی تردید کی۔ دینک ٹریبون (20 دسمبر) میں یہ رپورٹ اس سرخی کے ساتھ چھپی: مدرسوں میں بھارت ورودھی گتی ودھیاں نہیں۔

اخبار والوں کی کئی پارٹیاں مدرسہ قادریہ میں آئیں۔ اور ہر چیز کو دیکھنے کے بعد اپنے اخباروں میں یہ رپورٹ چھاپی کہ ہم نے خود جا کر تحقیق کی اور تمام مخالفانہ پروپیگنڈوں کو غلط پایا۔ ان رپورٹوں کو پڑھنے کے بعد میں نے مدرسہ کے ذمہ داروں سے کہا کہ یہ آپ کے حق میں رفع ذکر کا معاملہ تھا۔ اور جب آدمی حق پر ہو تو ہر رفع ذکر عسر میں یسر کا سبب بن جاتا ہے۔

مدرسہ قادریہ مسروالا ہماچل پردیش ایک ایسے علاقہ میں واقع ہے جس کے اطراف میں غیر مسلموں کی بڑی آبادی ہے۔ مدرسہ والوں کے ان حضرات سے گہرے مراسم کی وجہ سے ان

حضرات کی برابر یہاں آمدورفت رہتی ہے، حتی کہ خوشی اور غمی میں بھی وہ مدرسہ والوں کو شریک کرتے ہیں۔ اور اپنے نجی مسائل میں یہاں کے ذمہ داروں سے مشورہ کرتے ہیں۔ نیز یہاں آکر اسلام کی معلومات، اسلامی اخلاق اور مدرسہ کی حب الوطنی اور سیاست سے دوری اور علما کی سادگی کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ ایسے اسلامی ادارے ملک کے گوشہ گوشہ میں ہونے چاہئیں۔ کیونکہ یہ ادارے امن ومحبت کا پیغام ہوتے ہیں، حتیٰ کہ وہ غیر مسلم جن کو عام طور پر کٹر پنتھی کہا جاتا ہے وہ بھی یہاں کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ان آنے والوں میں عام سرکاری ملازم سے لے کر وزیر اعلیٰ ہماچل پردیش جیسے افراد بھی شامل ہیں۔

افغانستان کے طالبان میں سے بعض افراد نے ایک انٹرویو کے دوران یہ کہا تھا کہ ہماری تعلیم دیوبند کے مدرسہ میں ہوئی ہے۔ اس کو ہندستان کے کچھ ہندی اخباروں میں اس طرح چھاپا گیا کہ طالبان نے جنگ جوئی کا سبق دیوبند کے مدرسہ میں رہ کر حاصل کیا ہے۔ اس کو مزید عام کرکے ہندی پریس میں یہ کہا گیا کہ ہندستان کے اسلامی ادارے اُگرواد اور علیحدگی پسندی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان مدرسوں کا بھارتیہ کرن کیا جائے۔ اس کے بغیر ہمارے ملک میں شانتی اور اتحاد قائم نہیں ہوسکتا۔

یہ بات بلا شبہ بالکل بے بنیاد ہے۔ میں خود مدرسہ ہی کا ایک پروڈکٹ ہوں اور جانتا ہوں کہ ان مدرسوں کا کوئی تعلق اگرواد یا علیحدگی پسندی سے نہیں۔ یہ مدرسے سادہ طور پر عربی زبان اور دین اسلام کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ افغانی نوجوانوں نے دیوبند کے مدرسہ میں تعلیم پائی ہے مگر یہ تعلیم سادہ طور پر دین کی تھی، نہ کہ جنگ جوئی کی۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے کئی نیشنل لیڈروں کی تعلیم لندن میں ہوئی۔ ہندستان واپس آنے کے بعد وہ انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں شریک ہوگئے۔ اب کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان لیڈروں کو لندن کے اسکولوں میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کی تعلیم دی گئی تھی۔

1947 سے پہلے جو لوگ آزادی کی تحریک میں شریک ہوئے اور ”انگریز و بھارت

چھوڑو" کا نعرہ لگایا وہ تقریباً سب کے سب ہندستان کے ان انگریزی اسکولوں کے پڑھے ہوئے تھے جو برٹش دور میں قائم کیے گئے۔ ان کی بابت لارڈ میکالے نے کہا تھا کہ ان انگریزی اسکولوں کا مقصد یہ ہے کہ یہاں ایسی نسل پیدا ہو جو پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی ہو اور اپنی سوچ کے اعتبار سے انگریز۔ مگر انہیں انگریزی اسکولوں میں پڑھ کر لوگ انگریز کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس وقت انگریزی اسکولوں میں انگریزی حکومت کے خلاف لڑائی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

یہی معاملہ افغانیوں کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ افغانی نوجوانوں نے ہندستان کے دینی مدرسہ میں داخلہ لے کر یہاں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے وطن جا کر جب وہ وہاں کی عسکری تحریک میں شامل ہو گئے تو اس کا کوئی تعلق ہندستان کے دینی مدرسہ سے نہ تھا۔ جنگ جوئی کا سبق انہوں نے خود اپنے ملک سے لیا۔ اس کا کوئی تعلق ان کی بیرونی تعلیم سے نہیں۔

کچھ عرصہ پہلے یہاں کے مدرسہ میں حیدر آباد کا ایک طالب علم تھا۔ وہ جوڈو کراٹے سیکھے ہوئے تھا۔ مدرسہ کے قریب ایک نہر ہے۔ وہ اکثر اسی نہر پر جایا کرتا تھا۔ ایک روز وہاں ایک ہندو لڑکا تھا۔ وہ مذکورہ طالب علم کے پاس کھڑا ہو کر بار بار نہر میں کودتا تھا۔ اس کی وجہ سے طالب علم پر پانی کے چھینٹے آتے تھے۔ طالب علم نے منع کیا، وہ نہیں مانا تو طالب علم نے اس ہندو لڑکے کو مار دیا۔ وہ روتا ہوا گھر گیا۔ اس کے بعد اس کی ماں آئی اور طالب علم کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگی۔ طالب علم نے اس ہندو عورت پر جوڈو کراٹے کا فن استعمال کیا۔

اس سے ہندو آبادی میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ وہ لوگ مدرسہ پر آئے۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ یہ طالب علم کی غلطی ہے اور سب کے سامنے طالب علم سے معافی منگوائی۔ اس کے بعد معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔

تاہم ایسے سنگین معاملہ میں اتنی آسانی سے ہندوؤں کے ٹھنڈا پڑ جانے کا ایک پس منظر بھی تھا۔ اس سے پہلے مدرسہ کے طلبہ نے ہندو آبادی پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ مدرسہ سے ملے

ہوئے ان لوگوں کے کھیت ہیں۔ مگر طلبہ چونکہ مدرسہ کے تحت ڈسپلن میں رہتے ہیں۔ انہوں نے کبھی ان ہندو کسانوں کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ایک بار گاؤں میں آگ لگ گئی تو تمام طلبہ دوڑ کر وہاں گئے اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر آگ بجھائی۔ اس پیشگی اخلاقی اثر کی وجہ سے ہندو زیادہ مشتعل نہیں ہوئے۔

ان میں سے کچھ لوگوں نے خود ہی یہ کہنا شروع کر دیا کہ مدرسہ والے غلط لوگ نہیں ہیں۔ اس میں غلطی دونوں کی ہوگی۔

میں نے کہا کہ اس سنگین معاملہ کو فساد تک پہنچنے سے جس چیز نے روکا وہ "جوڑو کراٹے" کا فن نہیں تھا۔ بلکہ اخلاق اور حسن کردار تھا۔ ایک استاد کے الفاظ میں ایسا اس لیے ہوا کہ "ہم نے پہلے سے یہ ثابت کر رکھا تھا کہ ہم آپ کے ہمدرد ہیں۔ ہم آپ کے غم میں شریک ہیں"۔

مولانا کبیر الدین صاحب اس علاقہ میں آئے تو پہلے وہ رائے پور میں مقیم ہوئے۔ وہاں آر ایس ایس کا ایک آدمی تھا جس کا نام سری نواس بنسل تھا۔ عام مسلمان اس سے نالاں تھے۔ مگر وہ مولانا کبیر الدین صاحب کا معتقد ہو گیا۔ حتیٰ کہ جب وہ مسروالا آگئے تو وہ ان سے ملنے کے لیے یہاں آنے لگا۔ وہ مولانا کے گھر کا کھانا نہیں کھاتا تھا بلکہ گاؤں میں جا کر کسی ہندو کے یہاں کھاتا۔ مگر مولانا کبیر الدین صاحب سے اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔

گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ سری نواس بنسل کے لیے مولانا کبیر الدین صاحب کی سادگی، اصول پسندی، وقت کی پابندی اور کسی سے نفرت نہ کرنے کا مزاج باعث کشش ثابت ہوا۔

18 نومبر کو ناشتہ کرتے ہوئے میں نے مولانا کبیر الدین صاحب سے پوچھا کوئی ہندو اپنے بچہ کو مدرسہ میں داخل کرنا چاہے تو آپ داخل کریں گے" انہوں نے فوراً کہا کہ ہاں۔ پھر بولے، مگر دار الاقامہ میں نہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیوں۔ انہوں نے کہا کہ اس کو یہاں تنگی ہوگی۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ اگر وہ تنگی کو برداشت کرے تو، انہوں نے کہا پھر تو کوئی ہرج نہیں۔ ہم اس کو دار الاقامہ میں بھی رکھ لیں گے۔

عام طور پر مدارس کا یہ مزاج نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر مدرسہ میں کوئی ہندو بچہ ہوگا تو وہ مدرسہ کے ماحول کو خراب کرے گا۔ حالانکہ یہ بالکل بے بنیاد اندیشہ ہے۔ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔ سیکڑوں اور ہزاروں لوگوں کے ماحول میں ایک غیر مسلم بچہ ہوتو وہ خود متاثر ہوگا نہ یہ کہ وہ دوسروں کو متاثر کر ڈالے۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ 1947 سے پہلے کے دور میں اسی ملک میں مسلم مدارس میں ہندو بچے بھی پڑھتے تھے، اور اس کا نتیجہ اسلام کے لیے بہتر صورت میں نکلتا تھا۔

1992 کے آخر میں فرقہ پرست عناصر نے یہ اعلان کیا کہ 6 دسمبر 1992 کو وہ بڑی تعداد میں ایودھیا میں داخل ہوں گے اور بابری مسجد کو توڑ کر وہاں رام مندر بنائیں گے۔ اس کے بعد ملک میں جگہ جگہ تناؤ پیدا ہوگیا۔ اسی اثناء میں نومبر 1992 میں پونٹا صاحب (ہماچل پردیش) کے پاس ایک گاؤں میں ایک اشتعال انگیز واقعہ ہوا۔ کچھ شرپسندوں نے ایک مسلمان کی زمین پر قبضہ کر کے رات کے وقت وہاں ایک مندر کی تعمیر شروع کر دی۔

دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں، ابھی چھت نہیں بنی تھی کہ وہاں مسلمان آ گئے اور فرقہ وارانہ نزاع کی صورت پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد پولیس کیس بن کر معاملہ عدالت میں پہونچا۔ عدالت نے تحقیقات کے بعد تعمیر کو غیر قانونی قرار دے دیا اور حکم دیا کہ اس کو توڑ کر اس کی سابقہ حالت بحال کر دی جائے۔

اس کے بعد گاؤں میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں پولیس افسر، مقامی ہندو، علاقہ کے ایم ایل اے فتح سنگھ (بی جے پی) وغیرہ شامل تھے۔ مولانا کبیر الدین فاران مظاہری بھی اس میٹنگ میں علاقہ کے عالم کی حیثیت سے موجود تھے۔ لوگ کسی فیصلہ پر نہیں پہنچ رہے تھے۔ کیوں کہ پولیس اگر مندر کو گرا دے تب بھی اندیشہ تھا کہ نفرت اور کشیدگی بڑھے گی اور نئے مسائل کھڑے ہو جائیں گے جس کو روکنے کے لیے کوئی عدالت یا پولیس یہاں موجود نہ ہوگی۔ اس وقت مولانا کبیر الدین مظاہری نے جرأت مندانہ اخلاق کا ثبوت دیا۔ انہوں نے کہا

کہ یہاں پر ایک شبھ کام اشبھ انداز میں ہوا ہے۔ مگر اب چونکہ یہاں مندر کی ایک صورت کھڑی ہوگئی ہے تو لوگ اس کو مندر کے نام سے جانتے ہیں۔ اور اگر اس کو توڑا جاتا ہے تو عوام میں یہ شور ہوگا کہ گاؤں کا ایک مندر توڑ دیا گیا۔ اس سے دونوں فرقوں میں نفرتیں پیدا ہوں گی اور مسئلہ پھر بھی نئی صورت میں باقی رہے گا۔ اس لیے اب ایسا کیا جائے کہ ہندو لوگ اپنا مندر تو وہیں پورا کرلیں۔ البتہ اس کے بجائے مالک زمین کو ایک اور جگہ اس کے معاوضہ میں دے دی جائے۔

اس پر سب لوگ متفق ہو گئے۔ مسلمان مالک کو دوسری زیادہ بہتر زمین اس کے معاوضہ میں دے دی گئی۔ مندر وہیں قائم رہا۔ مگر اس فیصلہ کا زبردست فائدہ یہ ہوا کہ مذکورہ ہندوؤں کے سر شرم سے جھک گئے۔ اور مسلمانوں کو مستقل طور پر اخلاقی برتری حاصل ہوگئی۔

میں اپنے سر پر سفید پگڑی باندھتا ہوں۔ اس کے اندر ٹوپی نہیں ہوتی۔ ایک بزرگ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ آپ کا عمامہ سنت کے مطابق نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ اس طرح عمامہ باندھتے تھے کہ اس کے اندر ٹوپی ہوتی تھی اور آپ کے عمامہ کے نیچے ٹوپی نہیں۔ میں نے کہا کہ اس طرح کے معاملات میں ہمیشہ سنت اجمالی مطلوب ہوتی ہے، نہ کہ سنت کلی۔ اور یہ عین فطرت کا تقاضا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اگر کامل پیروی کو ضروری قرار دیا جائے تو جو لوگ ٹوپی کے اوپر عمامہ باندھتے ہیں ان کا معاملہ بھی مسنون عمامہ نہیں رہے گا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے عمامہ کا کپڑا ہاتھ کا بنا ہوا ہوتا تھا، جب کہ آج کل کے لوگوں کی ٹوپی اور عمامہ دونوں مل کے کپڑے سے تیار کیے جاتے ہیں۔

مدرسہ کے ایک استاذ مولانا انصار الحق مظاہری نے بتایا کہ جب وہ چودہ سال کے طالب علم تھے، مدرسہ کی رسید لے کر وہ چندہ وصول کرنے گئے۔ ایک حکیم صاحب کے یہاں پہونچے جو باقاعدہ عالم بھی تھے۔ انہوں نے بہت سخت انداز اختیار کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں کسی مدرسہ والے کو چندہ نہیں دیتا۔ انصار الحق صاحب نے پوچھا کہ کیوں۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا کہ کیا آپ نے تجربہ کیا ہے یا قیاسی طور پر ایسا کہہ رہے ہیں۔ حکیم صاحب نے اقرار کیا کہ انہوں نے اس سلسلہ میں کوئی ذاتی تجربہ نہیں کیا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی الماری سے الجاحظ کی کتاب ”الحیوان“ نکالی۔ یہ غیر معرب تھی۔ انہوں نے کہا کہ اس کتاب کو آپ نے دیکھا ہے۔ انصاری الحق صاحب جو اس وقت کم عمر تھے، انہوں نے کہا کہ آپ نے یہ کیوں کہا کہ دیکھا ہے۔ آپ کو یہ پوچھنا چاہیے کہ کیا اس کو پڑھا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اچھا بتائیے، کیا آپ نے اس کو پڑھا ہے۔ انصار الحق صاحب نے کہا کہ میں نے اس کو پانچ بار پڑھا ہے۔ اور پھر اس غیر معرب نسخہ کو روانی کے ساتھ پڑھ کر سنانے لگے۔

اس طرح کے کتنے ذہین نوجوان ہمارے مدارس سے پڑھ کر نکلتے ہیں۔ مگر دورِ جدید کی زبان نہ جاننے کی وجہ سے وہ سماج میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے پاتے۔ یہ لوگ اگر دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان بھی سیکھ لیں تو ان کی صلاحیتیں قوم کے لیے کئی گنا زیادہ مفید بن جائیں گی۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کی ضرورتوں میں سے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ ہمارے درمیان بڑی تعداد میں ایسے اہلِ علم ہوں جو بیک وقت عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں اسلام کی ترجمانی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ مگر ایسے افراد اتنے کم ہیں کہ وہ الشاذ کالمعدوم (that which is rare is treated as non-existent) کے درجہ میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔

میں نے مدرسہ قادریہ کے ذمہ داروں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ لوگ اپنے موجودہ نصاب کو چلاتے ہوئے ایک نئے کلاس کا اضافہ کریں۔ اس کو آپ لینگویج کلاس یا لینگویج کورس کہہ سکتے ہیں۔ اس میں صرف فارغ التحصیل افراد کو لیا جائے۔ عربی مدارس کے فارغین کو انگریزی زبان پڑھائی جائے اور انگریزی ادارہ کے تعلیم یافتہ افراد کو عربی زبان سکھائی جائے۔ فی الحال اس کی تعداد صرف دس ہو۔ پانچ عربی داں اور پانچ انگریزی داں۔ ان کو پڑھانے کے لیے دو معلم مقرر کیے جائیں۔ ایک عربی معلم اور ایک انگریزی معلم۔ مدرسہ کے ذمہ داروں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ تاہم اس سلسلہ میں کچھ لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔ مزید تعاون کے بغیر شاید مدرسہ اس کام کو بحسن وخوبی انجام نہ دے سکے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آخر کیا بات ہے کہ غیر مسلموں میں آپ کی بہت پذیرائی ہورہی ہے، ہندوؤں اور عیسائیوں کے جلسوں میں خطاب کرنے کے لیے آپ بار بار بلائے جاتے ہیں، دورجدید میں یہ پہلا واقعہ ہے جو کسی مسلمان عالم کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ آپ کے سوا کسی اور عالم کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا۔

میں نے کہا کہ یہ صرف اسلوب کے فرق کا معاملہ ہے، اصل یہ ہے کہ دوسرے عالم اور رہنما اسلام کو دفاعی نقطہ نظر سے پیش کرتے ہیں۔ جب کہ میں اسلام کو دعوتی اعتبار سے پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے دوسری قوموں کو اسلام کا دشمن سمجھ لیا۔ اس بنا پر ان کی تقریروں میں مناظرانہ اورحریفانہ رنگ آ گیا۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں کسی کو بھی اسلام کا دشمن نہیں سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام دین فطرت ہے اس بنا پر اسلام ہر انسان کا اپنا مطلوب دین ہے۔

میری اس سوچ کی بنا پر میری تقریر میں مذمت کے بجائے محبت ہوتی ہے۔ اس میں اظہار فخر نہیں ہوتا۔ اس میں مناظرہ بازی نہیں ہوتی۔ وہ فطرت کو جگاتی ہے اور ان کے سامنے خدا کے دین کا مثبت تعارف پیش کرتی ہے۔ میں ہندو یا عیسائی کے مقابلہ میں مسلمان کا کیس پیش نہیں کرتا۔ بلکہ سب کو خدا کا بندہ مان کر ان کے سامنے خدا کی بات پیش کرتا ہوں۔ اسلوب کا یہی فرق ہے جس نے ان کی نظر میں میری بات کو پسندیدہ بنا دیا ہے۔

ہماچل پردیش کے مختلف حصوں کا سفر کرتے ہوئے میں نے پایا کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ نفرت اور تعصب نہیں ہے جو دہلی اور یوپی کے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ دونوں خطوں میں اس اعتبار سے واضح فرق ہے۔ اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دہلی اور یوپی کا علاقہ عرصہ دراز تک سیاسی لوگوں کا مرکز رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اس طرح اس علاقہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کا ماحول قائم ہو گیا۔ اس کے برعکس، ہماچل پردیش کا علاقہ کبھی بھی اس قسم کی فرقہ وارانہ سیاست کا مرکز نہیں رہا۔ اس فرق نے دونوں خطوں کے درمیان فرق پیدا کر دیا ہے، جس کو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

انسانی سرگرمیوں کو اگر دو قسم میں بانٹا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ سیاسی سرگرمیاں باہمی نفرت پیدا کرتی ہیں اور تعمیری سرگرمیاں باہمی محبت۔

مدرسہ میں ایک مسلمان بڑھئی کام کر رہے تھے ان کا نام محمد حنیف ہے۔ اس وقت یہاں مسجد میں ماربل لگانے کا کام بھی ہو رہا تھا۔ مذکورہ بڑھئی نے کئی روز ماربل کے مستریوں کو دیکھا۔ انہیں ان کا کام اچھا نہیں لگا۔ اگرچہ خود انہوں نے کبھی ماربل کا کام نہیں کیا تھا۔ اور نہ اس کو کہیں سیکھا تھا۔ تاہم اپنے اندرونی جذبہ کے تحت انہوں نے مدرسہ کے ذمہ داروں سے کہا کہ ماربل لگانے کا کام آپ مجھے دے دیں، میں اس کو کروں گا۔ چنانچہ یہ کام انہیں دے دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ماربل لگانے کا کام شروع کیا اور مستریوں سے کہیں زیادہ اچھا لگایا۔ میں نے بعد میں چاروں طرف دیکھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ کام کسی ماہر کاریگر نے کیا ہے۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ یہ ایک نئے آدمی نے انجام دیا ہے۔

مسلمان آج کل ہر جگہ کاریگری کے کام میں آگے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ تعلیمی پسماندگی نے ان کے اندر نیا جوش پیدا کیا۔ وہ سرگرمی کے ساتھ کاریگری کے کام میں لگ گئے جس میں تعلیم کی ضرورت نہ تھی۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔ آدمی اگر ایک میدان میں ناکام رہے، تو وہ دوسرے میدان میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔

18 نومبر کی سہ پہر کو مسرو الا سے ناہن کے لیے روانگی ہوئی۔ راستہ میں مولانا کبیر الدین صاحب نے ایک بڑے کام کی بات کہی، انہوں نے کہا کہ ”اگر ہمیں دین کا کام کرنا ہے تو ہم کو اسٹیج اور مظاہرہ کا طریقہ چھوڑنا ہوگا“۔

مغرب کی نماز ہم لوگوں نے ناہن میں پڑھی۔ یہاں چار مسجدیں ہیں۔ مسجد کچا تالاب بس اسٹینڈ کے بالکل قریب ہے اور کافی آباد ہے۔ اس مسجد میں نماز مغرب کے بعد جلسہ کا پروگرام رکھا گیا تھا۔

جلسہ سے پہلے کچھ دیر ہم لوگ امام صاحب قاری حسین احمد کے کمرہ میں بیٹھے۔ یہاں صدر

انجمن جناب شیخ نثار احمد ایڈوکیٹ بھی آ گئے۔ وہ میرے مضامین پڑھتے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہماری پالیسی وہی ہے جو آپ بتاتے ہیں۔ یعنی ٹکراؤ سے نہیں بلکہ پیار سے۔

یہ علاقہ ریاست سرمور میں شامل تھا۔ 1947 میں یہاں کے راجہ راجندر پرکاش تھے۔ تمام مسلمان ان کی تعریف کرتے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ 1947 میں جب ہر طرف فساد پھیل گیا تو راجہ راجندر پرکاش نے مسلمانوں کی حفاظت کیے لیے اپنی فوج لگا دی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایک مسلمان بھی یہاں سے چھوڑ کر جائے۔

ڈاکٹر حشمت علی صاحب بھی کمرہ میں آ گئے۔ وہ یہاں مسلمانوں کو تعلیم میں آگے بڑھانے کے لیے کافی کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے ایک بات یہ بتائی کہ ناہن میں دینی کام سب کا سب مقامی چندہ سے ہوتا رہا ہے۔ یہاں کا آدمی کبھی بھی باہر چندہ مانگنے کے لیے نہیں گیا۔

حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: ”ناہن کے مسلمانوں میں جو اجتماعیت ہے وہ بہت کم کسی شہر میں دکھائی دے گی“۔

18 نومبر کی شام کو مغرب اور عشاء کے درمیان تقریر کا پروگرام تھا۔ یہ پروگرام مسجد کے اندر رکھا گیا تھا۔ زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ لیکن شہر کے معروف ہندو بھی قابل لحاظ تعداد میں موجود تھے۔ مہاراجہ سرمور کی بہو انجنا سنگھ بھی شریک تھیں۔ مسٹر آر ایس ورما (سپرنٹنڈنگ انجینئر) اور دوسرے کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو آئے۔ سب نے کہا کہ ہم آپ کے آرٹیکل اخباروں میں پڑھتے تھے۔ اور ہم کو آپ کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔

ناہن سے رات ہی کو ہم لوگ مسروالا کے مدرسہ میں واپس آ گئے۔ یہ مدرسہ بستی سے کچھ باہر واقع ہے۔ 19 نومبر کو میں نے مدرسہ کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھی۔ نماز کے فوراً بعد بستی کے ایک صاحب ملے۔ انہوں نے بستی آ کر یہاں کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھی تھی۔ انہوں نے کہا کہ بستی میں لوگ منتظر ہیں کہ آپ وہاں چل کر انہیں کچھ دین کی باتیں بتائیں۔ فجر کی نماز مدرسہ میں اول وقت غلس (the dim light of early dawn) میں ہوتی ہے۔ اور بستی

کی مسجد میں دیر کے بعد اسفار (صبح کا اجالا نمایاں ہونے کے بعد) ہیں۔ اس طرح ہم لوگوں کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ مدرسہ میں نماز ادا کرنے کے بعد وقت پر بستی کی نماز میں پہنچ سکیں۔

نماز کے بعد مستری یوسف صاحب کے اصرار پر ان کے گھر پر صبح کی چائے پی گئی۔ یہاں بستی کے کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ ان سے مختصر گفتگو ہوئی۔ واپسی کے بعد صبح 9 بجے میری قیام گاہ پر مدرسہ کے اساتذہ اور کچھ دوسرے افراد اکٹھا ہوئے۔ ان کے سامنے علم دین کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ اس سلسلہ میں میں نے مختلف علمی واقعات ماضی اور حال کے سنائے۔ جس میں ہر ایک کے لیے سبق تھا۔

مدرسہ قادریہ اور اطراف کی مسجدوں کی تعمیر میں خاص طور پر جناب حاجی موسیٰ بٹلہ صاحب اور جناب ایف ڈی ریاض الدین وغیرہ کا خصوصی حصہ رہا ہے۔ اس علاقہ کی مسجدیں اور مدرسے ایک زندہ علامت کے طور پر بتا رہے ہیں کہ اہل مال کھلے دل کے ساتھ اہل دین کا تعاون کر رہے ہیں۔ اہل مال اور اہل دین کا یہ اشتراک بلاشبہ ملت کا قیمتی سرمایہ ہے۔

مہمان خانہ کے جس کمرہ میں یہاں میں ٹھہرا تھا، اس کے اندر ایک بڑی الماری تھی جس میں بہت سی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں میں سے ایک کتاب مصنف ابن ابی شیبہ (م 235ھ) کا مکمل سٹ تھا جو 1986 میں کراچی سے تصحیح کے بعد شائع کیا گیا ہے۔

اس کے مختلف حصوں کو دیکھا۔ اس میں زیادہ تر احکام ومسائل والی روایات ہیں۔ الجزء العاشر میں فضائل القرآن کے باب میں ایک روایت میں بتایا گیا تھا کہ صحابہ وتابعین کے زمانہ میں یہ کہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا کہ میں نے پورا قرآن پڑھ لیا: قَرَأْتُ الْقُرْآنَ كُلَّهُ (حدیث نمبر 30092) میں یہ روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر کے ایک شاگرد، حیہ بن سلمہ سے کہا کہ میں نے پورے قرآن کو پڑھ لیا۔ انہوں نے فرمایا کہ تم نے اس میں سے حاصل کیا (قَالَ رَجُلٌ لِحَيَّةَ بْنِ سَلَمَةَ، وَكَانَ مِنْ أَصْحَابِ عَبْدِ اللّٰهِ: قَرَأْتُ الْقُرْآنَ كُلَّهُ: قَالَ: وَمَا أَدْرَكْتَ مِنْهُ؟)۔

دورِاول میں لوگوں کی توجہ اس پر ہوتی تھی کہ انہوں نے قرآن کے کسی حصہ کو پڑھا تو اس سے کیا حاصل کیا۔ اب ساری توجہ اس پر ہوتی ہے کہ انہوں نے قرآن کو کتنی بار ختم کیا۔ پہلے قرآن کے معنوی پہلو پر زور دیا جاتا تھا، اب اس کے الفاظ ہی کو کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ دورِ اول کے مقابلہ میں موجودہ دور میں جو فرق ہے وہ اصل میں یہی ہے۔

19 نومبر کو مسروالا سے سہارن پور کے لیے روانگی ہوئی۔ مولانا انصار الحق مظاہری یہاں کے ایک لائق استاذ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ 1947 سے پہلے ہمارے اکابر نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ ہندستان دارالحرب ہو چکا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ یہاں اسلامی شعائر کی بے حرمتی ہورہی ہے۔ مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے۔ 1947 کے بعد جو دور آیا اس میں شعائر کی بے حرمتی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی اور مذہبی آزادی میں پہلے سے زیادہ رخنے ڈالے جانے لگے۔ مگر اب ہمارے علما اس ملک کے دارلحرب ہونے کا فتویٰ نہیں دے رہے ہیں۔ آخر یہ تضاد کیوں؟

یہ سوال قابل غور ہے۔ اگر 1947 سے پہلے کانپور کی مسجد کا صرف غسل خانہ توڑے جانے سے ہندوستان دارالحرب بن سکتا تھا تو آج وہ شدید تر معنوں میں درالحرب قرار پائے گا۔ کیوں کہ آج پوری مسجد توڑ کر اس کو مٹادیا گیا ہے۔

اس تضاد کی وجہ یہ ہے کہ 1947 سے پہلے ہندستان کو دارالحرب قرار دینے کا جو فتویٰ دیا گیا وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک سیاسی فتوی تھا، نہ کہ کوئی دینی فتویٰ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ثنائیت (dichotomy) بجائے خود درست نہیں۔ اس فقہی تقسیم کے مطابق، جو ملک دارالاسلام نہ ہو وہ دارالحرب قرار پاتا ہے۔ حالانکہ ''دار'' کی اور بھی قسمیں ہوسکتی ہیں— دارالدعوۃ اور دارالامن، وغیرہ۔

میرے نزدیک ہندستان نہ 1947 سے پہلے دارالحرب تھا اور نہ وہ 1947 کے بعد دارالحرب ہے۔ اس قسم کی دوگونہ تقسیم قرآن وحدیث میں موجود نہیں۔ وہ عباسی دور کے بعض

فقہاء نے زمانی حالات کی بناء پر بنائی تھی۔ اس تقسیم کو شریعت کی طرح ابدی قرار دینا ہرگز درست نہیں۔

شام کو ہم لوگ رائے پور پہنچے۔ یہاں کچھ دیر مدرسہ فیض ہدایت رحیمی میں ٹھہرے۔ عصر کی نماز بھی اسی مدرسہ کی مسجد میں پڑھی گئی۔ مدرسہ کے مہمان خانہ میں اساتذہ جمع ہو گئے۔ ان کے سامنے بعض موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ مدارس کے لیے آپ کا مشورہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مدارس خدا کے فضل سے بہت اہم کام انجام دے رہے ہیں۔ وہ ملت کے خیمہ کے لیے کھونٹے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آج کل مدارس کے خلاف جو بدگمانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کو دور کرنے کا حل نہ احتجاج ہے اور نہ حکومت کے ذمہ داروں سے مل کر مطالبات کا میمورنڈم پیش کرنا۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہم خود کوشش کر کے لوگوں کی غلط فہمیوں کو دور کریں۔ اس کا سب سے طاقتور ذریعہ یہ ہے کہ مدارس قرآن کی آیت: وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (13:17) کا مصداق بنیں، یعنی، جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے، وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اپنے ماحول میں اپنے آپ کو نفع بخش بنائیں اور اس طرح اپنے لیے ایک نئی زندگی کا استحقاق ثابت کریں۔

ظہر کی نماز کسی قدر تاخیر کے ساتھ بادشاہی باغ کی مسجد میں پڑھی گئی۔ میں نے سوچا کہ سڑک کے کنارے مسجدوں کا ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہاں مسلمان وقفہ وقفہ سے کچھ وقت کے لیے ٹھہرتے ہیں۔ وہ وضو کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ سفر کے دوران بار بار وہ ان مسجدوں میں لمحاتی قیام کر کے خدا کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے سفر دنیا کو سفر آخرت کا ایک حصہ بنا لیتے ہیں۔

اس کے بعد ہماری گاڑی ایک مقام پر مڑی۔ اب وہ رائے پور جا رہی تھی۔ پانچ کلومیٹر کا یہ راستہ اس طرح طے ہوا کہ سڑک کے کنارے بہتی ہوئی نہر، اور پھر دونوں طرف دور تک سر سبز مناظر۔ اس کو دیکھ کر میرے سینہ میں شکر کا بے پناہ جذبہ ابھر آیا۔ میں نے سوچا کہ اس دنیا

میں مومن کی سب سے بڑی کمائی یہ ہے کہ وہ شکر خداوندی کا رزق پا سکے۔ دنیا کے کسی خطہ ارض میں جب تک مومن کو شکر الٰہی کا رزق مل رہا ہے وہ محروم نہیں ہے۔ وہ عظیم سرمایہ کا مالک ہے۔ اس نعمت کے ملتے ہوئے دوسری چیزوں سے محرومی پر واویلا کرنا۔ ایک قسم کی ناشکری ہے جو مومن کے لیے جائز نہیں۔

سہارن پور میں ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک مسجد ہے۔ یہاں مغرب کی نماز پڑھی گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر اٹھا تو میرے ساتھی مسجد میں نظر نہیں آئے۔ میں حیران تھا کہ وہ لوگ کہاں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد ایک ساتھی آئے۔ ان سے اصل بات معلوم ہوئی۔

سہارن پور سے مجھے شتابدی اکسپریس کے ذریعہ دہلی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ سفر سے واپسی کے بعد نظام الدین کی کالی مسجد میں نماز کے لیے گیا تو یہاں ایک پوری تاریخ یاد آ گئی۔ یہ مسجد جس کو کالی مسجد یا کلاں مسجد کہا جاتا ہے، آج ایک وسیع اور شاندار مسجد دکھائی دیتی ہے۔ مگر 1947 میں یہ ایک کھنڈر کی صورت میں تھی جس پر کچھ لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ میوات کے حافظ عبد الغفور صاحب نے اس کو دوبارہ آباد کرنے کی خاموش کوشش شروع کر دی۔ لمبی جدو جہد کے بعد یہ مسجد دوبارہ مسلمانوں کو مل گئی۔ اس کے بعد حافظ عبد الغفور صاحب کے بھانجے مولانا محمد ہارون صاحب کی مسلسل کوشش کا مزید نتیجہ یہ ہوا کہ آج یہ مسجد اس علاقہ کی سب سے زیادہ شاندار مسجد کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ حافظ عبد الغفور صاحب 72 سال کی عمر میں دسمبر 1992 میں وفات پا گئے۔

حافظ عبد الغفور صاحب بظاہر ایک غیر معروف شخص تھے مگر انہوں نے معروف شخصیتوں سے زیادہ بڑا کام کیا۔ ان کی شروع سے یہ کوشش رہی کہ غیر آباد مسجدیں آباد ہوں اور مدارس کا قیام زیادہ سے زیادہ عمل میں آئے۔ انہوں نے اپنی لگن اور جدو جہد سے 22 غیر آباد مسجدیں آباد کرائیں، اور 15 مدرسے قائم کیے۔ دہلی میں جو مسجدیں انہوں نے آباد کرائیں ان میں سے چند یہ ہیں: فیروز شاہی جامع مسجد، بستی نظام الدین۔ جامع مسجد ڈیفنس کالونی، جامع مسجد خیر المنازل

بالمقابل چڑیا گھر، مسجد پنج پیراں وغیرہ۔اسی طرح مدرسہ زینت القرآن حوض رانی، مدرسہ اشاعت الاسلام(واقع فیروزشاہی جامع مسجد)، مدرسہ تعلیم القرآن جامع مسجد ڈیفنس کالونی، وغیرہ۔

حافظ صاحب نے جب بھی کوئی مسجد آباد کی یا کوئی مدرسہ قائم کیا تو ان مقامات پر اپنا قبضہ جمانے کے بجائے لائق شخصیات کو وہاں متعین کر کے ان کو ان کے حوالے کر دیا، مثلاً خیر المنازل میں مولانا الیاس امینی کو امام متعین کیا۔ اسی طرح ڈیفنس کالونی کی جامع مسجد میں مولانا محمد عیسیٰ کو امام مقرر کیا۔ وہ مدرسہ تعلیم القرآن کے مہتمم اور ناظم بھی ہیں۔ مولانا عیسیٰ نے اپنی محنت سے اس مسجد اور مدرسہ کو کافی وسیع کرلیا ہے۔ وہاں آج ہزاروں کی تعداد میں مسلمان نماز جمعہ وعیدین ادا کرتے ہیں۔ کلاں مسجد بستی نظام الدین میں اپنے بھتیجے مولانا محمد ہارون کو مقرر کیا۔ حافظ عبدالغفور صاحب اپنے بھتیجے مولانا محمد ہارون کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے اور اس طرح ان کی تربیت کرتے رہتے۔ ابتداء سے ہی کلاں مسجد بستی نظام الدین کا نظم وضبط مولانا ہارون کے ذمہ رکھا۔ مولانا ہارون صاحب کا کام گویا کہ حافظ صاحب کے خواب کی عملی تعبیر ہے۔ مولانا ہارون آج بھی کلاں مسجد کی تعمیر وتوسیع کے سلسلہ کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مسجد کے اندر حافظ صاحب کا قائم کیا ہوا مدرسہ اشاعت الاسلام بھی ترقی کر رہا ہے۔ اس میں بیرونی طلبہ کے قیام وطعام کا معقول انتظام ہے۔ دوسری جگہوں کی نگرانی بھی حافظ صاحب نے انہیں کے سپرد کی۔ تمام مقدمات کی پیروی بھی مولانا ہارون صاحب ہی کرتے رہے۔ مولانا ہارون صاحب کو آخر وقت تک حافظ صاحب کی یہی تاکید تھی کہ مسجد کو کبھی سیاسی اکھاڑہ نہ بننے دینا۔

حافظ صاحب کی عمر کا ایک طویل عرصہ آثار قدیمہ، ڈی ڈی اے، کارپوریشن، تیس ہزاری کورٹ، دہلی وقف بورڈ اور جمعیۃ علما کے چکر کاٹنے میں گزرا۔ کیوں کہ انہوں نے پر امن اور قانونی ذرائع سے یہ کامیابی حاصل کی اور ایک تعمیری جدو جہد کی تاریخ چھوڑی۔

1947 کے بعد مسلمانوں میں بہت سے مثبت کام ہوئے ہیں۔ یہ تمام کام زیادہ تر انہیں لوگوں نے کیے ہیں، جنہوں نے مسجد اور مدرسہ کو اپنے عمل کا میدان بنایا ور خاموش اور پر امن

انداز کو اپنی جدوجہد کے لیے اختیار کیا۔ اس کے برعکس، معاملہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے وہ طریقہ اختیار کیا جس کو عام طور پر سیاسی طریقہ کہا جاتا ہے، ایسے لوگوں نے ملت کو صرف نقصان پہنچایا، وہ ملت کو کوئی بھی مثبت تحفہ نہ دے سکے۔

حافظ عبدالغفور صاحب جیسے بہت سے خاموش دینی خادم ملک میں موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد اور مدرسے کی راہ سے کام کرنے کا طریقہ ہی صحیح اور نتیجہ خیز طریقہ ہے، سیاسی ہنگامہ آرائی صرف شخصی لیڈری ہے، نہ کہ واقعی معنوں میں کوئی ملی اور دینی کام۔

(الرسالہ مئی 1999)

استقلال کا کرشمہ

دارالعلوم دیوبند اب عربی اور دینی علوم کی مشہور ترین درس گاہ ہے۔ اس میں ہزاروں طلبہ پڑھتے ہیں اور اس کا بجٹ ایک کروڑ روپیہ تک پہنچ گیا ہے۔ مگر آغاز میں وہ ایک معمولی مدرسہ سے بھی کم تھا۔

15 محرم 1383ھ (30 مئی 1867ء) کو دیوبند کی چھتہ مسجد میں یہ تعلیمی ادارہ شروع ہوا۔

اس وقت اس میں صرف دو آدمی تھے۔ ایک استاد اور ایک طالب علم۔ اس کے پہلے استاد کا نام ملا محمود تھا، اور اس کا پہلا طالب علم وہ نوجوان تھا جس نے بعد کو مولانا محمود (شیخ الہند) کے نام سے شہرت پائی۔

یہ استقلال کا کرشمہ ہے، کوئی کام اگر شروع کیا جائے اور شروع کرنے کے بعد اس کو برابر جاری رکھا جائے تو طویل مدت گزرنے کے بعد بالآخر وہ اسی طرح کامیاب ہوتا ہے جس طرح دیوبند کا تعلیمی ادارہ کامیاب ہوا۔ (ڈائری، 28 مارچ 1983)

جامعہ دارالسلام کا سفر

جنوبی ہند میں ایک بڑا تعلیمی ادارہ ہے، جو جامعہ دارالسلام، عمرآباد (تمل ناڈو) کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ابتدائی طور پر 1924 میں قائم ہوا اور اب وہ ایک بڑا تعلیمی مرکز بن چکا ہے۔ وہ انڈیا کے چند بڑے اسلامی مدارس میں سے ایک ہے۔ اِس ادارے کی دعوت پر جنوبی ہند کا سفر ہوا۔ 7 جون 2010 کی صبح کو دہلی سے روانگی ہوئی، اور 11 جون 2010 کی شام کو دوبارہ دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔ اِس سفر میں مولانا محمد ذکوان ندوی میرے ساتھ تھے۔

اِس سفر کے لیے ہمارا رزرویشن جیٹ ائرویز سے تھا۔ دہلی کا ائر پورٹ دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے۔ دہلی سے مدراس (چنئی) کی دوری ایک ہزار سات سو کلومیٹر (1,700 km) ہے۔ یہ سفر تقریباً ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا۔ ائر پورٹ کے عملہ میں مدراس کے ایک صاحب انجینئر محمد آزاد جہاز سے اترتے ہی مل گئے۔ انہوں نے بسہولت ائر پورٹ کی تمام کارروائی مکمل کردی۔ ہم لوگ ائر پورٹ سے باہر نکلے تو وہاں جامعہ دارالسلام کی طرف سے مولانا فیاض الدین عمری اور مولانا سید اقبال احمد عمری اپنے کئی ساتھیوں کے ساتھ موجود تھے۔ مدراس سے جامعہ دارالسلام 180 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ سفر بذریعہ کار طے ہوا۔ روڈ بہت اچھی تھی۔ یہ وہی روڈ ہے جس کو نیشنل ہائی وے (نمبر 46) کہا جاتا ہے۔ اس ہائی وے کو ایک مسلم بلڈر نے بنایا ہے۔

ہماری کار کے ڈرائیور مسٹر مورتی (44 سال) تھے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے بتایا کہ وہ 30 سال سے ڈرائیونگ کا کام کررہے ہیں، مگر اُن کے ساتھ کبھی روڈ ایکسیڈنٹ کا معاملہ پیش نہیں آیا۔ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ڈرائیونگ کے لیے ان کا سادہ فارمولا یہ ہے — پہلے سیفٹی پھر اسپیڈ۔ یہ فارمولا صرف کامیاب ڈرائیونگ کے لیے نہیں ہے، بلکہ اِس فارمولے کی یکساں اہمیت کامیاب قیادت کے لیے بھی ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلم قائدین نے مسلم

ملت کو ہر جگہ صرف تباہی سے دوچار کیا ہے۔ اِس کا سبب یہی ہے کہ وہ مذکورہ ڈرائیور کی طرح قیادت کا کامیاب فارمولا دریافت نہ کرسکے۔

راستے میں ہم لوگ عصر کی نماز پڑھنے کے لیے میل وشارم (Melvisharam) میں کچھ دیر کے لیے ٹھہرے۔ میل وشارم، ضلع ویلور (Vellore) کا ایک خوب صورت ٹاؤن ہے۔ یہ مدراس سے 100 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں مسلم تاجروں نے کئی اچھے کالج اور ہاسپٹل قائم کیے ہیں۔ انھیں اداروں میں سے ایک عربی مدرسہ مفتاح العلوم ہے۔ وہ 1976 میں قائم کیا گیا۔ یہاں حفظ کے علاوہ، عالمیت تک درسِ نظامی کی تعلیم ہوتی ہے۔ طلبا کی تعداد تقریباً 500 ہے۔ مفتی ریاض احمد قاسمی اس کے مہتمم ہیں۔ یہاں کے وسیع مہمان خانے میں اساتذہ کی ایک نشست ہوئی۔ اِس موقع پر میں نے جو گفتگو کی، اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ہندستان میں پچھلی صدیوں میں افغانستان اور ایران وغیرہ کے راستے سے مسلم سلاطین آئے۔ اِن سلاطین نے صرف اپنی سلطنتیں قائم کیں اور سیاسی فتوحات کی تاریخ بنائی۔ انہوں نے یہاں حقیقی معنوں میں کوئی دینی کام انجام نہیں دیا۔ اب ان کی یادگار صرف قلعے اور مقبرے ہیں، اِس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہندستان میں حقیقی معنوں میں مثبت دینی کام اُن لوگوں نے انجام دیا جن کو علما اور صوفیا کہا جاتا ہے۔ علما نے مدرسے قائم کرکے دینی علم کو زندہ رکھا۔ صوفیا نے خانقاہوں کے ذریعے دعوت اور روحانیت اور اخلاقیات کا عمل انجام دیا۔

مدرسہ اور خانقاہ کا طریقہ دوسرے الفاظ میں، غیر سیاسی دائرے میں جدوجہد کا طریقہ ہے۔ تبلیغی جماعت ایک اعتبار سے اِسی طریقِ عمل کا ایک تسلسل ہے۔ انڈیا کی اِس انفرادی صفت کی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ موجودہ زمانے میں یہاں ملٹنسی (militancy) نہیں پھیلی، جیسا کہ اکثر مسلم ملکوں میں ہوا ہے۔ مثلاً پاکستان، افغانستان، ایران، وغیرہ۔ میل وشارم میں عصر کی نماز پڑھنے کے بعد ہم لوگ آگے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں ہمارے ساتھیوں نے اساتذہ اور طلبا کو دعوتی لٹریچر دیا۔

یہ پورا سفر فطرت کے ماحول میں ہوا۔ کشادہ سڑک کے دونوں طرف سرسبز درختوں کے مناظر تھے۔ یہ عام طور پر ناریل کے درخت تھے۔ درختوں کے پیچھے پہاڑی سلسلے نظر آرہے تھے۔ ہلکی بارش نے موسم کو نہایت خوشگوار بنا دیا تھا۔ سڑک کے کنارے کہیں کہیں خوب صورت گاؤں نظر آتے تھے۔

سفر کے دوران ہمارے ساتھی برابر موبائل کے ذریعے باہر کی دنیا سے ربط قائم کیے ہوئے تھے۔ ایک طرف دہلی کے لوگوں سے، اور دوسری طرف عمر آباد کے لوگوں سے۔ دہلی سے عمر آباد تک ہمارے ساتھیوں کو پتہ تھا کہ اِس وقت ہم کہاں ہیں۔ یہ سفر کا ایک نیا تصور ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ جولوگ شکایتوں میں جیتے ہیں، وہ بظاہر انسان کے شاکی ہوتے ہیں، لیکن حقیقتاً وہ خداوند ذوالجلال کی ناشکری کا ارتکاب کررہے ہیں۔ اگر وہ سوچیں تو اِس طرح کا سفر قدیم زمانے میں کسی بادشاہ کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ ہم لوگ دہلی میں کار سے روانہ ہوئے۔ اس کے بعد ہم ہوائی جہاز کے ذریعے مدراس پہنچے۔ اس کے بعد ہم دوبارہ کار کے ذریعے جامعہ دارالسلام جارہے ہیں۔ یہ سفر اِس طرح طے ہورہا ہے کہ ہم لوگ ایک طرف اپنے دہلی کے ساتھیوں سے اور دوسری طرف جامعہ دارالسلام کے لوگوں سے پوری طرح مربوط ہیں۔ قدیم زمانے میں اِس قسم کا سفر کسی بادشاہ کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ ایسی حالت میں ہم کو سُپر شکر میں جینا چاہیے، نہ کہ ناشکری میں۔

مدراس سے 180 کلومیٹر کا سفر طے کر کے ہم لوگ 7 جون 2010 کی شام کو مغرب کے بعد جامعہ دارالسلام پہنچے۔ یہاں ہمارا قیام جامعہ کی لائبریری (مکتبہ عمر) کی جدید عمارت میں تھا۔ یہ ایک وسیع دومنزلہ عمارت ہے۔ اس میں کتب خانہ، ریڈنگ روم، لیکچر ہال اور کچھ کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا قیام اِسی مکتبہ کے ایک کمرے میں تھا۔

عمر آباد میں کاکا فیملی کا ایک کافی بڑا فارم ہاؤس ہے۔ معلوم ہوا کہ جامعہ کے ذمے داران میرے قیام کا انتظام اِسی فارم ہاؤس میں کررہے تھے۔ لیکن مولانا کاکا انیس احمد عمری نے اِس

سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اِس طرح میں طلبا اور اساتذہ سے دور ہو جاؤں گا اور زیادہ ملاقاتیں اور انٹریکشن نہ ہوسکے گا۔ چنانچہ مولانا کاکا انیس احمد عمری کی مداخلت سے، میرے لیے لائبریری کی مذکورہ عمارت میں قیام کا انتظام کیا گیا۔ یہ میرے ذوق کے عین مطابق تھا۔ اِس طرح میرے لیے ممکن ہو گیا کہ جامعہ میں قیام کے دوران وہاں کے مواقع کو میں پوری طرح استعمال کرسکوں۔

ہم لوگ مغرب کی نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ جامعہ کے ذمے داران اور اساتذہ ملاقات کے لیے آ گئے — مولانا کاکا سعید احمد عمری (معتمد عمومی جامعہ)، مولانا کاکا انیس احمد عمری، مولانا ڈاکٹر عبد اللہ جولم عمری مدنی، مولانا ابو البیان حماد عمری، وغیرہ۔ اِن حضرات سے کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ ان کے ذریعے جامعہ دار السلام کے بارے میں کئی معلومات حاصل ہوئیں۔

میں نے کہا کہ جامعہ دار السلام کے بانی جناب کاکا عمر (وفات 1928) واقعی معنوں میں ایک صاحبِ بصیرت انسان (man of vision) تھے۔ وہ اگرچہ ایک تاجر تھے، لیکن انھوں نے جدید دور کے لیے تعلیم کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے مطابق، جامعہ دار السلام کی بنیاد رکھی، جو اب اپنی وسعت اور اہمیت کے اعتبار سے ایک دینی یونی ورسٹی کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

گفتگو کے دوران مولانا کاکا سعید احمد عمری نے جو باتیں بتائیں، اُن میں سے ایک یہ تھی کہ اِس علاقے میں کوئی ہندو مسلم مسئلہ نہیں۔ یہاں دونوں فرقوں کے لوگ باہم بھائی کی طرح رہتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات جیسی کوئی چیز یہاں کبھی پیش نہیں آئی۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کے بارے میں اردو اخبارات کے متعصّبانہ بیان کو میں درست نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ آزادی کے بعد ہمارے علاقے میں 18 بڑے مسلم کالج قائم کیے گئے ہیں جن کو حکومت کا گرانٹ حاصل ہے۔ یہ تمام مسلم کالج نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ملت کی تعمیر کا کام موثر طور پر صرف اُس وقت

ہوسکتا ہے جب کہ اُس کو سیاست سے الگ رکھ کر کیا جائے۔ مولانا کاکا سعید احمد عمری نے اِس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی (وفات 1956) نے یہ تصور پیش کیا تھا کہ کالجوں میں تعلیم پانے والے مسلم طلبا کے لیے شہروں میں مسلم ہاسٹل بنائے جائیں۔ یہاں ان کی رہائش کا انتظام ہو اور اِسی کے ساتھ ان کی دینی تربیت کی جائے۔ شمالی ہند میں سیاسی ذہن کی بنا پر اِس قسم کا کوئی ہاسٹل نہ بن سکا، مگر جنوبی ہند کے مسلمانوں میں چوں کہ سیاسی ذہن نہیں تھا بلکہ تعمیری ذہن تھا، اِس لیے انھوں نے جنوبی ہند میں اِس طرح کے مسلم ہاسٹل بنائے۔ مثلاً حیدرآباد میں اور بنگلور میں۔ بنگلور کا ہاسٹل زیادہ بڑا ہے اور اس کا نام یہ ہے — بنگلور مسلم سنٹرل ہاسٹل۔

اِس مجلس میں جو باتیں ہوئیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ مسلم دنیا میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ امریکا اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ عرب لوگ کہتے ہیں کہ: آمریکا عدوّ الإسلام رقم واحد۔ میں نے کہا کہ میں 13 بار امریکا گیا ہوں، اور اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا نہ پرو مسلم (pro-Muslim) ہے، اور نہ اینٹی مسلم (anti-Muslim)۔ وہ صرف پرو امریکا (pro-America) ہے۔ امریکا میں بلا امتیاز ہر ایک کو پوری آزادی حاصل ہے۔ چنانچہ مسلمان اِس آزادی کو استعمال کرتے ہوئے وہاں بڑے بڑے اسلامی کام کر رہے ہیں۔ موجودہ زمانے میں 57 مسلم ملک ہیں۔ مگر یہ کہنا غالباً درست ہوگا کہ اِس وقت اسلام کی خدمت کے جتنے مواقع امریکا میں ہیں، وہ غالباً کسی مسلم ملک میں بھی نہیں۔ کاکا سعید احمد عمری نے اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر کہا کہ میں آپ کی اِس بات سے پوری طرح اتفاق رکھتا ہوں۔

مجلس میں گفتگو کے دوران ایک صاحب نے کہا امریکا کی ترقی کا راز یہ ہے کہ دنیا کے اعلیٰ ذہن رکھنے والے افراد کو امریکا خرید لیتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ خرید و فروخت کی بات نہیں ہے، بلکہ یہ مواقع (opportunities) کی فراہمی کی بات ہے۔ امریکا نے یہ کیا کہ اُس

نے وہاں ہر قسم کے اعلیٰ مواقع فراہم کردیے — اظہارِ خیال کی مکمل آزادی، مطالعے کے لیے بہترین لائبریریاں، لیاقت کا بلا امتیاز اعتراف، ترقی کے مواقع کو ہر ایک کے لیے یکساں طور پر کھولنا، وغیرہ۔ اِس بنا پر تمام دنیا کے ذہین لوگ وہاں پہنچ گئے۔

7 جون 2010 کو عشاء کی نماز جامعہ دار السلام کی قدیم مسجد (قائم شدہ 1344ھ/ 1925ء) میں ادا کی گئی۔ نماز کے بعد مسجد میں یہاں کے کئی اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک جامعہ کے شیخ التفسیر مولانا سید عبد الکبیر عمری صاحب تھے۔ ان کی پیدائش 1923 میں ہوئی۔ انہوں نے جامعہ دار السلام میں تعلیم پائی، پھر وہ یہیں استاد کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔ معمر ہونے کے باوجود وہ ابھی تک پوری طرح صحت مند ہیں۔

نماز کے بعد ہم لوگوں کو کاکا سعید احمد عمری کے گھر لے جایا گیا جو عمر آباد میں مسجد کے بالکل قریب واقع ہے۔ یہاں شام کا کھانا کھایا گیا۔ کھانے کی میز پر تقریباً 10 آدمی موجود تھے۔ کھانے کے بعد یہاں دیر تک نشست ہوئی جس میں مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہوا۔

مولانا کاکا سعید احمد عمری نے کہا کہ جامعہ کے اندر مسلکی تعصب اور تنگ نظری نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو آپ کا مسلک معلوم ہے۔ آپ کے مسلک سے اتفاق کی بنا پر ہی ہم نے جامعہ میں آپ کو دعوت دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ — مجموعی اتفاق ہی کا نام اتفاق ہے۔ جزئی اختلافات تو ہر جگہ اور ہر شخص کے اندر پائے جاتے ہیں۔

مولانا فیاض الدین عمری نے کہا کہ میں اِس کی تائید کروں گا کہ جامعہ کے اندر مسلکی تشدد بالکل نہیں پایا جاتا۔ انہوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ میں نے جامعہ کے سینئر استاد دکتور عبد اللہ جولم صاحب سے بدایۃ المجتہد پڑھی ہے۔ مولانا اگرچہ سلفی ہیں، مگر دلیل کی موجودگی میں انہوں نے ہمیشہ ائمہ کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ اور کبھی اُن سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے کا بھی اظہار فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جامعہ کے ذمے داران مسلک کے اعتبار سے اگرچہ سلفی ہیں، لیکن جامعہ کی قدیم مسجد میں وہاں کے امام ایک حنفی ہیں۔ جامعہ کے

اندر لمبی مدت گزارنے کے باوجود ہم کو بہت سے اساتذہ کا مسلک معلوم نہیں۔ انہوں نے کہا کہ جامعہ کا ایک امتیاز یہ ہے کہ یہاں کے ذمے داران ہمیشہ اپنے چھوٹوں سے رائے لیتے ہیں اوران کوآگے بڑھاتے ہیں۔

گفتگو کے دوران کاکا سعید عمری صاحب نے کہا کہ عام طور پر لوگ دوستوں کو حقِ تنقید دیتے ہیں، مگر وہ اجنبی آدمی کو حق تنقید نہیں دیتے۔ اگر کوئی اجنبی آدمی ان پر تنقید کردے تو وہ بپھر اٹھتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ دوستوں کے علاوہ، اجنبی لوگوں کو بھی حقِ تنقید دے۔ وہ ایک اجنبی آدمی کی بات کو بھی اُسی طرح سنے جس طرح وہ اپنے دوستوں کی بات کو سنتا ہے۔ کاکا سعید احمد عمری نے گفتگو کے دوران کہا کہ جامعہ دارالسلام کا نشانہ بنیادی طور پر صرف دو چیزیں ہیں — دعوت، اور آخرت۔ دعوت برائے آخرت اور آخرت برائے دعوت، یہی جامعہ کا اصل نشانہ ہے۔

اِس سلسلے میں طلبہ جامعہ کے سامنے کاکا سعید احمد عمری کے ایک بصیرت افروز خطاب کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے: ”اِس وقت ہم علمائے کرام کو اپنی ذمے داری کو محسوس کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ ہم برادران وطن کے ساتھ اپنے تعلقات کو بڑھائیں، انھیں اپنی محبت کا موضوع بنائیں، اپنی تقریبات میں انھیں مدعو کریں اور جب بھی، جہاں بھی موقع ملے، اُسے غنیمت جان کر انھیں اسلام کا صحیح تعارف کرانے اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ بدقسمتی سے ہمارے رہنماؤں نے امت کو برادرانِ وطن کے ساتھ نفرت کرنا ہی سکھایا ہے، اُن سے محبت کرنا نہیں سکھایا۔ برادرانِ وطن ہمارے لیے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تک ہم اُن کے ساتھ محبت سے پیش نہیں آئیں گے، ذرا سوچیے، اُس وقت تک وہ ہماری باتوں پر کیسے توجہ دیں گے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُنھیں ابدی جہنم سے بچانے کی فکر اور تڑپ ہمارے دل میں کیسے پیدا ہوگی“۔ (ماہ نامہ راہِ اعتدال، عمرآباد، جون2010، صفحہ51)

7 جون 2010 کی شام کا کھانا اِس انداز کا تھا جس کو عام طور پر ''پُرتکلف عشائیہ'' کہا جاتا ہے۔ بعد کو میں نے یہاں کے منتظمین سے کہا کہ میں اِس قسم کے کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ میں یہاں جب تک ہوں، میں صرف جامعہ کے مطبخ (مطعم) کا کھانا کھاؤں گا، یعنی وہ کھانا جو جامعہ کے طلبا کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے کھانے کا ٹائم بھی وہی ہوگا جو جامعہ میں عام طور پر طلبا کے کھانے کا ٹائم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب تک میں یہاں رہا، مطبخ کا کھانا کھاتا رہا۔ یہ کھانا بالکل سادہ تھا اور میرے ذوق کے عین مطابق تھا۔

مولانا اسرار الحسن عمری جو یہاں ہم لوگوں کے کھانے وغیرہ کے ذمے دار تھے، انہوں نے بتایا کہ اگلے دن صبح کو مجھے جامعہ کے دفتر میں بلایا گیا۔ نائب ناظم جامعہ مولانا ظفر الحق شاکر عمری نے مجھ سے پوچھا کہ مولانا وحید الدین خاں صاحب کے کھانے وغیرہ کا کیا انتظام ہے۔ میں نے کہا کہ مولانا نے کہا ہے کہ میں جب تک جامعہ میں ہوں، مطبخ کا کھانا کھاؤں گا۔ میرے لیے الگ سے کوئی اہتمام نہ کیا جائے۔ میری بات سن کر نائب ناظم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ: فَكُلُّ مُشْكِلَةٍ حُلَّتْ (پھر تو ساری مشکل آسان ہوگئی)۔ کیوں کہ مہمانوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ان کے کھانے کا ہوتا ہے۔

مولانا کاکا سعید احمد عمری صاحب کے گھر سے کھانا کھا کر ہم لوگ واپس جامعہ کے کیمپس میں آ گئے۔ یہاں کئی علما کے ساتھ میں دیر تک جامعہ کی کھلی فضا میں واک (walk) کرتا رہا۔ میں نے کہا کہ قرآن کی سورہ آل عمران میں ذکر کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَاماً وَقُعُوداً وَعَلَى جُنُوبِهِمْ (3:191)۔ یعنی، کچھ لوگ کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے اپنے تجربے کے مطابق، اِس میں ایک اور ذکر کا اضافہ کیا ہے، اور وہ ہے واکنگ ذکر (walking zikr)۔ میرا معمول ہے کہ میں روزانہ واک کرتا ہوں۔ مگر میری واک صرف واک نہیں ہوتی، بلکہ وہ واکنگ ذکر ہوتی ہے۔

ذکر کیا ہے۔ ذکر دراصل تفکر کا نام ہے۔ سلفِ صالحین نے ذکر کا یہی مطلب بتایا ہے۔

مثال کے طور پر ملاحظہ ہو علامہ ابن القیم الجوزیۃ (وفات 751ھ) کی کتاب: مفتاح دار السعادۃ ومنشور ولایۃ العلم والإرادۃ۔ علامہ ابن قیم نے اِس کتاب میں تذکر اور تفکر کو ہدایت کی اصل قرار دیا ہے (اَلتَّفَکُّرُ وَالتَّذَکُّرُ أَصْلُ الْهُدَیٰ وَالْفَلَاحِ، هُمَا قُطْبَا السَّعَادَةِ)۔ تفکر کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مثلاً یہاں آپ جامعہ کے کیمپس میں واک کر رہے ہیں۔ یہاں چاروں طرف سرسبز درخت کھڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نے درخت کو دیکھا۔ آپ کو یاد آیا کہ درخت اپنے اندر ایک انوکھی صفت رکھتا ہے، وہ یہ کہ وہ ایک نمو پذیر وجود (growing entity) ہے۔ درخت کے بارے میں اِس طرح سوچتے ہوئے آپ کو یاد آیا کہ ایمان کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ایمان بھی ایک نمو پذیر حقیقت ہے۔ حقیقی ایمان وہی ہے جس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ اِسی لیے قرآن میں کلمۂ ایمان کو درخت سے تشبیہ دی گئی ہے (ابراہیم، 14:24)۔ البتہ دونوں کے درمیان ایک فرق ہے۔ وہ یہ کہ درخت کی نمو پذیری قانونِ فطرت کے تحت ہوتی ہے، لیکن انسان خود اپنے ارادے کے تحت غور وفکر کرتا ہے اور اِس طرح وہ خود اپنے ارادے کے تحت اپنے ایمان میں اضافہ کرتا ہے۔

واک کرنے کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ (مکتبہ عمر) پر آ گئے۔ یہاں کمرے میں دوبارہ تقریباً 10 علما اکٹھا ہو گئے۔ ان سے دیر تک دینی اور دعوتی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اُس وقت ایک بات میں نے یہ کہی کہ جو لوگ صرف عوام کے درمیان کام کرتے ہیں، عام طور پر ان کا ذہنی ارتقا نہیں ہوتا۔ لیکن جو لوگ خواص کے درمیان دعوتی کام کریں، ان کا مسلسل ذہنی ارتقا ہوتا رہے گا۔ گویا کہ عوام کے درمیان دعوتی کام یک طرفہ نوعیت کا کام ہے، یعنی ایک سننے والا ہے اور دوسرا سنانے والا۔ اِس کے برعکس، خواص کے درمیان دعوتی کام دوطرفہ عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس میں ایک طرف مدعو کو نئی باتیں ملتی ہیں، اور دوسری طرف داعی کو ڈسکشن اور ڈائلاگ کے دوران نئی نئی باتیں سیکھنے کا موقع ملتا ہے — پہلا طریقہ اگر یک طرفہ تعلیم (unilateral learning) پر مبنی ہے، تو دوسرا طریقہ دوطرفہ تعلّم (bilateral learning) پر مبنی۔

اِسی طرح میں نے ایک بات یہ کہی کہ قرآن میں چار قابلِ انعام گروہوں کا ذکر آیا ہے: الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ (4:69)۔ یعنی، وہ گروہ جن پر اللہ نے انعام کیا، یعنی پیغمبر اور صدیق اور شہید اور صالح۔ میں نے کہا کہ میری سمجھ کے مطابق، اِس آیت میں انبیاء سے مراد پیغمبر ہیں، اور صدیقین سے مراد اصحابِ پیغمبر، اور شہداء سے مراد دعاۃ کا گروہ ہے۔ صالحین سے مراد وہ افراد ہیں جن کے لیے قرآن میں دوسری جگہ مقتصد (فاطر، 35:32) کا لفظ آیا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ معرفت کے تمام درجات اپنی نوعیت کے اعتبار سے آج بھی پوری طرح کھلے ہوئے ہیں، حتی کہ وہ اعلیٰ درجہ بھی جس کے بارے میں حدیث میں اِس قسم کے الفاظ آئے ہیں: إِنَّ لِلَّهِ عِبَادًا لَيْسُوا بِأَنْبِيَاءَ وَلَا شُهَدَاءَ يَغْبِطُهُمْ، النَّبِيُّونَ وَالشُّهَدَاءُ عَلَى مَجَالِسِهِمْ وَقُرْبِهِمْ مِنَ اللَّهِ (مسند احمد، حدیث نمبر 22906)۔ یعنی، بے شک اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوں گے جو نہ نبی ہوں گے اور نہ شہید، مگر ان کی مجلسوں اور اللہ کے قرب کی وجہ سے انبیاء اور شہداء بھی ان پر رشک کریں گے۔ انبیاء کے اِس رشک کا سبب غالباً یہ ہوگا کہ جو درجۂ معرفت انبیاء نے فرشتہ جبریل کے ذریعے حاصل کیا، اُسی نوعیت کی معرفت یہ لوگ فرشتہ جبریل کے بغیر حاصل کرلیں گے۔ معرفت کا یہ حصول بعد کے زمانے میں اہلِ ایمان کے لیے سائنسی دریافتوں کے ذریعے ممکن ہو سکے گا۔

دہلی کے مقابلے میں عمر آباد کا موسم بہت خوش گوار تھا۔ دہلی میں درجۂ حرارت 41 ڈگری تھا، جب کہ یہاں کا درجہ حرارت 31 ڈگری ہے۔ رات نہایت سکون کے ساتھ گزری۔ 8 جون 2010 کو فجر کی نماز ہم لوگوں نے جامعہ دار السلام کے کیمپس کے اندر واقع مسجد سلطان میں پڑھی۔ یہ مسجد 1993 میں بنائی گئی۔ مسجد کافی وسیع اور سادہ تھی۔ عام روایت کے خلاف اِس مسجد میں صرف ایک مینار بنایا گیا ہے۔ ایک مینار کا طریقہ مجھے پسند ہے۔ ایک مینار توحید کی علامت معلوم ہوتا ہے۔

ہم لوگ نماز سے فارغ ہو کر باہر آئے تو ہر طرف فطرت (nature) کا ماحول تھا۔

جامعہ دارالسلام اِس طرح بنایا گیا ہے کہ اس کے اندر ہر طرف سرسبز درخت دکھائی دیتے ہیں۔ جامعہ کی تعمیر دراصل ایک وادی (valley) میں ہوئی ہے۔ اس کے بیرونی حصے میں دور تک پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ جامعہ کے مغرب میں جو پہاڑی سلسلہ ہے، وہ وہی ہے جس کو ''کیلاش گری'' کہا جاتا ہے۔

جامعہ میں قیام کے دوران ہر وقت علما کا ساتھ ہوتا تھا۔ اِس واک کے دوران بھی کئی علما ہمارے ساتھ تھے۔ میں نے کہا کہ جامعہ کا یہ خوش منظر جائے وقوع دیکھ کر مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے بہت پہلے ماہ نامہ الرسالہ میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس کا عنوان تھا— فطرت کی آغوش میں۔

اِس مضمون میں میں نے لکھا تھا کہ میری تمناؤں میں سے ایک تمنا یہ ہے کہ فطرت کے مناظر کے درمیان ایک دینی مرکز بنایا جائے۔ یہ مرکز گویا کہ ہمارے افکار کا ایک عملی مظاہرہ ہوگا۔ یہاں جب خدا کی عظمت بیان کی جائے گی تو درخت اور پہاڑ اور آسمان اس کی عملی تصدیق کررہے ہوں گے، اور چڑیاں اپنے چہچہے کے ساتھ اس کی ہم آواز بنی ہوئی ہوں گی۔ اب جامعہ دارالسلام کو دیکھنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا خواب یہاں واقعہ بن چکا ہے۔ کیوں کہ جامعہ کا مقصد بھی تقریباً وہی ہے جس کو میں نے نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے اپنا مشن بنا رکھا ہے، یعنی دعوت الی اللہ کا مشن۔ ہماری اِس واک کے دوران دوسرے علمائے جامعہ کے علاوہ، جامعہ دار السلام کے دونوں بڑے ذمے دار بھی موجود تھے— مولانا کاکا سعید احمد عمری، اور مولانا کاکا انیس احمد عمری۔

واک کرنے کے دوران میں نے ایک بات یہ کہی کہ یہاں آ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جامعہ دار السلام دوسرے مدارس کے مقابلے میں ایک استثنا (exception) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی کچھ منفرد خصوصیات ہیں۔ مثلاً یہاں کی مسجد میں اکثر اوقات طلبا امامت کرتے ہیں۔ ہر نماز ایک الگ طالب علم پڑھاتا ہے۔ ایسا اِس لیے کیا جاتا ہے تاکہ طلبا کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ تعلیم کے دوران تربیت بھی حاصل کرتے رہیں۔

مارننگ واک (morning walk) کے بعد ہم لوگ لائبریری کی عمارت کے باہر کھلی فضا میں بیٹھ گئے۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ یہاں مولانا کاکا سعید احمد عمری کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ اور کئی دیگر علما موجود تھے۔ دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک صاحب نے یہ سوال کیا کہ مدارس کے ذمے داران اکثر یہ شکایت کرتے ہیں کہ اِن مدارس کے ذریعے تعلیم کا مقصد تو حاصل ہوا، لیکن افراد سازی کا مقصد بہت کم حاصل ہوسکا۔

میں نے کہا کہ اِس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی شخصیت اس کے شاکلہ (17:84) کے مطابق بنتی ہے۔ شاکلہ سے مراد ذہنی سانچہ (mindset) ہے۔ ہمارے مدارس کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں کا پورا ماحول قدیم شاکلہ پر مبنی ہوتا ہے، جب کہ موجودہ زمانے میں حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ طلبا کو لسانِ عصر میں مخاطب کیا جائے، ورنہ ان کا مائنڈ ایڈریس نہ ہوگا۔ یہی وہ کمی ہے جس کی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ تعلیم دین کے کافی پھیلاؤ کے باوجود ایسے افراد پیدا نہیں ہورہے ہیں جو جدید معیار پر اسلامی ذہن کے حامل ہوں اور جدید انسان کے سامنے موثر انداز میں اسلام کی نمائندگی کرسکیں۔

میں نے کہا کہ الرسالہ مشن دراصل اِسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے شروع کیا گیا۔ غالباً یہ کہنا درست ہوگا کہ پوری مسلم دنیا میں یہ واحد مشن ہے جو اِس فکری ضرورت کو پورا کررہا ہے۔ 1959 میں ایک مشہور ہندستانی عالم کی ایک کتاب چھپی۔ اس کا ٹائٹل یہ تھا: ردّۃ ولا أبا بکر لہا۔ میں نے اِس معاملے کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ جدید انسان کا کیس ذہنی ارتداد (intellectual apostasy) کا کیس نہیں ہے، بلکہ وہ ذہنی عدم اطمینان (intellectual dissatisfaction) کا کیس ہے۔ الرسالہ مشن کے تحت 1976 سے اِس بنیاد پر کام شروع کیا گیا ہے اور اب اللہ کے فضل سے ہر جگہ اس کے مثبت اثرات سامنے آرہے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے آپ کی کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔ مگر اس میں تعقل پسندی

بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ اِس کی کوئی مثال دیجیے، مگر وہ کوئی مثال نہ بتا سکے۔ میں نے کہا کہ جب تک آدمی کے پاس کوئی متعین مثال نہ ہو، اُس وقت تک اِس طرح کا تبصرہ کرنا آدمی کے لیے سرے سے جائز ہی نہیں۔ پھر میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ آپ جیسے لوگ دو چیزوں میں فرق نہیں کر پاتے۔ ایک ہے تعقل پسندی اور دوسری چیز ہے اسلوب جدید۔ معروف معنی میں، میں ہرگز تعقل پسند نہیں ہوں، البتہ میری تحریروں میں جدید اسلوب ہوتا ہے۔ آپ جیسے لوگ دونوں میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ میں ایک تعقل پسند انسان ہوں۔ حالاں کہ مجرد تعقل پسندی ایک غیر مطلوب چیز ہے اور اسلوب جدید بلاشبہ عین مطلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں نے کہا کہ عقل کے استعمال کی دو صورتیں ہیں—ایک یہ کہ عقل کو بذاتِ خود صحیح اور غلط کا معیار سمجھا جائے۔ دوسرے یہ کہ نقلی (traditional) طور پر ایک ثابت شدہ بات کی مزید تائید کے لیے عقل کا استعمال کیا جائے۔ عقل کا اِس طرح تائیدی استعمال خود قرآن سے ثابت ہے۔ مثال کے طور پر جدید عقل پسند انسان یہ کہتا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان ہر اعتبار سے کامل مساوات ہونا چاہیے۔ میں اِس عقلی نقطۂ نظر کو نہیں مانتا۔ اِس کے بجائے میں قرآن کے نقطۂ نظر کو مانتا ہوں جس میں عورت اور مرد کے درمیان فطری فرق کی بنا پر ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی کو معتبر قرار دیا گیا ہے (البقرۃ، 2:282)۔ قرآن کے اِس نقطۂ نظر کی تائید کے لیے میں نے ایک سائنسی دلیل دی ہے۔ وہ یہ کہ عورت اور مرد کے دماغ میں فطری بناوٹ کے اعتبار سے ایک ناقابلِ تغیر فرق پایا جاتا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ مرد پیدائشی طور پر single focussed mind ہوتا ہے، اور اس کے مقابلے میں عورت فطری طور پر multi focussed mind رکھتی ہے۔ اس کی تفصیل آپ ماہ نامہ الرسالہ (اپریل 2006، صفحہ 7) میں دیکھ سکتے ہیں۔

8 جون 2010 کی صبح کو جامعہ کے کُلّیہ ہال میں ایک بڑا پروگرام ہوا۔ یہ یہاں کے

زمانۂ قیام کا پہلا پروگرام تھا۔ یہاں میں نے دعوت الی اللہ کے موضوع پر کچھ باتیں کہیں۔ اس کے بعد میں نے اس پروگرام میں جو مزید باتیں کہیں، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جامعہ سے میرا ایک فطری تعلق رہا ہے۔ جامعہ دارالسلام 1924 میں قائم ہوا، اور یہی وہ سال ہے جب کہ میری پیدائش ہوئی۔ جامعہ سے اِسی بلا اعلان تعلق کی بنا پر ایسا ہوا کہ میں نے اپنے پہلے فرزند ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کو 1957 میں تعلیم کے لیے یہاں بھیجا۔ جامعہ کے لیے میرا پہلا سفر 1977 میں ہوا۔ یہ سفر جامعہ کی دعوت پر 18-16 اپریل 1977 کو اس کی گولڈن جُبلی (المہرجان الذہبی) میں شرکت کے لیے ہوا۔ اِس موقع پر میں نے ایک مقالہ پیش کیا تھا جو ماہ نامہ الرسالہ، جولائی 1977، میں شائع ہوا۔ اِس مقالے کا عنوان یہ تھا:

دعوت اسلامی کے جدید امکانات

بعد کو یہ مقالہ عربی زبان میں ”امکانات جدیدة للدعوة“ کے نام سے پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ یہ مقالہ 36 صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کو قاہرہ سے المختار الِاسلامی پبلشر نے پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا تھا۔ اب وہ مقالہ راقم الحروف کی کتاب ”ظہور اسلام“ میں ”اسلامی انقلاب: تاریخِ انسانی کے لیے نیا موڑ“ کے عنوان سے شامل ہے۔ اس سفر کی مختصر روداد اُسی زمانے میں ماہ نامہ الرسالہ، اگست 1977 میں چھپی تھی (صفحہ 52)۔

جامعہ دارالسلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں آغاز ہی سے تعارف اسلام کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس کا باقاعدہ آغاز 1978 میں ہوا، جب کہ یہاں تعارف اسلام کے نام سے ایک مستقل شعبہ کھلا اور اس کے لیے ایک علاحدہ عمارت بنائی گئی جو اب بھی قائم ہے۔ یہ ایک سالہ کورس ہے اور اِس میں مدارسِ عربیہ سے فارغ حضرات کو داخلہ دیا جاتا ہے۔

صبح کے اس پہلے پروگرام کے بعد دوسرا پروگرام لائبریری کے ہال میں تھا۔ یہ ایک گھنٹے کا پروگرام تھا۔ یہ پروگرام جامعہ کے اساتذہ کے لیے خاص تھا۔ اِس میں جامعہ کے تمام اساتذہ شریک تھے۔ اساتذہ کے اِس اجتماع میں گفتگو کا موضوع ”تعلق مع اللہ“ تھا۔ اِس موقع پر میں نے جو باتیں کہیں، اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ تعلق باللہ کا مطلب ہے— ذکر اللہ، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: كَانَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم يَذْكُرُ اللَّهَ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 373)۔ یعنی ہر حین (occasion) کو پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بنا کر اللہ کو یاد کرنا۔ میں نے کہا کہ تعلق باللہ ایک مسلسل عمل کا نام ہے جو تدبر اور تفکر اور توسم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ ذکر اللہ کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ذکرِ کثیر وردِ کثیر کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ تفکرِ کثیر کا نام ہے۔

آخر میں سامعین کی طرف سے مختلف سوالات کیے گئے۔ ایک سوال یہ تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے آج اپنی صبح کی تقریر میں موثر دعوت کے لیے صبر کی اہمیت بتائی تھی اور یہ واقعہ بیان کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ایک بدو مدینہ آیا اور اس نے مسجد نبوی کو گندا کردیا۔ آپ نے اُس سے درگزر کا معاملہ فرمایا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6128)۔ مگر سوال یہ ہے کہ اُس بدو نے نادانی میں ایسا کیا تھا، مگر آج مسلمانوں کے خلاف اِس قسم کے واقعات عداوت کی بنیاد پر ہو رہے ہیں، پھر اس سے کیسے درگزر کیا جاسکتا ہے۔

میں نے کہا اِس سوال کا جواب صبح کے اجتماع میں قاری صاحب نے اپنی تلاوت کے ذریعہ دے دیا ہے۔ انھوں نے قرآن کی یہ آیت پڑھی تھی: ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (41:34)۔ یعنی تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔

اِس آیت کے مطابق ہم کو ''عدو'' کے ساتھ بھی وہی حسنِ سلوک کرنا ہے جو نادان کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی ردعمل کا طریقہ اپنانے کے بجائے صابرانہ طریقہ اپنانا۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ مسلمانوں کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں، مسلمان تو مسلسل صبر ہی کر رہے ہیں، لیکن اُنھیں صبر کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے، وہ برابر ذلت و ناکامی کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ

(2:153)۔ یہ آیت اِس بات کا ثبوت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان مطلوب صبر نہیں کر رہے ہیں۔ اگر وہ مطلوب صبر کر رہے ہوتے تو قرآن کے بیان کے مطابق، یقیناً وہ "ذلت و ناکامی" کا شکار نہ ہوتے۔ کیوں کہ قرآن کے مطابق، صبر کرنے والوں کو اللہ کی نصرت حاصل ہوتی ہے، اور اللہ کی نصرت کے بعد کسی کے لیے ذلت و ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔

صبر کا مطلب کیا ہے۔ صبر کا مطلب نہ پسپائی ہے اور نہ بے عملی۔ صبر دراصل یہ ہے کہ آدمی ٹکراؤ کو اوائڈ کر کے مثبت بنیاد پر اپنے عمل کا منصوبہ بنائے۔ صبر یہ ہے کہ آپ اپنے دل سے نفرت کو ختم کر دیں، تشدد کے مزاج کو ختم کر دیں، لڑنے کے مزاج کو ختم کر دیں، اشتعال سے پرہیز کریں۔ اِس طرح کے مثبت اوصاف کو پیدا کرنے کے بعد جو تعمیری منصوبہ بنایا جائے، اسی کا نام صبر ہے۔

پروگرام کے بعد مولانا کا کا سعید احمد عمری نے کہا کہ آپ نے بے حد قیمتی باتیں بتائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ تقریر کے اختتام پر اساتذہ کو ہمارے یہاں کا چھپا ہوا لٹریچر دیا گیا۔ ہال میں میز پر موجود سارا لٹریچر اُسی وقت ختم ہو گیا۔ اساتذہ نے خود سے یہ لٹریچر حاصل کیا، اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

8 جون 2010 کی سہ پہر کو تین بجے سے چار بجے تک عوام کے درمیان کام کر رہے علما کے ساتھ "تبادلۂ خیال" کا پروگرام تھا۔ میں نے پروگرام کے آغاز میں تقریباً 25 منٹ تک دعوت کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ ایک بات میں نے یہ کہی کہ دعوت کا عمل ایک اعتبار سے دوطرفہ ایکسچینج (exchange) کا عمل ہے۔ دعوت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دوسروں کے سامنے ایک بات کا اعلان کر دیں، بلکہ دعوت کے دوران آپ کو خود بھی سیکھنا چاہیے۔ دعوتی عمل کا فائدہ خود داعی کو ذہنی ارتقا کی صورت میں ملنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ مطالعہ کتب کو اپنے ڈیلی رُوٹین میں شامل کر لیں۔ اِسی کے ساتھ آپ میں سے ہر شخص ڈائری بھی ضرور رکھے۔ ڈائری گویا کہ کتابِ محاسبہ ہے۔ دُعاۃ کو ایک

اور مشورہ میں نے یہ دیا کہ آپ لوگ اپنا دعوتی عمل خاص طور پر اُن لوگوں کے ساتھ کریں جن سے آپ کی علمی سطح بڑھنے والی ہو — دینا وہی دینا ہے جب کہ دینے کے عمل کے دوران آدمی نے خود بھی کچھ پایا ہو۔

تقریر کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔ ایک سوال یہ تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ میں گزشتہ ایک سال سے ماہ نامہ الرسالہ اور آپ کی دیگر کتابوں کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مطالعے کے دوران میں نے پایا کہ آپ ذہنی ارتقاء پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ذہنی ارتقا اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں "ازدیادِ ایمان" کہا گیا ہے۔ لوگ ازدیادِ ایمان کو ایک پراسرار چیز سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ازدیادِ ایمان ایک معلوم چیز ہے اور اس کا تعلق انسانی دماغ سے ہے۔ وہ غور وفکر کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جس کو قرآن میں تدبر وتفکر اور توسم کہا گیا ہے۔ وہ چیز جس کو قربِ الٰہی کہا جاتا ہے، اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ یہی ذہنی ارتقا ہے۔ ذہنی ارتقا سے آدمی کو معرفت حاصل ہوتی ہے، اور معرفت انسان کو اللہ سے قریب کرنے والی ہے۔

8 جون 2010 کو عصر کی نماز کے بعد جامعہ دار السلام کی مسجد میں ایک خطاب رکھا گیا۔ اِس میں جامعہ کے طلبا اور اساتذہ دونوں شریک تھے۔ اِس خطاب کا موضوع تھا: معرفتِ الٰہی۔

میں نے کہا کہ معرفت کیا ہے۔ معرفت یہ ہے کہ انسان حالتِ غیب میں اپنے رب کو پہچانے، وہ دیکھے بغیر اس کو دیکھ لے۔ معرفت دراصل یہ ہے کہ آدمی کو خدا کی موجودگی (presence of God) کا حسّیاتی تجربہ ہونے لگے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں: وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (96:19) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی، سجدہ کر اور قریب ہوجا۔ اور حدیث میں اس کے لیے یہ الفاظ آئے ہیں: تَعْبُدُاللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 50)۔ یعنی، تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور معرفت کے حصول کی بھی ایک قیمت ہے، وہ قیمت بنیادی طور پر یہ ہے کہ آدمی پردۂ التباس (element of doubt) کو پھاڑ کر حقیقت اعلیٰ کو دیکھ سکے۔ پردہ التباس کو پھاڑنے میں وہی شخص کامیاب ہوسکتا ہے جو اپنے آپ کو ہر قسم کے ڈسٹریکشن (distraction) سے بچائے، جو اپنے آپ کو کامل یکسوئی کے ساتھ معرفت کے حصول میں لگادے۔ ڈسٹریکشن میں ہر وہ چیز شامل ہے جو آدمی کی توجہ کو مقصدِ اعلیٰ سے ہٹانے والی نہ ہو۔ اِس میں ہر قسم کے منفی جذبات بھی شامل ہیں۔ مثلاً نفرت، تعصب، فخر، احساسِ برتری، اور خواہش کی پیروی، وغیرہ۔

اِس سلسلے میں ایک بات میں نے یہ بتائی کہ انسان کو جو دماغ دیا گیا ہے، وہ بے پناہ صلاحیتوں کا حامل ہے، وہ کوئی عبث چیز نہیں ہے۔ وہ اِس لیے ہے کہ آدمی اپنے دماغ کو اَن فولڈ (unfold) کرے اور اس کو حقائقِ ربانی کی دریافت کے لیے استعمال کرے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کلماتِ رب (لقمان، 31:27) اتنے زیادہ ہیں جن کی کوئی حد نہیں۔ اِسی کے ساتھ انسانی دماغ کے جو امکانات (potential) ہیں، وہ بھی لامحدود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک فرد کے دماغ میں جتنے پارٹکل ہوتے ہیں، وہ پوری کائنات میں موجود پارٹکل کے برابر ہیں۔ انسان کو یہ غیر معمولی صلاحیت اِس لیے دی گئی ہے کہ وہ اس کو استعمال کرکے معرفتِ اعلیٰ کو حاصل کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت میں اہلِ جنت کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ (شُغلِ فاکہ) یہ ہوگا کہ وہ لامحدود کلماتِ رب کو ابدی طور پر دریافت کرتے رہیں۔ موجودہ دنیا دراصل اِس لیے ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جنت کے اِس لامحدود عمل کے لیے تیار (prepare) کرے۔ جنت کی سب سے بڑی خوشی حصول معرفت کی خوشی ہے۔ حصولِ معرفت کا یہ سفر جنت میں ابدی طور پر جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ، جنت میں جو مادی نعمتیں ملیں گی، وہ دراصل ضیافتِ ربّانی کے طور پر ملیں گی یہی وہ بات ہے جو قرآن میں اِن الفاظ میں کہی گئی ہے: نُزُلاً مِنۡ غَفُوۡرٍ رَحِیۡمٍ (41:32)۔ یعنی، بخشنے والے، مہربان کی طرف سے مہمانی کے طور پر۔

خطاب کے بعد سوال وجواب کا پروگرام تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ حصول معرفت کی نسبت سے قدیم روایتی دور اور جدید سائنسی دور میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ معرفت کا اصل ذریعہ تخلیقاتِ خداوندی میں تدبر اور تفکر ہے۔ یہی علمائے راسخین کا مسلک ہے۔

امام ابن تیمیہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ کائنات میں پھیلی ہوئی خدائی نشانیوں پر غور وفکر کرنا ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے آدمی اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت حاصل کرتا ہے: أَنَّ التَّفْكِيرَ فِي الآلَاءِ وَالنِّعَمِ يُمْكِنُ لِلْعَقْلِ أَنْ يَسْتَنْبِطَ فِيهَا عَظَمَةَ الصَّانِعِ وَحِكْمَتَهُ وَمَا يَلِيقُ بِهِ مِنْ صِفَاتِ الْكَمَالِ وَالْجَلَالِ، فَيَعْرِفَهُ حَقَّ مَعْرِفَتِهِ (دقائق التفسیر، الجامع لتفسیر ابن تیمیہ، 1/49)۔ یہ تدبر اور تفکر قدیم زمانے میں بھی مطلوب تھا، اور آج بھی اسی کے ذریعے کسی آدمی کو معرفتِ خداوندی مل سکتی ہے۔ اِس اعتبار سے، قدیم دور اور جدید دور میں کوئی فرق نہیں، البتہ جدید سائنسی دور میں معلومات کے اضافے کی بنا پر تدبر کا فریم ورک (frame work) بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔

پروگرام ختم ہوا تو مغرب کی نماز میں تقریباً نصف گھنٹہ باقی تھا۔ ہم لوگ کچھ دیر کے لیے کلیہ بلڈنگ کے دفتر میں بیٹھ گئے۔ یہاں جامعہ کے مختلف اساتذہ اور دیگر علما موجود تھے۔ مولانا سید اقبال احمد عمری نے کہا کہ آج کی تقریر (معرفتِ الٰہی) میں آپ نے جنت اور کلماتِ رب کے بارے میں جو کچھ کہا، اُس سے جنت اور آخرت کی معنویت پوری طرح کھل گئی۔ میں نے کہا کہ جنت کا یہ تصور اُس سوال کا واحد جواب ہے جو تمام اہلِ علم کو پریشان کیے ہوئے ہے۔ تمام فلاسفہ اور مفکرین اور سائنس داں مشترک طور پر اس مسئلے سے دوچار ہیں کہ اتنی زیادہ بامعنیٰ (meaningful) کائنات کیا ایک بے معنی انجام (meaningless end) پر ختم ہوجائے گی۔ جنت کا تصور واحد تصور ہے جو اِس سوال کا جواب فراہم کرتا ہے۔ لیکن جنت کے ماننے والوں نے جنت کی جو تصویر بنا رکھی ہے، اُس میں اُنھیں اپنے اِس سوال کا جواب نہیں ملتا۔

8 جون 2010 کو مغرب کی نماز کے بعد ہم لوگ اپنے کمرے میں آ گئے۔ یہاں جناب

ریاض موسی مالاباری سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اِس کے علاوہ، وہ ہماری کتاب ”تعبیر کی غلطی“ کا ملیالم ترجمہ شائع کررہے ہیں۔ ان کی مادری زبان ملیالم ہے۔ انھوں نے میرے حالات اور مشن کو لے کر ایک تفصیلی انٹرویو لیا جس کو وہ ملیالم اخبار میں شائع کریں گے۔

آج شام کو مولانا کاکا سعید احمد عمری سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے تزکیہ اور روحانیت کے مسئلے پر تفصیلی گفتگو کی۔ یہ گفتگو تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ بعد کو اِس مجلس میں دیگر علما کے علاوہ، مولانا فیاض الدین عمری اور مولانا سید اقبال احمد عمری، وغیرہ آ گئے۔ کاکا صاحب اپنے مزاج کے اعتبار سے بہت صاف دل آدمی ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اِس مجلس میں مولانا فیاض الدین عمری نے مجھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں نے پایا ہے کہ کاکا صاحب کا سب سے بڑا کنسرن (concern) یہ ہے کہ جامعہ دار السلام کے طلبا اور اساتذہ میں تزکیہ اور روحانیت پیدا ہو۔ یہ بات سن کر کاکا صاحب فوراً سنجیدہ ہو گئے اور انھوں نے کہا کہ آپ لوگ غلط بات کیوں کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کہیے کہ خود مجھے تزکیہ اور روحانیت کی ضرورت ہے۔

8 جون 2010 کو ہم نے عشاء کی نماز عمر آباد کی مسجد میں ادا کی۔ نماز کے بعد جامعہ کے ایک سینئر استاذ اور سابق شیخ الحدیث مولانا ظہیر الدین اثری رحمانی صاحب کے گھر پر کھانے کا پروگرام تھا۔ وہ جامعہ کیمپس کے باہر عمر آباد میں رہتے ہیں۔ وہ 1920 میں (اعظم گڑھ، یوپی) میں پیدا ہوئے اور بعد کو عمر آباد میں آ کر بس گئے۔ وہ 1958 سے مستقل طور پر عمر آباد میں مقیم ہیں۔ گذشتہ 50 سال سے وہ جامعہ میں حدیث کے استاذ ہیں اور اِسی کے ساتھ افتاء کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔ اپریل 1977 میں انھیں کی خصوصی دعوت اور تحریک پر میں نے جامعہ دار السلام کا سفر کیا تھا۔

عمر آباد آنے سے پہلے میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں کسی کے گھر دعوتی کھانا کھانے کے لیے نہیں جاؤں گا۔ میں صرف جامعہ میں کھانا کھاؤں گا۔ مگر بعض وجوہ سے استثنائی طور پر مولانا

ظہیر الدین صاحب کے یہاں کھانے کے لیے جانا منظور کرلیا۔ اِس موقع پر جامعہ کے کئی علما بھی شریک تھے۔ یہاں جو باتیں ہوئیں، اُن میں سے ایک یہ تھی کہ میں نے ذکر کی وضاحت کی۔ میں نے کہا کہ ذکر سب سے بڑی ہستی کو یاد کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اِس لیے ذاکر کے اندر اُسی عظیم ہستی کی نسبت سے کیفیات پیدا ہونی چاہئیں۔ جس ذکر میں ذاکر کے اندر ربانی کیفیات پیدا نہ ہوں، وہ ذکر ایسا ہی ہے جیسے پلاسٹک کا بنا ہوا گلاب کا پھول۔ بظاہر وہ پھول ہے، لیکن اس سے آدمی کو کوئی خوشبو نہیں ملتی۔ ایک حقیقی پھول آدمی کو اپنی خوشبو سے معطر کر دیتا ہے۔ اِسی طرح حقیقی ذکر وہ ہے جو آدمی کو اعلیٰ ربانی کیفیات سے معمور کردے۔

9 جون 2010 کی صبح کو نمازِ فجر کے بعد کچھ دیر ہم لوگوں نے جامعہ کے کمپس میں واک کی۔ اِس کے بعد مولانا سید اقبال احمد عمری نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں کچھ دیر کے لیے ان کے گھر جاؤں اور وہاں صبح کی چائے پیوں۔ میں نے کہا کہ عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ چائے پر بلاتے ہیں اور پھر پر تکلف ناشتے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ آپ کے یہاں صرف چائے ہوگی اور دوسرا کوئی بھی آئٹم نہ ہوگا، تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے وعدہ کیا۔ چنانچہ میں ان کے یہاں گیا اور واقعتاً انھوں نے اپنے وعدے کو نبھایا۔

اِس مجلس میں اور بھی کئی علما موجود تھے — مولانا محمد ابراہیم عمری، مولانا کاکا انیس احمد عمری، وغیرہ۔ یہاں جو باتیں ہوئی، اُن میں سے ایک یہ تھی۔ میں نے کہا کہ آج کل تسبیح فاطمہ کا بہت رواج ہے۔ لیکن یہ لوگ تسبیح فاطمہ کو اس کی پوری شکل میں نہیں لیتے، بلکہ ادھوری شکل میں لیتے ہیں۔ جیسا کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ تسبیح اپنی صاحب زادی فاطمہ کو خادم کے بدل کے طور پر بتائی تھی۔ مگر آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے تسبیح فاطمہ کو اس کے پس منظر سے الگ کرلیا ہے اور وہ اس کو پراسرار فضیلت کے طور پر پڑھتے ہیں، حتی کہ اس کی بنیاد پر تسبیح کا بہت بڑا کاروبار ساری مسلم دنیا میں قائم ہے۔ مزید یہ کہ پہلے وہ اپنی صاحب زادیوں کے لیے ہر قسم کی مادّی سہولت فراہم کرتے ہیں اور پھر تبرک کے طور پر ان کو تسبیح اور مصلی بھی دے دیتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی بعض باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ذکر کے فارم کا انکار کرتے ہیں، حالاں کہ ذکر کا فارم تو قرآن میں موجود ہے۔ میں نے کہا کہ یہ اعتراض محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذکر الفاظ کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کسی بھی چیز کا تصور کرنے کے لیے الفاظ کا محتاج ہے۔ اِسی طرح ذکر کے لیے بھی الفاظ ضروری ہیں۔ میں دراصل ذکر کی موجودہ شکل کو ذکر کا تصغیری فارم سمجھتا ہوں، جس میں ذکر کو اس کی اسپرٹ سے الگ کردیا گیا ہے۔

ذکر کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے قرآن کی اِس آیت کا مطالعہ کیجیے: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ (8:2)۔ یعنی، ایمان والے وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں۔ قرآن کی اِس آیت کے مطابق، ذکر وہ ہے جو اگر چہ الفاظ کی صورت میں ظاہر ہو، لیکن اپنی داخلی کیفیت کے اعتبار سے وہ ایک ہلچل کی مانند ہو، جس سے ذاکر کا قلب دہل اٹھے، جو اس کے دل ودماغ کے لیے ایک طوفانی تجربہ بن جائے، جو آدمی کے لیے خداوند ذوالجلال کی دریافت کے ہم معنی بن جائے۔

گفتگو کے دوران کاکا انیس احمد عمری سے میں نے پوچھا کہ آپ کی فیملی ایک جوائنٹ فیملی ہے۔ جوائنٹ فیملی میں طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں آپ لوگ کس طرح اِس مسئلے کو حل کرتے ہیں۔ کاکا انیس صاحب نے کہا کہ اِس کا فارمولا ہے — صبر وبرداشت سے کام لینا اور دوسروں کی کمی کو نظر انداز کرنا۔ اِس میں سب سے اہم رول گھر کے بڑے کا ہوتا ہے۔ گھر کا بڑا اگر دانش مندی سے کام لے تو کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوتا — یہ فارمولا مجھے بہت پسند آیا۔ یہ سادہ بھی ہے اور پوری طرح قابلِ عمل بھی، مگر اکثر لوگ اِس حقیقت کو نہیں جانتے۔

9 جون 2010 کا پروگرام صبح 10 بجے سے شروع ہونے والا تھا۔ اِس سے پہلے کئی علما میرے کمرے میں آگئے۔ اُن سے دیر تک گفتگو ہوئی۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ نے

ایک مجلس میں کہا تھا کہ ذکر تجدید شعور کا نام ہے، تکرارِ لفظی کا نام ذکر نہیں، حالاں کہ احادیث میں بہت سی روایات ذکر کے سلسلے میں آئی ہیں۔ میں نے کہا کہ جو کچھ میں نے کہا تھا، اُس کا تعلق نفسِ ذکر سے نہیں ہے، بلکہ تصورِ ذکر سے ہے۔ ذکر کی اہمیت بلا شبہ بہت زیادہ ہے، لیکن ذکر سے مراد تکرارِ معانی ہے، نہ کہ مجرد تکرارِ الفاظ۔ جب انسان اپنے خالق کو یاد کرتا ہے تو اس کے دل و دماغ میں ایک تموج پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ داخلی تموج جب الفاظ کی صورت میں ڈھل جائے تو اسی کا نام ذکر ہے۔

مجلس کے دوران مولانا کاکا سعید احمد عمری میرے کمرے میں آئے۔ اس وقت وہاں کئی اساتذہ اور دُعاۃ بیٹھے ہوئے تھے، جو اُن کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ کاکا صاحب نے ان لوگوں کو سختی کے انداز میں کھڑے ہونے سے منع کیا اور کہا کہ آپ لوگ جیسے بیٹھے ہیں، اُسی طرح بیٹھے رہیں، اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اِس کے بعد کاکا صاحب خاموشی کے ساتھ کمرے کے ایک طرف خالی جگہ دیکھ کر بیٹھ گئے — یہ منظر میں نے صرف جامعہ دار السلام میں دیکھا۔

9 جون 2010 کو ''تزکیۂ نفس'' کے موضوع پر خطاب کرنا تھا۔ اِس خطاب کا انتظام جامعہ کی لائبریری کے ہال میں کیا گیا تھا۔ اِس خطاب میں جو باتیں میں نے کہیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ عام طور پر تزکیۂ نفس کے موضوع کو ایک پُراسرار موضوع سمجھا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تزکیہ نفس کو تزکیۂ قلب کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ حالاں کہ صحیح یہ ہے کہ تزکیہ نفس سے مراد تزکیہ ذہن ہے، یعنی نفسیاتی تزکیہ۔ تزکیہ نفس کو دوسرے لفظوں میں تعمیرِ شخصیت کہا جاسکتا ہے، یعنی روحِ انسانی کی تطہیر (purification of soul)۔ تزکیہ نفس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنا بے رحمانہ محاسبہ کرے اور اپنی شخصیت کو تمام منفی اور نامطلوب عناصر سے پاک کر کے اپنے آپ کو ربانی انسان بنائے۔ تزکیہ نفس کوئی وقتی عمل نہیں، وہ تاحیات جاری رہنے والا ایک مسلسل عمل ہے۔

تزکیہ نفس کا کوئی تعلق مروّجہ مراقبہ (meditation) سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق تمام

ترتفکر اورتدبر سے ہے۔علامہ ابن تیمیہ (وفات 728ھ) نے بجا طور پرلکھا ہے کہ تزکیہ نفس کا ذریعہ تذکر اور تفکر ہے: أَنَّ التَّذَكُّرَ سَبَبُ التَّزْكِيَةِ، فَإِنَّهُ إِذَا تَذَكَّرَ خَافَ وَرَجَا، فَتَزَكَّى (مجموع الفتاویٰ لابن تیمیۃ، جلد16، صفحہ186)۔

تزکیہ نفس دراصل یہ ہے کہ محاسبہ (introspection) کے ذریعے اپنی کنڈیشننگ کوتوڑا جائے۔اپنے ذہن کی ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کی جائے۔دراصل ڈی کنڈیشننگ ہی تزکیہ نفس کا پہلا دروازہ ہے۔ہر آدمی کا کیس کنڈیشننگ کا کیس ہے۔ جب تک اِس کنڈیشننگ کوتوڑا نہ جائے،کسی شخص کے اندرتزکیہ نفس کا عمل (process) شروع نہیں ہوسکتا۔

میں نے کہا کہ لوگ تزکیہ کا معروف کورس پورا کرتے ہیں،لیکن ان کے اندر مطلوب تزکیہ پیدا نہیں ہوتا۔اس کا سبب یہ ہے کہ تزکیہ کے نام پر لوگ ورد اور تسبیح اور وظیفہ اور نفلی اعمال کرتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ اِن اعمال کے اندر کراماتی اوصاف چھپے ہوئے ہیں جو پر اسرار طور پران کا تزکیہ کردیں گے،حالاں کہ اِس طرح کے شکلی اعمال کا براہِ راست تعلق تزکیہ نفس سے نہیں ہے۔تزکیہ حقیقتاً ایک شعوری عمل کا نتیجہ ہے، نہ کہ صرف کسی فارم کی ظاہری ادائیگی کا نتیجہ۔

خطاب کے بعد سوال وجواب کا پروگرام تھا۔ یہ ایک گھنٹے کا سوال و جواب تھا۔ یہاں جوسوالات کیے گئے،ان میں سے ایک سوال تھا کہ آپ نے اپنی تقریر میں بتایا کہ تزکیہ نفس کا تعلق کسی ظاہری فارم سے نہیں ہے، بلکہ تزکیہ ایک شعوری عمل کا نام ہے۔اِس کی وضاحت فرمائیں۔میں نے کہا کہ اِس سوال کا جواب ایک صحابی کے عمل سے معلوم ہوتا ہے۔حضرت ابوالدرداء انصاری کی وفات کے بعدان کی اہلیہ ام الدرداء سے پوچھا گیا کہ ابوالدرداء کا خاص عبادتی عمل کیا تھا۔انھوں نے جواب دیا: التَّفَكُّرُ، الِاعْتِبَارُ (السنن الکبریٰ للنسائی، اثرنمبر 11850)۔یعنی،سوچنا اور چیزوں سے عبرت پکڑنا۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے اپنے بارے میں کہا کہ میں ایک صوفی ہوں، حالاں کہ تصوف، اسلام میں ایک مبتدعانہ اضافہ ہے۔ میں نے کہا کہ میں صوفی کا لفظ مروجہ معنی میں استعمال نہیں کرتا۔ صوفی سے میری مراد وہی ہے جس کے لیے قرآن میں ربانیت (3:79) کا لفظ آیا ہے۔ ربانیت کی اہمیت خود قرآن سے ثابت ہے، اور جہاں تک موجودہ تصوف کا تعلق ہے، وہ اِسی ربانیت کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ تصوف کے بارے میں میرے نقطۂ نظر کو جاننے کے لیے آپ میری کتاب " فکر اسلامی "(صفحہ 128) کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

9 جون 2010 کو اگلا پروگرام دعاۃ سے "تبادلۂ خیال" کا تھا۔ یہ ایک گھنٹے کا پروگرام تھا جو تین بجے سے چار بجے تک جاری رہا۔ یہ پروگرام سوال وجواب کی صورت میں تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ اسلام کا ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق عقیدے سے ہے۔ مثلاً توحید اور آخرت، وغیرہ۔ اسی طرح کچھ چیزیں وہ ہیں جن کا تعلق نظام سے ہے۔ مثلاً دیوانی اور فوج داری کے قوانین اور تعزیرات، وغیرہ۔ ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ ہم اسلام کے تعارف کا آغاز اسلام کی کس تعلیم سے کریں۔

میں نے کہا کہ اِس سوال کا جواب سیرتِ نبوی میں موجود ہے۔ آپ نے مکہ میں نبوت کا آغاز کیا تو آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ لوگوں کے پاس جاتے اور ان سے کہتے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ، قُولُوا: لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ تُفْلِحُوا (مسند احمد، حدیث نمبر 16603)۔ یعنی، اے لوگو، لا الہ الا اللہ کہو کامیاب ہوجاؤ گے۔ اِسی طرح قرآن کے جو حصے مکی دور میں نازل ہوئے تھے، آپ ان کو پڑھ کر لوگوں کو سناتے۔ چنانچہ سیرت کی کتابوں میں آپ کے بارے میں یہ آتا ہے کہ آپ لوگوں سے مل کر اُن کو اسلام کی دعوت پیش کرتے اور ان کے سامنے قرآن کے کچھ حصے پڑھ کر سناتے: عَرَضَ عَلَيْهِمُ الْإِسْلَامَ، وَتَلَا عَلَيْهِمُ الْقُرْآنَ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 428)۔

ایک سوال یہ تھا کہ اسلام میں سیاسی اقتدار کی حیثیت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن کے مطابق، سیاسی اقتدار ایک ثانوی (secondary) چیز (اُخری) کی حیثیت رکھتا ہے (الصّف، 61:13)۔ اسلام میں سیاسی اقتدار کو مطلوب اول کا درجہ حاصل نہیں۔

پروگرام کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ یہاں کئی علما اکٹھا ہو گئے اور دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اِس مجلس میں ایک بات میں نے یہ کہی کہ اسلام میں عقل کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ میں نے اِس سلسلے میں حاضرین کو ایک حدیث سنائی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: مَا خَلَقَ اللّٰهُ خَلْقًا أَكْرَمَ عَلَيْهِ مِنَ الْعَقْلِ (العقل وفضلہ لابن ابی الدنیا، حدیث نمبر 14)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پیدا کیں، اُن میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت کی حامل چیز عقل ہے۔ عجیب بات ہے کہ بعد کے لوگوں نے عقل کو غیر اہم قرار دے دیا اور ساری اہمیت عشق کو دے دی، یہاں تک کہ ایک معروف مسلم شاعر نے کہا:

عشق تمام مصطفی، عقل تمام بولہب

یہ بلا شبہ ایک فکری انحراف تھا۔ اِس غلطی کا سبب غالباً یہ تھا کہ بعد کے لوگوں نے عقل کو فلسفہ کی نسبت سے دیکھا۔ اگر وہ عقل کو سائنس کی نسبت سے دیکھتے تو وہ کبھی اِس غلطی میں مبتلا نہ ہوتے۔ عقل ایک فطری صلاحیت کا نام ہے جو خدا کی ایک تخلیق ہے۔ اس کے مقابلے میں فلسفہ خود انسان کے اپنے بنائے ہوئے ایک علم کا نام ہے، جو صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔ سائنس اور فلسفہ میں یہ فرق ہے کہ فلسفہ قیاسی منطق (sylogism) پر مبنی ہے، اور سائنس مکمل طور پر قوانین فطرت پر مبنی ہے۔ سائنس میں اگر کوئی غلطی ہوتی ہے تو وہ ناقص دریافت کی بنا پر ہوتی ہے، نہ کہ خود ساختہ قیاس کی بنا پر۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ قرآن کی آیت: اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ (9:31) کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اِس آیت کی وضاحت ایک مشہور روایت سے ہوتی ہے۔ عدی بن حاتم الطائی (وفات: 68ھ) پہلے نصرانی تھے۔ وہ بعد کو اسلام میں داخل ہو گئے۔ وہ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ نے ان کے سامنے یہ آیت پڑھی۔ تو انھوں نے کہا کہ یہود ونصاریٰ نے اپنے احبار ورہبان کو اپنا رب نہیں بنایا، انھوں نے کبھی اپنے احبار ورہبان کی عبادت نہیں کی (وَاللّٰهِ مَا كَانُوا يَعْبُدُونَهُمْ)، آپ نے

فرمایا کہ ہاں، اُن کے احبار ورہبان نے حلال کو حرام کیا اور حرام کو حلال کیا اور انھوں نے اس کو مان لیا۔ یہود ونصاریٰ کی یہی روش ان کے احبار ورہبان کی عبادت کے ہم معنی تھی: فَتِلْكَ عِبَادَتُهُمْ (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، حدیث نمبر 291؛ سنن الترمذی، حدیث نمبر 3095)۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں رب کا لفظ آیا ہے۔ یہ اِس معاملے میں برائی کی شدت کو بتانے کے لیے ہے۔ انھوں نے جو کیا تھا، وہ یہ تھا کہ خدا اور رسول کے حوالے کے بجائے، اپنے احبار ورہبان کا حوالہ دے کر کسی چیز کو ترک کرتے یا کسی چیز کو اختیار کرلیتے۔ حدیث میں تحلیلِ حرام اور تحریمِ حلال کا لفظ بھی اِسی معاملہ کی برائی کو بتانے کے لیے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کے لیے اپنے علما ومشائخ (احبار ورہبان) کو مستقل بالذات مرجع (reference) سمجھ لیا۔

میں نے اِس مجلس میں جو باتیں کہیں، اُن میں سے ایک بات یہ تھی کہ حدیث کی کتابوں میں ایک ایسے گروہ (عصابۃ) کا ذکر ہے جو ہند میں غزوہ کرے گا۔ اس گروہ کے لیے حدیث میں جہنم کے عذاب سے نجات کی خوش خبری دی گئی ہے۔ اِس حدیث میں "غزوہ" کے الفاظ آئے ہیں: عِصَابَة تَغْزُو الهِنْدَ (سنن النسائی، حدیث نمبر 3175)۔ یہاں غزوہ سے مراد مسلح جنگ نہیں، بلکہ پُرامن دعوتی عمل ہے۔ اس کے تحت اقوام عالم کے درمیان تعارفِ اسلام کی اہمیت کو بیان کیا۔ آخر میں میں نے کہا کہ "عصابہ" کی نسبت سے جو بات میں نے کہی ہے، وہ کوئی فخر یا فضیلت یا ادّعا کی بات نہیں ہے۔ اس عصابہ کا حقیقی علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ میں نے جو بات کہی، اس کی حیثیت صرف ایک ذمے داری کی تشخیص کی ہے۔ اِس تشخیص کا تقاضا ہے کہ آپ حضرات اب مزید یقین کے ساتھ اِس عمل میں ہمہ تن سرگرمِ عمل ہوجائیں۔

9 جون 2010 کے پروگرام کے بعد عصر کی نماز مسجد میں پڑھی گئی۔ نماز سے فراغت کے بعد ہم لوگ جامعہ کے کلیہ ہال میں گئے۔ وہاں ایک خطاب کا پروگرام تھا۔ اِس کا موضوع

تھا: آخرت رخی زندگی۔ یہ ایک گھنٹے کا خطاب تھا۔ میں نے کہا کہ آخرت رخی زندگی کا فارمولا حدیث کے مطابق، یہ ہے: حَاسِبُوا أَنْفُسَكُمْ قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوا، وَزِنُوا أَنْفُسَكُمْ قَبْلَ أَنْ تُوزَنُوا (مسند الفاروق، جلد 2، صفحہ 618)۔

اصل یہ ہے کہ اِس دنیا میں زندگی کی دو صورتیں ہیں — ایک ہے وہ زندگی جو مبنی بر حبِّ عاجلہ (القیامۃ، 75:20) ہو، یعنی صرف آج کی بنیاد پر منصوبہ بندی۔ اور دوسری زندگی ہے مبنی بر آجلہ، یعنی حیات بعد الموت کو لے کر زندگی کا نقشہ بنانا۔ اِس کے بعد میں نے رسول اور اصحاب رسول کے مختلف واقعات سنائے جو آخرت رخی زندگی کے معاملے میں عملی ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آخر میں ناظمِ اجتماع کی طرف سے لوگوں کو سوال وجواب کا موقع دیا گیا۔ چند منٹ تک کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ جامعہ کے اساتذہ اور دیگر علما کے علاوہ مولانا کاکا سعید احمد عمری بھی اِس پروگرام میں موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ خطاب اتنا زیادہ واضح اور فکر انگیز ہے کہ اِس کے بعد کسی سوال کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ یہ پروگرام سوال وجواب کے بغیر ختم ہو گیا۔

پروگرام کے بعد ہم لوگ جامعہ کے دفتر میں بیٹھ گئے اور مغرب تک وہاں غیر رسمی انداز میں گفتگو ہوتی رہی۔ اِس مجلس میں ایک تعلیم یافتہ مسلمان موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ الرسالہ کے قاری ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے الرسالہ کے مطالعے سے کیا پایا۔ انھوں نے کہا کہ — سادگی اور اسلام کا فطری تصور۔

میں نے کہا یہ اُس کا صرف ایک پہلو ہے۔ الرسالہ کا اصل مقصد ہے لوگوں کے اندر مثبت طرزِ فکر (positive thinking) پیدا کرنا، یعنی منفی حالات کے باوجود ہمیشہ مثبت ذہن کے تحت سوچنا۔ الرسالہ کی کوشش یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اِس قسم کی ذہنی بیداری لائی جائے۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہی خلاصہ ایمان ہے۔ جنت میں وہی لوگ داخلہ پائیں گے جو اپنے اندر مثبت شخصیت کی تعمیر کریں۔ قرآن کے مطابق، جنت دار السلام (10:25) ہے۔ منفی ذہن کے لوگوں کو جنت میں داخلہ ملنے والا نہیں۔

اِس مجلس میں ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ میں صبر کے بارے میں بہت مضامین آتے ہیں۔ صبر کیا ہے۔ کیا صبر کا مطلب کمپرومائز (compromise) کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں، کمپرومائز الگ چیز ہے اور صبر الگ چیز۔ کمپرومائز، مصلحت (expediency) کے تحت ہوتا ہے، جب کہ صبر حکیمانہ منصوبہ بندی کا نام ہے۔

10 جون 2010 کو صبح کی نماز کے بعد ہم لوگوں نے کچھ دیر تک جامعہ کے کیمپس میں واک کیا۔ اس کے بعد ہم لوگ کاکا فیملی کے ایک فرد جناب کاکا حامد صاحب کی رہائش گاہ پر گئے۔ میں نے پیشگی طور پر کہہ دیا تھا کہ وہاں صرف چائے ہوگی، اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ چنانچہ اس کے مطابق عمل کیا گیا۔ یہ ایک غیر رسمی نشست تھی۔ اس میں مولانا کاکا سعید احمد عمری کے علاوہ تقریباً پندرہ علما شریک تھے۔

اِس مجلس میں تقریباً ایک گھنٹے تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ ایک بات میں نے یہ کہی کہ موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلمان، عالم اور غیر عالم، عرب اور غیر عرب سب ایک مشترک برائی میں مبتلا ہیں اور وہ منفی سوچ (negative thinking) ہے۔

منفی سوچ ایک قاتل سوچ ہے۔ وہ آدمی کی دنیا کو بھی تباہ کرتی ہے اور آخرت کو بھی تباہ کردیتی ہے۔ منفی سوچ کا پہلا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی فیضانِ خداوندی (divine inspiration) سے محروم ہوجاتا ہے۔ اس کے اندر وہ ربانی شخصیت نہیں بنتی جس کو قرآن میں قلبِ سلیم (26:89) کہا گیا ہے۔ منفی سوچ کا دوسرا عظیم تر نقصان یہ ہے کہ ایسا آدمی آخرت کی اعلیٰ جنت میں داخلے کے لیے محروم قرار پاتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اِس معاملے میں سخت محتاط رہے اور کسی بھی عذر کی بنا پر وہ ادنیٰ درجے میں منفی سوچ کا شکار نہ ہو۔ ہر دوسرا نقصان بلاشبہ منفی سوچ میں مبتلا ہونے سے کم ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ علمائے سلف پر علمی تنقید تو علمائے راسخین کے درمیان جاری رہی ہے، لیکن مجھے آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ علمائے سلف کا اعتراف نہیں کرتے۔

میں نے کہا کہ یہ صرف ایک غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں آپ لوگوں سے زیادہ اسلاف کا اعتراف کرتا ہوں۔ آپ لوگ تو صرف فضائل بیان کرتے ہیں۔ میں نے خاص علمی اور تاریخی اعتبار سے اسلاف کے رول کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اِس معاملے کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو کا میں بہت زیادہ اعتراف کرتا ہوں۔ یہ پہلو ہے — علوم اسلامی کی تدوین، دینی علم کا تسلسل بعد کی نسلوں میں جاری رکھنا، مصادرِ شریعت کو اس کی اصل صورت میں محفوظ رکھنا، وغیرہ۔ یہ سب کام بلا شبہ ہمارے اسلاف نے انجام دیا ہے۔ یہ بلا شبہ بہت بڑا کام ہے۔ اِس کام کی اہمیت اس موازنہ سے سمجھی جا سکتی ہے کہ اِس قسم کے علما اور محققین دوسرے مذاہب میں پیدا نہیں ہوئے۔ چنانچہ دوسرے مذاہب اپنی اصل حالت میں محفوظ نہ رہ سکے۔ یہ ہمارے اسلاف کا کارنامہ ہے کہ دینِ اسلام آج پوری طرح محفوظ حالت میں موجود ہے۔

اِس معاملے کا دوسرا پہلو وہ ہے جو جدید حالات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ جدید حالات تقریباً تین سو سال سے دنیا میں موجود ہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اِس دور کے علما نئے حالات کو سمجھ نہ سکے۔ وہ بدلے ہوئے حالات کے اعتبار سے مسلمانوں کو صحیح رہنمائی دینے میں ناکام رہے۔ مزید یہ کہ انھوں نے غلط اقدامات کر کے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو شدید نقصان میں مبتلا کر دیا۔

اِس مجلس میں اور بعض دوسری مجلسوں میں میں نے دیکھا کہ کاکا فیملی کے کئی افراد وہاں شریک تھے، لیکن ان کے اندر میں نے یہ انوکھی صفت پائی کہ جب کوئی سینئر شخص بولتا تھا تو فیملی کے تمام جونیئر ممبران خاموش رہ کر اس کی بات سنتے تھے۔ یہ قدیم روایت (tradition) کاکا فیملی میں اب بھی پوری طرح موجود ہے۔ کاکا حامد صاحب کے یہاں سے فارغ ہو کر ہم لوگ کمرے میں آ گئے۔ یہاں صبح کا سادہ ناشتہ کیا گیا۔ یہ ناشتہ وہی تھا جو یہاں طلبا کو روزانہ دیا جاتا ہے۔ ناشتے کے وقت ہمارے ساتھ کئی علما اور دُعاۃ موجود تھے۔ اِن لوگوں سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ مشن سے علما بہت کم جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات درست نہیں۔ علما اپنے روایتی ذہن کی بنا پر اب تک الرسالہ مشن سے بہت کم جڑ سکے تھے، مگر اب خدا کے فضل سے انڈیا اور انڈیا کے باہر کے مختلف مدارس اور مکاتب فکر کے سنجیدہ علما بڑی تعداد میں الرسالہ مشن سے جڑ گئے ہیں۔ اپریل 2010 میں الرسالہ مشن کی طرف سے دہلی میں جو دعوہ میٹ (Dawah Meet) ہوئی تھی، اس میں شرکت کرنے والے صرف علما کی تعداد تقریباً 25 تھی۔ میں نے کہا کہ ذاتی ملاقاتوں، ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ علما کے درمیان الرسالہ اور اس کے تحت تیار کردہ لٹریچر بڑے پیمانے پر مقبولیت حاصل کررہا ہے۔ خاص طور پر علما کے درمیان الرسالہ مشن کو متعارف کرنے میں میرے ساتھی مولانا محمد ذکوان ندوی کا بہت بڑا رول ہے۔ وہ ایک سنجیدہ اور معتدل مزاج کے آدمی ہیں۔ علما سے ان کے اچھے تعلقات ہیں۔ انھوں نے خاموش پلاننگ کے ذریعے علما کے تقریباً تمام حلقوں تک الرسالہ مشن کے دعوتی پیغام کو پہنچا دیا ہے۔ جامعہ دارالسلام کا یہ پروگرام بھی انھیں کی بالواسطہ کوششوں کے ذریعہ ممکن ہوسکا ہے۔

10 جون 2010 کی صبح کو دس بجے سے بارہ بجے تک لائبریری کے ہال میں ایک پروگرام تھا۔ اِس پروگرام کا موضوع یہ تھا: عصری اسلوب میں سیرتِ رسول کا تعارف۔ اِس پروگرام میں علما اور دعاۃ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

میں نے اپنے خطاب میں جو کچھ کہا، وہ یہ تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک ہی ابدی مشن ہے، اور وہ دعوت ہے۔ زمانہ کے اعتبار سے اس میں جو فرق ہوتا ہے، وہ صرف طرز خطاب اور اسلوب (idiom) کے اعتبار سے ہوتا ہے، نہ کہ خود مشن کے اعتبار سے۔ پیغمبر اسلام کا مشن اول بھی دعوت ہے اور آخر بھی دعوت۔ 'حجۃ الوداع' کے بعد اصحابِ رسول کی بڑی تعداد عرب کے باہر مختلف ملکوں میں چلی گئی۔ وہاں انھوں نے لوگوں کو دینی معنی میں اسلامائز کیا، نہ کہ سیاسی معنی میں۔ موجودہ زمانے میں سیاسی اسلامائزیشن کا چرچا ہے، مگر رسول اور اصحاب رسول کے ماڈل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

میں نے کہا کہ دعوت الی اللہ کا کام ایسا نہیں ہے جس کو ایک بار کر دیا جائے اور پھر اس کی ضرورت باقی نہ رہے۔ دعوت کا عمل ایک مسلسل عمل (continuous process) ہے، کیوں کہ انسان پیدا ہوتے ہیں اور کچھ دن زندہ رہنے کے بعد مر جاتے ہیں۔ اِس طرح بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک جنریشن کے بعد دوسری جنریشن آجاتی ہے۔ اِس لیے ہر جنریشن میں دعوتی کام کرنا ضروری ہے، تاکہ تمام انسانوں تک ان کے خالق کا پیغام پہنچ جائے۔

خطاب کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔ ایک سوال یہ تھا کہ قرآن میں: وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ (8:60) آیا ہے۔ اِس میں اعدادِ قوت سے کیا مراد ہے۔ میں نے کہا کہ خود قرآن کی آیت میں اِس کا معیار بتا دیا گیا ہے، اور وہ اِرہاب ہے، یعنی وہ قوت فراہم کرو جو فریق ثانی کے نزدیک قوتِ مرہبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانے میں جنگی ہتھیار کی حیثیت قوتِ مرہبہ کی نہیں ہے، بلکہ سائنسی علوم کو یہ حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ زمانے میں امریکا اس کی ایک مثال ہے۔ امریکا کے پاس ہر قسم کے جنگی ہتھیار موجود ہیں، لیکن ان کو استعمال کرنے کے باوجود وہ ویت نام، عراق، افغانستان، وغیرہ میں مکمل طور پر ناکام ہے۔

ایک سوال قرآن کی اِس آیت کے بارے میں تھا: أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا (22:39)۔ میں نے کہا کہ اِس آیت سے یہ مطلب نکالا جاتا ہے کہ کسی فریق کے ساتھ ظلم کا واقعہ ہو تو اہلِ اسلام کے لیے جنگ جائز ہو جاتی ہے، مگر یہ ایک شدید غلط فہمی ہے۔ یہ مدنی آیت ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، مکی دور میں افراد کے ساتھ بار بار ظلم کیا گیا، لیکن اُس وقت یہ آیت نہیں اتری۔ یہ آیت ہجرت کے بعد مدینہ میں اتری۔ اِس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اِس آیت میں ظلم سے مراد انفرادی ظلم نہیں ہے، بلکہ فوجی حملہ ہے، یعنی ایک بیرونی حکومت کا مسلم حکومت پر باقاعدہ فوج کے ذریعے حملہ آور ہونا۔

اِس معاملے میں دوسری بات یہ ہے کہ جب فوج کے ذریعے اِس قسم کا جارحانہ حملہ کیا جائے تو اُس وقت بھی صرف حکومت کو دفاعی جنگ (defensive war) کی اجازت

ہوگی۔ غیر حکومتی افراد اور تنظیموں (NGOs) کو اُس وقت بھی مسلح جنگی کارروائی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ موجودہ زمانے کے علما، عرب اور غیر عرب دونوں نے، جو شدید ترین غلطی کی ہے، وہ یہ کہ انہوں نے ظلم کے نام پر غیر حکومتی عسکریت (non-governmental militancy) کو شرعی اعتبار سے جائز قرار دیا۔ بلاشبہ یہ ایک مہلک غلطی تھی۔ مجھے اس معاملے میں کسی عرب یا غیر عرب عالم کا استثنا نظر نہیں آتا۔

ہمارے یہاں سے قرآن کا جو انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا ہے، اس کی بابت پروگرام کے آخر میں جناب ریاض موسی صاحب نے بتایا کہ میں نے انگریزی جاننے والے افراد کی ایک ٹیم کو یہ ترجمہ دیا۔ اور میں نے کہا کہ دوسرے انگریزی تراجم سے اِس کا تقابل کرنے کے بعد مجھ کو بتائیے کہ کون سا ترجمہ سب سے زیادہ واضح اور عصری زبان میں ہے۔ عجیب بات ہے کہ تقابل کرنے کے بعد ان لوگوں نے متفقہ طور پر کہا کہ صرف گڈ ورڈ بکس (نئی دہلی) سے شائع ہونے والا انگریزی ترجمہ اِس معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس میں پوری طرح وضوح (clarity) ہے، اور اِسی کے ساتھ وہ اتنی آسان زبان میں ہے کہ اس کو ڈکشنری کی مدد کے بغیر پڑھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انگریزی تراجم میں سب سے زیادہ قابلِ فہم ترجمہ ڈاکٹر بشیر محی الدین (افریقہ) کا ترجمہ مانا جاتا ہے، لیکن گڈ ورڈ سے شائع ہونے والا ترجمہ اس سے بھی زیادہ واضح اور قابلِ فہم ہے۔

10 جون 2010 کو ظہر کی نماز کے بعد خطاب کا ایک پروگرام تھا۔ یہ پروگرام جامعہ کے کلیہ ہال میں کیا گیا۔ اِس میں دعاۃ اور طلبا کے علاوہ، جامعہ کے اساتذہ بھی شریک ہوئے۔ اِس پروگرام کا موضوع یہ تھا: سیرت ایک تحریک کی حیثیت سے۔ اِس موضوع پر میں نے ڈیڑھ گھنٹے کی ایک تقریر کی۔ اِس تقریر کا خلاصہ یہاں مختصر طور پر نقل کیا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ تحریک (movement) ایک ایسا عمل ہے جو ایک شخص یا گروہ کی طرف سے دوسرے گروہ کے مقابلے میں برپا ہوتا ہے۔ اِس طرح کسی تحریک کے تقاضے دو طرفہ ہوجاتے ہیں، یعنی ایک طرف داعی کی نسبت سے اور دوسری طرف مدعو کی نسبت سے۔

آپ نماز خود اپنے فیصلے کے تحت پڑھ سکتے ہیں، لیکن تحریک کی کامیابی اِس میں ہے کہ آپ دوسروں کو بھی بخوبی طور پر جانیں اور دوسروں کی رعایت کرتے ہوئے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں اِس کا اعلیٰ نمونہ پایا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں اٹھنے والی مسلم تحریکیں اپنے مطلوب نتیجے کے اعتبار سے ناکام ہوگئیں۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ اِن تحریکوں کے چلانے والے صرف اپنے آپ کو جانتے تھے، دوسروں کے بارے میں وہ پوری طرح بے خبر تھے۔

میں نے جہاں تک سیرتِ رسول کا مطالعہ کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اِس معاملے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کو ایک لفظ میں پازیٹیو اسٹیٹس کوازم (positive statusquoism) کہا جاسکتا ہے، یعنی دسروں کی مکمل رعایت کرتے ہوئے انتہائی حد تک غیر نزاعی انداز میں اپنا کام کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اِس حکیمانہ پالیسی کا اعتراف برطانی مستشرق ای ای کلیٹ (EE Kellett) نے اپنے الفاظ میں اس طرح کیا ہے — انہوں نے مشکلات کا سامنا اِس عزم کے ساتھ کیا کہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں:

> He faced adversity with the determination to wring success out of failure. (*A Short History of Religions* by E.E. Kellet, pp. 331-32)

سیرتِ رسول کے اِس پہلو کو میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اس کی وضاحت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے بہت سے واقعات بیان کیے۔

پروگرام کے بعد حاضرین کو سوال وجواب کا وقت دیا گیا، مگر کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ چنانچہ جلسے کے اختتام کا اعلان کردیا گیا۔ مولانا کاکا سعید احمد عمری نے اِس خطاب کے بارے میں کہا کہ یہ سیرتِ رسول کے موضوع پر سب سے اچھا خطاب تھا۔ کاکا صاحب نے جامعہ کے لوگوں سے کہا کہ وہ اِس پورے خطاب کو جامعہ کے ترجمان ماہ نامہ ”راہِ اعتدال“ میں شامل کریں۔

پروگرام کے خاتمہ پر ہم لوگ عصر کی نماز کے لیے مسجد میں گئے۔ مسجد کافی کشادہ، مگر نہایت سادہ تھی۔ مسجد کی دیواروں پر اُس قسم کی کوئی چیز موجود نہ تھی جو اکثر مسجدوں میں ہوتی ہے اور نمازیوں کے لیے ڈسٹریکشن کا کام کرتی ہے۔ یہ مسجد مکمل طور پر سادہ اور مکمل طور پر پر سکون تھی۔ طلبا کے اندر نہایت سنجیدگی اور ڈسپلن دکھائی دے رہا تھا۔

نماز عصر سے فراغت کے بعد ہم لوگ لائبریری میں اپنی قیام گاہ پر آگئے۔ یہاں لائبریری کے باہری ہال میں کئی دوسرے مقامات کے لوگ اکٹھا تھے۔ مثلاً وانیمباڑی (تمل ناڈو)، بنگلور، حیدرآباد، وغیرہ۔ اِن لوگوں سے دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک بات میں نے وقت کے بارے میں کہی۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو ہمارے پروگرام میں شرکت کے لیے آئے، لیکن وہ یہاں دیر میں پہنچے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک بے شعوری کی بات ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آدمی کے لیے دو میں سے ایک کا اختیار ہے — یا تو وقت پر آنا، یا پھر نہ آنا۔ اِس کے سوا تیسری کوئی صورت نہیں۔

ایک سوال کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آج کل مسلمانوں کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ معاملے کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ طریقہ بالکل لا حاصل ہے۔ میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے: اتّقُوا فِراسَةَ المؤمنِ، فإنَّه يَنْظُرُ بِنُورِ اللّٰهِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3127)۔ یعنی، مومن کی فراست سے بچو، کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اِس حدیث کے مطابق، سچا ایمان آدمی کے اندر ایک ربانی روشنی پیدا کرتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مومن کی منصوبہ بندی کے مقابلے میں، دوسرے لوگ دفاعی پوزیشن میں آجاتے ہیں۔ اِس کے برعکس، اگر ایسا ہو کہ مسلمان دوسروں کے خلاف شاکی بنے ہوئے ہوں تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ فراستِ ایمانی سے محروم ہیں۔ اِس لیے ایسا ہوا ہے کہ اُن کے مقابلے میں، دوسروں کو بالادستی حاصل ہوگئی ہے۔

بنگلور کے حلقہ الرسالہ کے تقریباً 15 لوگ ملاقات کے لیے آئے۔ میں نے اُن سے

دعوت اور آخرت کے موضوع سے متعلق کچھ باتیں کہیں جس کو سن کر وہ رونے لگے۔ انہوں نے مجھ سے نصیحت کے لیے کہا۔ میں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو صرف ایک نصیحت کروں گا۔ وہ یہ کہ آپ آج سے اِس بات کا فیصلہ کرلیں کہ آپ کو اپنے اندر "قلب سلیم" پیدا کرنا ہے اور اِسی حال میں آپ کو جینا اور اسی حال میں مرجانا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک ایسے آدمی کی نصیحت ہے جو قبر کے کنارے کھڑے ہو کر آپ کو یہ نصیحت کر رہا ہے۔

جامعہ کے ایک استاد حافظ شیخ کلیم اللہ عمری مدنی ملاقات کے لیے آئے۔ انہوں نے اپنے چند کتابچے برائے مطالعہ پیش کیے۔ مثلاً محبتِ الٰہی کے ذرائع اور اخلاقیات، وغیرہ۔ اِس موقع پر جامعہ کے ایک نوجوان اور سنجیدہ استاذ مولانا حافظ محمد ابراہیم عمری نے اپنی کتاب "انتہاپسندی اور اسلام" مطالعے کے لیے دی۔ یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ وہ 216 صفحات پر مشتمل ہے۔

10 جون 2010 کو عصر کی نماز کے بعد جامعہ کے ایک سینئر استاد مولانا ڈاکٹر سعید احمد عمری ملاقات کے لیے آئے۔ اُن سے بعض مسائل پر گفتگو ہوئی۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے علمی انحطاط کا سبب کیا ہے، جب کہ ماضی میں وہ علمی ترقی کے اعتبار سے ممتاز مقام پر پہنچ گئے تھے۔ میں نے کہا کہ جب ہم مسلمان یا ملتِ مسلمہ کا لفظ بولتے ہیں تو شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم اس کو ایک تسلسل کے روپ میں دیکھنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بات خلافِ واقعہ ہے۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہ معاملہ سادہ طور پر مسلمانوں کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کی دو مختلف نسلوں کا معاملہ ہے، یعنی دورِ عروج کی مسلم نسلیں اور دورِ زوال کی مسلم نسلیں۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا علمی زوال ان کے اپنے نسلی زوال کا نتیجہ ہے، اور دورِ زوال میں یہ ہر قوم کے ساتھ پیش آتا ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ مطالعہ قرآن کا اصول کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مطالعہ قرآن کے بہت سے اصول علما نے لکھے ہیں، لیکن میرے اپنے تجربے کے مطابق، سب سے بڑا اصول دعا ہے۔ اِس سلسلے میں مجھ کو امام ابن تیمیہ کا طریقہ بہت پسند ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ بعض مرتبہ ایک آیت کو سمجھنے کے لیے میں نے سو سو تفسیروں کا مطالعہ کیا ہے۔ مطالعہ کے بعد میں

اللہ تعالیٰ سے آیت کے فہم کی دعا کرتے ہوئے کہتا ہوں: يَا مُعَلِّمَ إِبْرَاهِيمَ عَلِّمْنِي (اعلام الموقعین لابن القیم، جلد 4، صفحہ 198)۔ یعنی، اے ابراہیم سکھانے والے مجھے بھی سکھا۔

میں نے کہا کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے اللہ سے دعا کرنا گویا کہ کسی کتاب کو سمجھنے کے لیے اس کے مصنف سے کنسلٹ کرنا ہے۔ قرآن واحد کتاب ہے جس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آپ ہر لمحہ اس کے مصنف سے کنسلٹ کر سکتے ہیں۔ اِس کو سن کر ڈاکٹر سعید احمد عمری نے کہا کہ مطالعۂ قرآن کے لیے آج شاہ کلید ہاتھ آ گئی۔ اِس مجلس میں دوسرے کئی علما موجود تھے۔ مولانا کاکا سعید احمد عمری نے کہا کہ امام ابن تیمیہ کی یہ بات ہم بہت پہلے سے جانتے تھے، لیکن آج آپ کی زبان سے اس کی اثر انگیز تفصیل سن کر اس کی معنویت پوری طرح کھل گئی۔

ایک سوال یہ تھا کہ مسلم تاریخ جو بعد کو لکھی گئی، وہ زیادہ تر مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کے ہم معنی بن گئی ہے۔ مسلم سرگرمیوں کے دوسرے پہلو مثلاً دعوت وتبلیغ کے تفصیلی واقعات اس میں شامل نہ ہو سکے۔ اب اِس کمی کی تلافی کس طرح کی جا سکتی ہے۔

میں نے کہا کہ بظاہر اب اِس کی تلافی ممکن نہیں۔ کیوں کہ تاریخ (history) ناول کی طرح محض اپنے ذہن سے نہیں لکھی جا سکتی۔ اس کے لیے ضروری معلومات (data) درکار ہے جو کہ عملاً موجود نہیں۔ میں نے کہا کہ اِس ضرورت کا احساس بہت پہلے عبد الرحمن بن خلدون (وفات 1406ء) کو ہوا تھا۔ انھوں نے اِس موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے آغاز میں ایک مفصل مقدمہ لکھا۔ اِس کے بعد انھوں نے سات جلدوں میں ایک کتاب لکھی جس کا نام یہ ہے: الْعِبَرُ وَدِيوَانُ الْمُبْتَدَإِ وَالْخَبَرِ فِي تَارِيخِ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ وَالْبَرْبَرِ۔

لیکن خود ابن خلدون اپنی اِس تاریخ کو اُن اصولوں کے مطابق، تیار نہ کر سکے جس کو انھوں نے اپنے "مقدمہ" میں تحریر کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مقدمہ تو وہ اپنے ذہن سے لکھ سکتے تھے، لیکن ایک نئی تاریخ لکھنے کے لیے بنیادی معلومات (data) کی ضرورت تھی اور وہ موجود نہ تھیں۔ اب اگر کوئی شخص بہت زیادہ محنت کرے تو وہ مختلف ماخذ سے اِس نوعیت کی کچھ معلومات حاصل کر سکتا ہے، لیکن وہ معلومات اتنی زیادہ نہ ہوں گی کہ پوری تاریخ ازسرِ نو لکھی جا سکے۔

پوری مسلم تاریخ کو اب از سرِ نو مرتب کرنا تو ممکن نہیں، لیکن میری یہ تمنا ہے کہ سیرتِ رسول کے موضوع پر ایک نئی کتاب تیار کروں۔ اگر ایک پوری ٹیم کے ساتھ احادیث رسول کا اور دوسرے متعلق ذخائر کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو امید ہے کہ سیرت کے موضوع پر ایک نئی کتاب تیار کی جاسکتی ہے۔ سیرت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ غزواتی پیٹرن پر لکھی گئی ہیں، جب کہ سیرت کے موضوع پر صحیح کتاب وہ ہے جو دعوتی پیٹرن پر لکھی جائے۔ میں نے جزئی طور پر یہ کام کیا ہے، لیکن کلی طور پر اِس کام کو انجام دینا ابھی باقی ہے۔

آخر میں میں نے اپنی دو کتابیں اپنے دستخط کے ساتھ ڈاکٹر سعید احمد عمری کو بطور تحفہ پیش کیں — اللہ اکبر، پیغمبر انقلاب۔ اِس کے بعد مغرب کی نماز لائبریری ہال میں جماعت کے ساتھ پڑھی گئی۔ نماز میں تقریباً 15 علما موجود تھے۔ اِس نماز کی امامت میرے ساتھی مولانا حافظ محمد ذکوان ندوی نے کی۔ مغرب کے بعد میری قیام گاہ پر کئی علما آگئے۔ ان سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

اِس مجلس میں میں نے جو باتیں کہیں، اُن میں سے ایک یہ تھی کہ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بار بار استغفار کرتے تھے۔ بعض روایات کے مطابق 70 بار، بعض روایات کے مطابق، 100 بار اور بعض روایتوں کے مطابق، اِس سے بھی زیادہ بار آپ استغفار فرماتے تھے۔ شارحینِ حدیث نے اِس کی تاویل میں لمبی بحثیں کی ہیں، لیکن اصل یہ ہے کہ یہ عجز کا ظاہرہ تھا۔ عجز کی دریافت بلاشبہ کسی مومن کی سب سے بڑی دریافت ہے۔ خدا کے تمام پیغمبر اِس معاملے میں کمال کے درجے پر تھے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر احساسِ نبوت میں نہیں جیتا، بلکہ وہ احساسِ عبدیت میں جیتا ہے۔ رب العالمین کے مقابلے میں کسی انسان کے پاس جو سب سے بڑا سرمایہ ہے، وہ صرف ایک ہے اور وہ عجز ہے۔ اِس کے بعد ہم لوگ جامعہ کی مسجد میں گئے اور وہاں عشاء کی نماز باجماعت ادا کی۔ باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی، اِس لیے عشاء کی نماز کے بعد دوبارہ ہم لوگ لائبریری میں اپنی قیام گاہ پر واپس آگئے۔ یہاں دوبارہ کچھ طلبا اور اساتذہ اکٹھا ہو گئے۔

مولانا سید اقبال احمد عمری نے جامعہ دار السلام کے متعدد اساتذہ سے الرسالہ مشن کے بارے میں ان کے تاثرات معلوم کیے، جو انھیں کے الفاظ میں یہاں مختصراً نقل کیے جاتے ہیں:

1۔ ”مولانا وحید الدین خاں صاحب سے میرے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ مجھے ان کی مختلف تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ ان تحریروں میں اسلام اور متعلقات اسلام پر ان کے جدید اندازِ تعبیر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اِس طرح مجھ کو مولانا سے ایک قلبی اور روحانی تعلق پیدا ہوگیا۔ جامعہ کے جشن طلائی کے موقع پر جب مولانا یہاں آئے تو اپنے دلی تعلق کی وجہ سے میں نے مولانا کو دوسرے مہمانوں کے ساتھ ٹھہرانے کے بجائے اپنے خاص کمرے میں ٹھہرایا تھا۔ میں مولانا کی تحریروں کا شائق تھا۔ چنانچہ جب مولانا کی کتاب ”تعبیر کی غلطی“ کا اشتہار دیکھا تو اس کے نسخے منگوائے۔ خود بھی پڑھا اور کچھ دوسرے احباب کو بھی پڑھنے کے لیے دیا۔ جہاں تک مولانا سے متاثر ہونے کا سوال ہے، یہاں خلاصہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان سے میں بہت متاثر ہوں۔ وہ اپنے طرزِ تعبیر میں منفرد ہیں۔ وہ اپنے طرز تعبیر کے موجد بھی ہیں اور متبع بھی۔ مولانا کا علم بہت گہرا ہے۔ اسلام کی تعبیر کا جو خاص ملکہ ان کو حاصل ہے، وہ منفرد اور قابلِ مطالعہ ہے۔ میں الرسالہ کا قاری ہوں۔ ابھی وہ میرے گھر آتا ہے۔ مولانا کے علمی استدلال کے انداز سے سب کو فائدہ اٹھانا چاہیے، نہ یہ کہ خواہ مخواہ اس سے علمی استفادہ کرنے سے دور رہیں“۔ (حضرت مولانا ظہیر الدین اثری رحمانی، سابق شیخ الحدیث، جامعہ دار السلام، عمرآباد)

2۔ ”مولانا وحید الدین خاں صاحب کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو وقت کی زبان اور اسلوب میں پیش کرنا، ایک کامیاب طریقہ ہے۔ جو لوگ مولانا کے لٹریچر سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، یا براہِ راست ان سے استفادہ کررہے ہیں، اس کے مطابق، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کو پیش کرنے کا یہ طریقہ زیادہ مناسب بھی ہے اور مستحسن بھی۔ میں الرسالہ دیکھتا ہوں۔ تذکیر القرآن کا جستہ جستہ مطالعہ کیا ہے۔ آئندہ اس کو بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا ارادہ ہے۔ مولانا کے پاس وقت کی زبان اور وقت کے اسلوب میں اسلام کو پیش کرنے کا اچھا طریقہ ہے“۔ (حضرت مولانا سید عبد الکبیر عمری، شیخ التفسیر، جامعہ دار السلام، عمرآباد)

3۔ ''مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابوں میں میری سب سے پسندیدہ کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج'' ہے۔ اِس میں مولانا نے اسلامی عقائد کو عصری دلائل کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ دورِ طالب علمی ہی سے الرسالہ میرے مطالعہ میں رہا ہے، اس کا اسلوب مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ معمولی واقعات کے اندر ہمارے لیے کیسے اسباق موجود ہیں۔ یہ درحقیقت قرآنی اسلوب ہے جو ایک مومن کو فراستِ ایمانی کے نتیجے میں ملتا ہے۔ مولانا سے ملنے کی خواہش بہت دنوں سے تھی، مگر اس کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ جامعہ آمد پر مولانا سے ملنے کی میری دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور مولانا سے براہِ راست سننے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ مولانا نے بڑی محبت سے ملاقات کی اور میری قدر افزائی فرمائی۔ اِس سے مجھے اندازہ ہوا کہ مولانا کے دل میں اہلِ علم کے لیے بڑی قدر ہے۔ میں نے مولانا سے چند سوالات کیے۔ مولانا نے بڑی جامعیت کے ساتھ ان کا مختصر مگر بھر پور جواب دیا۔ جو مولانا کے وسیع مطالعہ کے علاوہ ان کے ذاتی غور وفکر کی دین ہے۔ اِس کے علاوہ، مولانا نے اپنا مثبت نقطہ نظر ہر جگہ ملحوظ رکھا۔ ایسا عام طور سے نہیں ہوتا۔ دعوتِ دین کے سلسلے میں مولانا کو میں نے بڑا فکر مند پایا۔ مولانا اسلام کے پیام امن وسلامتی کو بہت زیادہ واضح کرنے کے داعی ہیں، تا کہ اسلام کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے کا پردہ چاک کیا جاسکے۔ مولانا کی گفتگو وتحریر میں جدید تحقیقات کے حوالے کا رنگ غالب ہے۔ وہ دینی حقائق اور جدید علمی حقائق میں ہم آہنگی ثابت کرنا چاہتے ہیں''۔ (مولانا ڈاکٹر شیخ سعید احمد عمری، استاد تفسیر وادب عربی، جامعہ دار السلام، عمر آباد)

11 جون 2010 کو ہماری واپسی تھی۔ فجر کی نماز ہم لوگوں نے جامعہ کی مسجد میں پڑھی۔ یہاں کے دستور کے مطابق، نماز کے بعد تمام طلبا قرآن کی تلاوت کے لیے مسجد میں بیٹھ گئے۔ چوں کہ مجھے آج صبح کو روانہ ہونا تھا، اِس لیے تلاوت کو تھوڑی دیر تک ملتوی کرکے مجھے خطاب کے لیے کہا گیا۔ سامعین میں طلبا اور اساتذہ دونوں موجود تھے۔

میں نے اپنی تقریر میں جو باتیں کہیں، ان میں سے کچھ باتیں یہ تھیں۔ میں نے کہا کہ

آپ دنیا میں کہیں بھی جائیے، ہر جگہ آپ کو مسجدیں اور مدرسے دکھائی دیں گے۔ مسجدیں عبادت کے مرکز کے طور پر، اور مدرسے تعلیم کے مرکز کے طور پر۔ یہ مسجد اور مدرسے گویا کہ اسلام کا گلوبل انفراسٹرکچر (global infrastructure) ہیں۔ اِن دینی اور تعلیمی اداروں کے ذریعے اسلام نے تاریخ میں اپنا تسلسل برقرار رکھا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ آج ہم کسی روک ٹوک کے بغیر مسجدوں میں نماز ادا کرتے ہیں اور مدارس میں ہماری اگلی نسلوں کے لیے تعلیمِ دین کا نظام کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک نہایت عظیم بات ہے جس کے لیے ہمارا سینہ شکر سے معمور ہونا چاہیے۔ میں نے کہا کہ قرآن میں دربارِ فرعون کے رجلِ مومن کے بارے میں آیا ہے: یَکْتُمُ إِیمَانَهُ (40:28)۔ یعنی، وہ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا۔

یہ ایک شخص کی بات نہیں، بلکہ ایک دور کی بات ہے۔ قدیم زمانہ کتمانِ ایمان کا زمانہ تھا، موجودہ زمانہ اظہارِ ایمان کا زمانہ ہے۔ یہ آزادی اصحابِ رسول کے ذریعے لائے ہوئے انقلاب کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے۔ آپ اِس پر غور کریں تو آپ کے سینے میں شکر کا دریا جاری ہوجائے گا۔ اگر آپ اِس انقلابی تبدیلی پر غور کریں تو شکایت کا کوئی شائبہ بھی آپ کے دل میں باقی نہ رہے گا۔

اِس کے بعد میں نے خصوصی طور پر طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ دنیا دینے اور لینے (give and take) کی دنیا ہے۔ اِس دنیا کا اصول یہ ہے کہ — جتنا دینا، اتنا پانا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ دنیا کی مختلف سرگرمیوں میں داخل ہوں گے۔ آپ صرف ایک چیز کو اپنے سامنے رکھیے، اور وہ امتیاز (excellence) ہے۔ آپ جو کام بھی کریں، ممتاز طور پر کریں، حتی کہ اگر آپ موذن بنیں تو سب سے اچھی اذان دینے والے موذن بنیں۔ یہی اِس دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو حضرت علی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے — قِیمَةُ الْمَرْءِ مَا یُحْسِنُهُ:

The value of a person lies in excellence.

نماز کے بعد ہم لوگ لائبریری کے کمرے میں واپس آگئے۔ یہاں معتمد جامعہ مولانا کاکا سعید احمد عمری اور دوسرے اساتذہ آخری ملاقات کے لیے آگئے۔ یہاں صبح کی چائے پینے کے بعد مدراس کے لیے روانگی ہوئی۔ دوپہر کے وقت ہم لوگ مدراس ائر پورٹ پر پہنچے۔ ائر پورٹ کی نئی تعمیر کی جارہی ہے۔ چنانچہ یہاں تعمیرات کا کام بڑے پیمانے پر جاری تھا۔ ہم لوگ ائر پورٹ پر کچھ دیر بیٹھے۔ یہاں ائر پورٹ کے عملہ کے ایک ساتھی محمد آزاد صاحب ہم لوگوں کا ای ٹکٹ لے کر گئے اور انہوں نے ہمارا بورڈنگ پاس بنوا کر ہمیں دے دیا۔ ہم لوگ 11 جون 2010 کی دوپہر کو دو بجے جہاز کے اندر داخل ہوئے۔ شام کو ہم لوگ دہلی کے ائر پورٹ پر اترے، اور بذریعہ کار نظام الدین اپنی رہائش گاہ پہنچ گئے۔

اسلامی تمنا

جامعہ دارالاسلام کے ایک طالب علم سے جون 2000 میں ملاقات ہوئی گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ مجھے سعودی عرب میں کوئی کام مل جائے اور وہاں میں بیت اللہ (مکہ) کے پڑوس میں رہوں۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی صحیح تمنا نہیں۔ اگر یہ صحیح اسلامی تمنا ہوتی تو فتح مکہ کے بعد سارے صحابہ آ کر مکہ میں آباد ہو جاتے اور یہیں ان کی قبریں بنتیں۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے مکہ میں صحابہ کی بہت کم قبریں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانہ میں فرمایا تھا کہ میں ساری دنیا کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اس لیے تم لوگ مختلف ملکوں میں جاؤ اور وہاں کے لوگوں کو میرا لایا ہوا دین پہنچاؤ۔ اس کے بعد وہ اطراف کے ملکوں میں پھیل گئے اور دعوتی عمل میں اپنی تمام عمر پوری کر دی۔

(ڈائری، 11 جون 2000)

مدرسہ صدیقیہ کا سفر

مدرسہ صدیقیہ، سرسیا (چمپارن) کی دعوت پر بہار کا سفر ہوا۔ 25 مئی 2000 کو میں دہلی سے پٹنہ پہنچا اور 27 مئی 2000 کو دہلی واپسی ہوئی۔ اس سفر میں بہت سے تجربات ومشاہدات پیش آئے ان کا مختصر حال یہاں لکھا جاتا ہے۔

پٹنہ ایئر پورٹ پر میں اترا تو وہاں مولانا عبدالرحیم امدادی، مسٹر ایم ٹی خان، مولانا بدر الدین قاسمی، وغیرہ موجود تھے۔ان لوگوں کے ساتھ روانہ ہو کر پہلے مسٹر ایم ٹی خان کی رہائش گاہ (عدالت گنج) پہنچا۔ یہاں کچھ دیر قیام رہا اور لوگوں سے مختلف موضوعات پر بات ہوئی۔

مسٹر ایم ٹی خان ہائی کورٹ میں ایک اچھے عہدہ پر ہیں۔اپنے عہدہ کے لحاظ سے ان کو موجودہ مکان سے زیادہ بڑا سرکاری مکان مل رہا تھا مگر ان کے ہندو پڑوسیوں نے سخت اصرار کیا کہ وہ یہیں رہیں، وہ دوسرے مکان میں نہ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے موجودہ مکان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔

26 مئی 2000 کی صبح کو ہمارا قافلہ ہوٹل سے روانہ ہو کر بتیا کے یتیم خانہ میں پہنچا۔ یہ یتیم خانہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ایک، لڑکوں کے لیے، اور دوسرا، لڑکیوں کے لیے۔ یتیم خانہ نہایت وسیع رقبہ میں قائم ہے اور تعمیر وغیرہ کے لحاظ سے کافی شاندار ہے۔یتیم خانہ کے رجسٹر پر میں نے جو الفاظ لکھے وہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

25 مئی 2000 کو بتیا کا یتیم خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے اس کو اپنی امیدوں سے زیادہ پایا۔ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو زیادہ سے زیادہ ترقی عطا فرمائے۔

کسی بچہ یا بچی کا یتیم ہونا کوئی برائی نہیں۔ یہ ایک نعمت ہے جو فطرت کی طرف سے کسی کو دی جاتی ہے۔ اگر یتیم ہونا نعمت نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے یتیمی کا انتخاب نہ فرماتے۔یتیم ہونا کسی بچہ یا بچی کے لیے قدرت کی طرف سے ایک خوشخبری ہے۔اس بات کی

خوشخبری کہ تم کو زندگی کے سفر کے لیے وہ کورس عطا کیا گیا ہے جو اس انسان کو عطا ہوا جس کے بارے میں نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم حضرات بھی اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ آپ ﷺ پوری تاریخ بشری کے سب سے زیادہ کامیاب انسان تھے۔

یتیم بچہ یا بچی کو پیدا ہونے کے بعد دنیا میں اپنے فطری امکان کو بروئے کار لانے کے لیے اور کیا چیز ملنی چاہیے اس کا اشارہ اس قرآنی آیت میں ملتا ہے۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَى (الضحیٰ، 93:6)۔ یعنی، اپنے آغاز حیات میں اپنی زندگی کی تعمیر کے لیے ایک ماویٰ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ یتیم خانہ اور اسی طرح تمام یتیم خانے اسی آیت کی عملی تفسیر ہیں۔ وہ یتیموں کو ماویٰ فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح کے کام کو میں اپنی زبان میں منصوبۂ خداوندی سمجھتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بتیا کے اس یتیم خانہ کو حقیقی معنوں میں یتیموں کا ماویٰ بنائے اور اس کو زیادہ سے زیادہ ترقی عطا فرمائے۔

یتیم خانہ کے ایک طالب علم فصیح اختر (17 سال) نے ایک نعت سنائی۔ غالباً یُتم (orphanhood) نے ان کی آواز کو کافی پر اثر بنا دیا تھا۔ اس نعت کا ایک شعر یہ تھا:

پتھر کا کلیجہ بھی شق ہو فولاد بھی پانی پانی ہو ۔۔۔ اتنا ہے کلام رب میں اثر جو تم کو اثر معلوم نہیں

یہ یتیم خانہ 1928 سے قائم ہے۔ ایک صاحب نے اپنا قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ بچپن میں میں یتیم ہو گیا تھا۔ میرے رشتہ داروں نے مجھے اس یتیم خانہ میں داخل کر دیا۔ میرے ساتھ دو یتیم بچے اور تھے۔ ہم تینوں نے یتیم بچوں کی حیثیت سے اس یتیم خانہ میں پرورش پائی۔ اس وقت بظاہر ہمارا کوئی مستقبل نہ تھا۔ مگر آج ہم تینوں اللہ کے فضل سے کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ آپ کے اسی یتیم ہونے کا نتیجہ ہے۔ یتیمی کی حالت بہترین حالت ہے۔ یتیمی آدمی کے اندر خود شناسی پیدا کرتی ہے۔ وہ آدمی کے اندر خود کفیل بننے کا جذبہ ابھارتی ہے۔ یتیم آدمی سمجھتا ہے کہ میرا کوئی سہارا نہیں، اس لیے مجھ کو خود ہی سارا عمل کرنا ہے۔ اس طرح وہ دوسروں سے زیادہ محنت کرنے لگتا ہے۔ یتیمی کے حالات آدمی کو ہیرو بنا دیتے ہیں۔

بتیا میں کئی لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک صاحب وہ تھے جن کی عمر 30 سال تھی۔ ان کے والدین کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا۔ رشتہ داروں نے ان سے بڑی بے رحمی برتی۔ حتی کہ ان کو ایک معمولی مدرسہ میں داخل کردیا۔ چنانچہ ان کا ابتدائی زمانہ تکلیفوں اور مصیبتوں میں گزرا۔ بے عزتی اس کے علاوہ تھی۔ اس کے بعد وہ کسی طرح بمبئی پہنچ گئے وہاں انہوں نے محنت کرنا شروع کیا یہاں تک کہ اب وہ ایک کامیاب انسان کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ بچپن میں وہ بے سہارا اور یتیم تھے۔ اب وہ پورے معنوں میں ایک سلف میڈ مین (self-made man) ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ان کے سینہ میں لوگوں کے خلاف سخت شکایات ہیں۔ ان کا سینہ ماضی کی تلخ یادوں سے بھرا ہوا ہے۔

میں نے ان سے نصیحت کے طور پر دو باتیں کہیں۔ ایک بات یہ کہ یاد رکھئے، سب سے بڑی عبادت اللہ کا شکر ہے۔ شکر بے حد لطیف چیز ہے۔ شکر اور نفرت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔ جو آدمی شکر جیسی افضل عبادت کا انعام لینا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے سینہ کو نفرت سے مکمل طور پر پاک رکھے۔ گندے برتن میں آپ دودھ رکھیں تو دودھ خراب ہوجائے گا۔ اسی طرح نفرت اور انتقام سے بھرے ہوئے سینہ میں شکر جیسے نورانی جذبہ کا جگہ پانا ممکن نہیں۔

دوسری بات ان سے میں نے یہ کہی کہ جن لوگوں نے آپ کو بچپن میں بے سہارا چھوڑ دیا، دراصل یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے آپ کو ترقی تک پہنچایا۔ فطرت کا یہ قانون ہے کہ جو آدمی اپنے آپ کو بے سہارا پائے اس کے اندر عمل کا بے پناہ جذبہ ابھر آتا ہے۔ زندگی کی مشکلات کسی انسان کے لیے مہمیز کا حکم رکھتی ہیں۔ اس دنیا میں ترقی کے درجہ تک وہی پہنچتا ہے جس کو زندگی میں جھٹکے لگتے ہیں، یہ گویا شاک ٹریٹمنٹ کا معاملہ ہے۔ یعنی زحمت میں رحمت۔

مولانا قاری بدرالدین قاسمی (29 سال) آج کل بمبئی میں رہتے ہیں۔ ان سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ ایک موقع پر میں نے کہا کہ اعلانِ حق کوئی مطلق چیز نہیں۔ اگر اعلان حق کوئی مطلق چیز ہوتی تو حدیث میں یہ نہ ہوتا کہ: مَنْ صَمَتَ نَجَا (مسند احمد، حدیث نمبر 6481)۔

یعنی، جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔ انہوں نے کہا کہ پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے جس کے مطابق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَنْ رَأَى مِنكُمْ مُنكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ (مسند احمد، حدیث نمبر 11460)۔ میں نے کہا کہ اس حدیث کو سمجھنے میں عام طور پر سخت غلطی کی جاتی ہے۔ اس حدیث میں استطاعت کی شرط لگی ہوئی ہے۔ استطاعت کا مطلب اقدام کی استطاعت نہیں ہے، بلکہ نتیجہ کی استطاعت ہے۔ یعنی عملی اقدام یا لسانی اقدام کرکے اگر مطلوب نتیجہ برآمد کرنا اپنے بس میں ہو تو اقدام کیا جائے گا ورنہ خاموشی اختیار کی جائے گی۔ اور صرف دعا پر اکتفا کیا جائے گا۔

اس کے بعد ہم لوگ ساٹھی پہنچے۔ یہاں مدرسہ ریاض العلوم واقع ہے۔ وہ 1946 میں قائم ہوا۔ وہ ترقی کرتے کرتے ایک بڑا تعلیمی ادارہ بن چکا ہے۔ اس میں لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز ریاض العلوم کی مسجد میں ادا کی۔ نماز کے بعد مسجد میں اجتماع ہوا۔ وسیع مسجد پوری طرح بھری ہوئی تھی۔ ریاض العلوم کی مسجد کی تقریر میں میں نے دینی تعلیم کی اہمیت اور مدارس دینیہ کے کردار پر خطاب کیا۔ یہ ایک تفصیلی خطاب تھا اس خطاب میں دوسری باتوں کے علاوہ میں نے ایک بات یہ کہی کہ بہت سے لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ اس ملک میں مدارس کے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ مدارس کے خلاف غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں۔ مدارس کے نظام کو تباہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ اس قسم کی مخالفانہ کوششیں ہر چیز کے خلاف اور ہمیشہ کی جاتی رہی ہیں۔

قرآن کے بیان کے مطابق، یہ دنیا عداوتوں کی دنیا ہے۔ ہمیں عداوتوں کے ماحول میں جینا ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ ہم منفی ردعمل سے بچیں اور مثبت ردّعمل کے ذریعہ ان حالات کا خاموش مقابلہ کریں۔ میں نے کہا، صحیح البخاری کی ایک روایت میں رسول اللہ نے فرمایا: إِنَّ اللَّهَ يُعْطِي عَلَى الرِّفقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى العُنْف (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2593)۔ یعنی، خدا پُرامن عمل پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ منفی ردّعمل پر نہیں دیتا۔

اس حدیث میں یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ مسائل کا مقابلہ اگر تشدد کے انداز میں کیا جائے تو صرف ناکامی ہمارے حصہ میں آئے گی۔ اس کے برعکس، اگر مسائل کا مقابلہ نرمی اور امن کے اسلوب میں کیا جائے تو کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ جمعہ کے پروگرام کے بعد ریاض العلوم میں پریس کانفرنس تھی اس میں "دینک جاگرن"، "ہندستان" اور دوسرے اخباروں کے نمائندے موجود تھے۔ سوال وجواب کی صورت میں یہ کانفرنس دیر تک چلتی رہی۔

ایک ہندو اخبار نویس نے کہا کہ سارے مذہبوں کو ایک کیسے بنایا جائے۔ کیوں کہ جب تک سارے مذاہب ایک نہ ہو جائیں۔ ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا کہ اتحاد کا کوئی تعلق مذہبوں کو ایک کرنے سے نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کے درمیان آپس میں لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کورو اور پانڈو دونوں کا مذہب ایک تھا۔ اس کے باوجود دونوں میں خونیں جنگ ہوئی۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں ہونے والی دو عالمی جنگوں میں دونوں فریق ایک ہی مذہب کو ماننے والے تھے۔ حال کی خلیجی جنگ دو ہم مذہب لوگوں کے درمیان ہوئی، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ اتحاد کا راز ٹالرنس ہے۔ اگر آپ کو ملک میں اتحاد لانا ہے تو مذہبوں کو بے فائدہ طور پر ایک کرنے کی بات نہ کیجیے۔ بلکہ لوگوں کو اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنے کا سبق دیجیے۔ لوگوں سے کہئے کہ فرق واختلاف فطرت کا لازمی حصہ ہے۔ دوسرے معاملات میں ایسا ہے کہ لوگ فرق اور اختلاف کے باوجود باہمی احترام کے اصول پر زندگی گزارتے ہیں۔ یہی اصول مذہب کے دائرہ میں بھی کارآمد ہے۔

ریاض العلوم ساٹھی میں برابر لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اور ان سے دینی اور ملّی موضوعات پر تبادلۂ خیال جاری رہا۔ ایک صاحب جو میرے ساتھ سفر میں شریک تھے، وہ شہری زندگی کے عادی ہیں۔ ہمارا سفر زیادہ تر دیہاتی علاقوں میں ہوا، جہاں اونچے نیچے راستے تھے۔

ہم کوطرح طرح کے پرمشقت معاملات سے سابقہ پیش آیا۔ اس تجربہ سے وہ کچھ گھبرا گئے اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے سفر کے اس تجربہ کو پر تاسف (deplorable) قرار دیا۔ میں نے کہا کہ اسلام نام ہے ہر واقعہ سے مثبت اثر لینے کا۔ مثلاً یہ تکلیف دہ تجربات جو ہمارے ساتھ گزر رہے ہیں، اس سے ہم کوشکر کی غذا لینا چاہیے۔ کیوں کہ یہ ہمارے لیے صرف ایک وقتی مصیبت ہے، جب کہ وہ ان گاؤں والوں کے لیے مستقل مصیبت ہے۔ ہم کو سوچنا چاہیے کہ اللہ نے ہمارے ساتھ آسانی کا معاملہ فرمایا ہے۔ ہم کو اس سخت امتحان میں نہیں ڈالا، جس میں گاؤں اور دیہات کے یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں۔

26 مئی کی شام کو مغرب کی نماز ریاض العلوم میں پڑھی گئی۔ اس کے بعد ہم لوگ آگے کے لیے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے مجھے ریاض العلوم کے تحت بننے والا لڑکیوں کا مدرسہ دکھایا گیا۔ یہ ایک کشادہ اور خوب صورت عمارت تھی۔ آج کل سارے ملک میں جگہ جگہ مسلم لڑکیوں کے لیے اسکول اور مدرسے بنائے جارہے ہیں۔

یہ ایک بے حد خوش آئند بات ہے۔ کچھ لوگ لڑکیوں کی تعلیم پر خدشات ظاہر کر رہے ہیں۔ حال میں ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ جولڑکیاں عالمہ اور فاضلہ بن رہی ہیں ان میں طلاق کی شرح دوسری لڑکیوں سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ ان تعلیم یافتہ مسلم لڑکیوں کو آسانی سے سروس مل جاتی ہے۔ اس لیے ان کے اندر شوہر کے تابع نہ رہنے کا وہی مزاج پیدا ہو رہا ہے جو مغربی سماج کی لڑکیوں میں اسی سبب سے پایا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ مجھے اس سے بحث نہیں کہ آپ کی یہ اطلاع درست ہے یا نہیں۔ میرے نزدیک زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس دنیا میں نہ سارے مرد معیاری ہوتے ہیں اور نہ ساری عورتیں۔ آپ پڑھائیں یا نہ پڑھائیں اس دنیا میں کبھی بھی نہ تمام خواتین معیاری خواتین بن جائیں گی اور نہ تمام مرد معیاری مرد۔

اس طرح سفر کرتے ہوئے ہم لوگ سرسیا پہنچے۔ یہاں مدرسہ صدیقیہ میں خطاب کا پروگرام تھا۔اس مدرسہ کومولانا عبدالرحیم امدادی نے اپنے پیرومرشد قاری محمد صدیق باندوی کے نام پر قائم کیا ہے۔ یہاں خطاب کا وقت 10 بجے رات تھا۔ یہاں کافی لوگ اکٹھا ہو گئے۔ میں نے اس موقع پر ایک مفصل تقریر کی۔میری تقریر کا موضوع تعلیم دین کی اہمیت تھا۔میں نے کہا کہ تعلیم دین فرض کے درجہ میں ضروری ہے۔تعلیم کا تعلق ایمان سے بہت گہرا ہے۔ایمان کیا ہے،ایمان دراصل دین خدا کی صداقت کوشعوری اور روحانی طور پر دریافت کرنا ہے۔ یہ دریافت عام حالات میں علم کے بغیر نہیں ہوسکتی۔

مدرسہ صدیقیہ کے پروگرام میں حاضرین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ یہاں کافی دیر ہوگئی یہاں تک کہ رات کے بارہ بج گئے۔رات گزارنے کے لیے ہم لوگ ساٹھی آگئے پھر صبح کے وقت پٹنہ کے لیے روانہ ہوئے،اور 27 مئی 2000 کی شام کو میں واپس دہلی پہنچا۔

(الرسالہ،اکتوبر 2000)

اسلام کی خدمت

جامعہ دارالسلام کے چار طلبہ ملاقات کے لیے آئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ میں صحافت کے ذریعہ اسلام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔میں نے کہا کہ اسلام کی خدمت کسی صحافت یا غیر صحافت کے ذریعہ نہیں ہوتی، اسلام کی خدمت صبر اور محنت کے ذریعہ ہوتی ہیں۔اگر آپ اپنے اندر صبر اور محنت کی صفت پیدا کرلیں تو آپ جہاں بھی رہیں گے آپ کامیاب طور پر اسلام کی خدمت کرسکیں گے۔اور اگر صبر اور محنت کی صفت آپ کے اندر نہیں ہے تو کہیں بھی آپ اسلام کی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتے۔(ڈائری،14 اگست 1996)

ایک ہفتہ بہار میں

مدرسہ صدیقیہ (سرسیا) کی دعوت پر بہار کا سفر ہوا۔ مدرسہ صدیقیہ مولانا عبد الرحیم امدادی نے اپنے مرشد، قاری صدیق باندوی (وفات 1997) کے نام پر قائم کیا ہے۔ 31 اکتوبر 2000 کی شام کو دہلی سے راجدھانی اکسپریس کے ذریعہ روانگی ہوئی اور 8 نومبر 2000 کی صبح کو دوبارہ راجدھانی اکسپریس کے ذریعہ دہلی واپس آیا۔ یہ سفر ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ اس سفر کی روداد مختصر طور پر یہاں درج کی جاتی ہے۔

بہار کا ابتدائی تعارف مجھے تقریباً 65 سال پہلے اس وقت ہوا جب کہ میں یوپی کے ایک عربی مدرسہ کا طالب علم تھا۔ ایک بار بہار کے ایک نوجوان اس مدرسہ میں داخلہ کے لیے آئے۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ دار الاقامہ میں پہنچے تو وہاں کے طلبہ نے سنجیدہ انداز میں کہا: "کیا آپ کے شامل بدھنا بھی ہے"۔ یہ بظاہر ایک سنجیدہ سوال تھا۔ مگر وہ بہار کے طالب علم کی تضحیک تھی۔

بہار کے طلبہ لوٹے کو بدھنا کہتے تھے اور ساتھ کی جگہ شامل بولتے تھے۔ یہ زبان یوپی والوں سے مختلف تھی۔ اور یوپی والے چونکہ اپنی زبان کو معیار سمجھتے ہیں اس لیے وہ اس قسم کے فرق پر بہار والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔

یہ معاملہ صرف نوجوان طلبہ تک محدود نہیں تھا۔ اساتذہ کا رویہ بھی اس معاملہ میں زیادہ مختلف نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہماری کلاس میں عربی کا ایک لفظ، غالباً 'دقیق' سامنے آیا۔ ہمارے استاد نے اس کا مطلب پوچھا۔ بہار کے ایک طالب علم نے اس کو بتاتے ہوئے کہا باڑیک۔ استاذ نے یہ سن کر کہا کہ آپ نے تو اس کو اور موٹا کر دیا۔ بہار کے لوگ چونکہ اکثر 'ر' کو 'ڑ' کی طرح بولتے ہیں، اس لیے یہ لطیفہ پیش آیا۔

یوپی اور دہلی کے لوگ بہار والوں کی زبان اور ان کی تہذیب کو لمبی مدت سے اپنے سے کم

سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ ''بہاری'' کا لفظ وسط ہند کی زبان میں کم تر کے معنی میں معروف ہو گیا۔ مگر اب صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ یوپی اور دلی کے مسلمانوں کا فخر پسندی کا مزاج ان کے لیے الٹا ثابت ہوا۔ اس مخصوص ذہن کی بنا پر ان کے اندر محنت اور ایڈجسٹمنٹ کا مزاج پرورش نہ پاسکا۔ چنانچہ وہ جدید ترقیاتی میدان میں زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔ اس کے برعکس، بہار کے لوگوں کے حالات نے ان کے اندر تواضع (modesty) اور کمی کا مزاج پیدا کیا۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر وہ زیادہ محنت کرنے لگے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بہار کے مسلمان تقریباً ہر میدان میں یوپی اور دلی کے مسلمانوں سے آگے ہیں، ملک کے اندر بھی اور ملک کے باہر بھی۔

پٹنہ میں انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا کی خاتون نمائندہ سنجیدہ بانو نے اپنے اخبار کے لیے تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ان کا ایک سوال یہ تھا کہ آپ بھی ایک عالم ہیں، مگر روایتی علما اور آپ کے درمیان فرق ہے ایسا کیوں۔ میں نے کہا کہ میں کوئی ماڈرن عالم نہیں۔ میں بھی پورے معنوں میں ایک روایتی عالم ہوں۔ جہاں تک اسلام اور قرآن وحدیث کا تعلق ہے میرے اور ان کے درمیان عقیدہ وعمل کا کوئی اختلاف نہیں۔ اس اعتبار سے دونوں کا دین مکمل طور پر ایک ہے۔ میرے اور ان کے درمیان جو فرق ہے وہ نظریہ نہیں بلکہ طریق کار ہے۔

میرا معاملہ یہ ہے کہ میں نے مدرسہ میں عربی اور دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد ذاتی محنت سے انگریزی پڑھی اور جدید علوم کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اس سے میں نے سمجھا کہ اسلام کی ابدی صداقت کو جدید اسلوب میں پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ آج کے انسان کے لیے زیادہ قابل فہم ہو سکے۔ اس ایک بات کے سوا دونوں کے درمیان کوئی اور فرق نہیں۔

یکم نومبر کی صبح کو پٹنہ سے ڈھاکہ کے لیے روانگی ہوئی۔ اس سفر میں کئی لوگ میرے ساتھ تھے۔ برادرم محمد ثناء اللہ ندوی (26 سال) بھی میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے 1995 میں ندوہ سے فراغت کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کی سب سے پہلی کتاب جو میں نے پڑھی وہ الاسلام یتحدی (مذہب اور جدید چیلنج) ہے اس کے بعد میں برابر آپ کی تحریریں پڑھتا

ہوں۔ انہوں نے اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھے۔ ”میں نے حضرت کی کتابوں سے جہاد کا صحیح تصور، دعوت کا حقیقی نہج، سنت رسول کا صحیح نمونہ، زندگی کا اصل مقصد، جینے کا حوصلہ، حق کی تلاش کا سچا جذبہ اور خدمت دین کی روحانی قوت کا سبق لیا ہے اور اب الحمدللہ مولانا کی کتابوں سے اور ان کے مشن، دعوت حق سے مکمل اتفاق رکھتا ہوں“ برادرم ثناء اللہ ندوی بہار کے اس پورے سفر میں میرے ساتھ رہے، میں نے انہی کے ذریعہ یہ سفر نامہ لکھوایا۔

یکم نومبر کو پٹنہ سے ڈھاکہ جاتے ہوئے درمیان میں ہم لوگ مظفر پور سے گزرے یہاں تھوڑی دیر کے لیے قیام کیا گیا۔ مظفر پور بہار کا ایک شہر ہے جو کپڑے وغیرہ کی مارکیٹ کے لیے مشہور ہے۔

مظفر پور میں ایک قدیم مدرسہ ہے۔ یہاں عربی اور دینی تعلیم کا انتظام ہے۔ مولانا عبدالرحیم امدادی نے کہا کہ ان کے شیخ حضرت قاری محمد صدیق باندوی نے سُلّم کی تعلیم اسی مدرسہ میں حاصل کی تھی۔ سُلّم قدیم منطق کے موضوع پر ایک کتاب ہے۔ اس کا پورا نام سُلّم العلوم ہے۔ اس کے مصنف بہار کے ایک عالم قاضی محبّ اللہ بہاری (وفات 1119ھ) ہیں۔ وہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہم عصر تھے۔ قدیم زمانے میں منطق کی اس کتاب کی اتنی زیادہ اہمیت ہوئی کہ اورنگ زیب نے قاضی محبّ اللہ بہاری کو اپنے بیٹوں کی تعلیم کے لیے مقرر کیا۔ مگر اب اس کتاب کی اہمیت زیادہ تر تاریخی ہے عصری منطق کے اعتبار سے اس کی زیادہ اہمیت نہیں۔

سلّم العلوم کی شرحیں کثرت سے لکھی گئی ہیں۔ ”شرح نویسی“ کا یہ طریقہ میرے نزدیک صرف تقلیدی ذہن کی پیداوار ہے۔ صحیح یہ ہے کہ لکھنے والے لوگ خود اپنی تحقیق سے نئی کتابیں لکھیں۔ شرح نویسی کے اس طریقہ کا نقصان یہ ہوا کہ بعد کے زمانے میں ذہنی ارتقاء کا عمل رک گیا۔ لوگوں نے قدیم متون کو مقدس سمجھ لیا اس کے بعد انسانی ذہن کا کام صرف اس کی شرح لکھنا رہ گیا نہ کہ خود کوئی نیا اور تخلیقی کام پیش کرنا۔

برادرم محمد ثناء اللہ ندوی نے بتایا کہ وہ نہ صرف خود الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ کو پڑھتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی پڑھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اپنے تجربات کے دائرے میں انہوں نے بتایا کہ ایک دن وہ اپنی دکان پر میری کتاب "مذہب اور جدید چیلنج" پڑھ رہے تھے۔ اس اثناء میں ایک مقامی عالم آگئے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کون سی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ ثناء اللہ صاحب نے کہا کہ یہ مولانا وحید الدین خان کی کتاب "مذہب اور جدید چیلنج" ہے۔ انہوں نے یہ سنتے ہی کہا کہ لاحول ولاقوۃ۔ یہ تم کس کی کتاب پڑھ رہے ہو۔ یہ تو مسلم دشمنوں کے ایجنٹ ہیں، وہ معمر قذافی کے آدمی ہیں۔ ثناء اللہ صاحب نے کہا کیا آپ نے ان کی کتابیں پڑھی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ ثناء اللہ صاحب نے ان سے کہا کہ پھر آپ نے بغیر جانے ہوئے کیسے رائے قائم کرلی۔ انہوں نے کہا کہ میں جانتا ہوں وہ تو لیبیا کے معمر قذافی کے ایجنٹ ہیں جو ایک بدنام دشمن اسلام ہے۔

جناب ثناء اللہ ندوی کے پاس اس وقت راقم الحروف کی کتاب غیر ملکی اسفار حصہ اول تھی جس کو وہ پڑھ چکے تھے۔ اس کتاب میں لیبیا کا ایک سفرنامہ شامل ہے۔ جس میں معمر قذافی کے بارے میں یہ الفاظ چھپے ہوئے ہیں:

مجھے کرنل قذافی کی پالیسیوں سے اتفاق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کرنل قذافی کے ثورہ (انقلاب) نے لیبیا کو نقصان زیادہ پہنچایا ہے اور فائدہ کم۔ اسلام کے بارے میں بھی ان کی بہت سی تعبیرات احمقانہ ہیں" (صفحہ 11)۔

ثناء اللہ ندوی صاحب نے بتایا کہ اس اقتباس کو سننے کے بعد مذکورہ عالم اس قدر مبہوت ہوئے کہ وہ حیرانی کے ساتھ میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کی خاموشی اس بات کی علامت تھی کہ وہ اس مطبوعہ اقتباس کو دیکھنے کے بعد سرتاسر لاجواب ہوگئے ہیں۔ مگر انہوں نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ میں اس معاملے میں سخت غلطی پر تھا۔ بلکہ انہوں نے صرف یہ کیا کہ موضوع بدل کر دوسری بات شروع کردی۔

لوگوں کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے۔ خود اس پر کتنے ہی زیادہ دلائل دے دیے جائیں۔ ان میں سے کوئی شخص یہ کرتا ہے کہ دلائل کے مقابلے میں بے بس ہو کر چپ ہو جاتا ہے۔ اور کوئی شخص اس کے بعد بھی بے تکان بولتا رہتا ہے۔ خواہ اس کو خود بھی اپنے بولے ہوئے الفاظ کا مطلب معلوم نہ ہو۔

راستہ میں ہم لوگ موتی ہاری سے گزرے یہاں۔ کچھ دیر کے لیے مدرسہ خیر العلوم میں قیام کیا۔ اس کے ناظم مولانا محمد عالم القاسمی ہیں یہ مدرسہ 1974 میں قائم ہوا۔ یہاں ڈیڑھ سو طلباء کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اساتذہ اور دوسرے کارکنوں کی تعداد سترہ ہے۔ یہ مدرسہ ایک پرسکون جگہ پر واقع ہے۔

اس طرح کے لاکھوں چھوٹے بڑے مدرسے پورے ملک میں خاموش کام کررہے ہیں۔ وہ علم دین کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچا رہے ہیں انہی مدارس کا یہ کارنامہ ہے کہ ہندستان میں آج علم دین زندہ ہے۔ مسلم ملکوں میں احیاءِ تعلیم کا یہ کام حکومتوں کے تعاون سے ہوتا ہے۔ ہندستان میں یہ کام علما کی قربانیوں کے ذریعہ انجام پا رہا ہے۔ ہندستان میں اتنی بڑی تعداد میں مدارس دینیہ کی موجودگی اس خدائی ضمانت کی ایک زندہ مثال ہے جس کو حفاظت دین کہا جاتا ہے۔ مدارس کے موضوع میں نے ایک مفصل مقالہ شائع کیا ہے یہ مقالہ ماہنامہ الرسالہ کے شمارہ ستمبر 2000 میں تفصیل کے ساتھ چھپا ہے۔

میں نے ظہر کی نماز اسی مدرسہ کی مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد طلبا و اساتذہ کے سامنے ایک مختصر خطاب کیا۔ اس خطاب میں، میں نے کہا کہ یہ مدارس ایک عظیم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہ ادارے اس تحفظ دین کا ذریعہ ہیں جس کا فیصلہ اللہ نے فرمایا ہے۔ اللہ کا یہ فیصلہ اسباب کے اعتبار سے زیادہ تر انہیں مدارس کے ذریعہ انجام پا رہا ہے۔

سفر کے دوران اس بات کا اندازہ ہوا کہ الرسالہ مشن کس طرح لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ مثلاً اس سفر میں ایک واقعہ پیش آیا۔ میرے اس سفر کا پروگرام طے کرنے بعد

مولانا عبدالرحیم امدادی نے مختلف مقامات کے سفر کیے تا کہ پروگرام کا نظام بنا سکیں۔ اس سلسلے میں وہ ڈھاکہ گئے۔ وہاں ان کو جناب عطاء اللہ ڈھاکوی سے ملنا تھا۔ ایک کپڑے کے تاجر سے انہوں نے عطاء اللہ صاحب ڈھاکوی کا پتہ پوچھا۔ اس تاجر نے اپنے قیاس کے ذریعہ مولانا عبدالرحیم امدادی سے کہا" غالباً آپ مولانا وحیدالدین کے پروگرام سلسلے میں یہاں آئے ہیں"۔

انہوں نے کہا کہ ہاں، تاجر نے کہا کہ میں خود بھی مولانا کا شیدائی ہوں۔ اس کے بعد مذکورہ تاجر مولانا عبدالرحیم امدادی کو اپنی دکان میں لے گئے اور کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ اس پروگرام میں شریک ہوں۔

یہ تاجر محمد ثناء اللہ ندوی تھے۔ انہوں نے الرسالہ مشن کی کافی کتابیں پڑھی ہیں۔ اور وہ پوری طرح اس مشن میں شامل ہو چکے ہیں۔ مگر اس سے پہلے ان کا تعارف اس حیثیت سے نہ مجھ سے تھا اور نہ کسی اور سے۔ یکم نومبر 2000 سے پہلے میں محمد ثناء اللہ ندوی کا نام بھی نہیں جانتا تھا مگر اس سفر کے دوران ان کا جو تعارف ہوا اس سے معلوم ہوا کہ وہ خود اپنی ذات میں دعوت کی ایک تاریخ لیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی دعوتی زندگی کے کئی ایسے واقعات بتائے جو میرے جیسے آدمی کے لیے بلاشبہ حیرت انگیز ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ڈھاکہ میں ایک نوجوان محمد نسیم احمد ہیں۔ میں ان کو تقریباً پانچ سال سے جانتا تھا لیکن مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ وہ الرسالہ مشن سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

موجودہ پروگرام کے تحت عبدالرحیم امدادی صاحب ڈھاکہ آئے۔ وہ ان کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اس درمیان اتفاق سے محمد نسیم صاحب وہاں آ گئے۔ انہوں نے نسیم صاحب کو پروگرام کی بابت بتایا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور پھر انہوں نے اپنے بارے میں یہ بات بتائی کہ وہ الرسالہ مشن کی ساری کتابیں پڑھ چکے ہیں۔

انہوں نے الرسالہ کے بہت سے شمارے دہلی سے منگوا کر تقسیم کیے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں بہار کے اس پروگرام میں شروع سے آخر تک شریک رہوں گا۔

ایک عجیب سبق آموز بات معلوم ہوئی کہ بہار کا موجودہ پروگرام اتفاق سے ایسے وقت بنا جب کہ یہاں ہندوؤں میں چھٹ تیوہار پڑ رہا تھا۔ یہ کپڑے کی تجارت کے لے سیزن کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ محمد ثناء اللہ ندوی کے لیے ایک آزمائش کا لمحہ تھا۔ وہ دکان میں بیٹھ کر سیزن کا فائدہ اٹھائیں یا دکان کو بند کر کے ہمارے پروگراموں میں شرکت کریں۔ پروگرام میں شرکت کے لیے دکان کو بند کرنا ضروری تھا کیوں کہ ان کی غیر موجودگی میں دوسرا کوئی شخص نہ تھا جو دکان کو دیکھے۔

31 اکتوبر 2000 کو وہ اپنی دکان پر تھے، شام 3 بجے تک سترہ ہزار روپئے کی بکری ہو چکی تھی اور خریداروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ تین بجے انہوں نے فیصلہ کیا کہ بہر حال مجھے پروگرام میں شرکت کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے گاہکوں کی بھیڑ چھوڑ دی اور دکان کو بند کر کے اللہ پر توکل کرتے ہوئے پٹنہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ یکم نومبر کو محمد ثناء اللہ ندوی نے اپنا یہ واقعہ بتایا تو میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ میں کہا کہ خدایا تو اس نوجوان کی اور ہم سب کی مدد فرما۔

سید نعیم اختر صاحب منشاء ٹولہ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ آج کل دنیا بھر کے علما جہاد کی باتیں کرتے ہیں یہ لوگ ہر ملک کے مسلمانوں کو جہاد کے اوپر بھڑکائے ہوئے ہیں۔ صرف آپ ایک ایسے عالم ہی جو جہاد اور ٹکراؤ کی بات نہیں کرتے۔ ایسا کیوں، کس طرح یہ سمجھا جائے کہ دونوں میں سے کون برحق ہے۔

میں نے کہا کہ جہاد کو بطور ایک شرعی حکم کے میں بھی اسی طرح مانتا ہوں جس طرح دوسرے علما مانتے ہیں۔ مگر شریعت کے ہر حکم کی کچھ شرطیں ہیں، اسی طرح جہاد کی بھی کچھ لازمی شرطیں ہیں۔ پہلی بات یہ کہ تمام علماء کی متفقہ رائے کے مطابق، جہاد سے پہلے دعوت ضروری ہے۔ دعوت کی پر امن جد وجہد کے بغیر مسلح جہاد چھیڑنا اسلام میں سرے سے جائز ہی نہیں۔ میرا یہ کہنا ہے کہ موجودہ زمانے میں ہمارا پہلا فریضہ یہ ہے کہ ہم دوسری قوم تک اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ نہ یہ کہ ملک ومال کی شکایتوں کو لے کر ان سے لڑنا شروع کر دیں۔ شرائط کی تکمیل

کے بغیر جو جہاد کیا جائے وہ شریعت کی نظر میں فساد ہوگا، نہ کہ جہاد۔ دوسری بات یہ کہ اگر بالفرض وہ حالات پیدا ہو جائیں جب کہ جہاد کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے تب بھی جہاد سے پہلے اعداد (تیاری) کا مرحلہ طے کرنا ضروری ہوگا۔ اعداد کے بغیر جہاد صرف ایک خودکشی کا فعل ہے، وہ ہرگز جہاد نہیں۔

اکثر پرجوش مسلمان اس معاملے میں غزوۂ بدر کا حوالہ دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں فریق ثانی کی نسبت سے کوئی تیاری نہیں تھی پھر بھی مسلمانوں نے ان سے جنگ کی اور کامیاب ہوئے۔ میرے نزدیک ایسا کہنا صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ کہنے والا مجرمانہ حد تک قرآن سے ناواقف ہے۔ قرآن سے واضح طور پر ثابت ہے کہ جب یہ اطلاع ملی کہ مکہ سے ایک ہزار مسلح فوج مدینہ کی طرف آرہی ہے تو مسلمان اپنی عدم تیاری کی بنا پر ان سے مڈبھیڑ کے لیے راضی نہ تھے اس کے بعد اللہ تعالی نے ان کے پاس یہ خوش خبری بھیجی کہ تم لوگ آگے بڑھو، میں تمہاری مدد کے لیے ایک ہزار فرشتے لگاتار بھیج رہا ہوں (الانفال، 9:9)۔

اللہ تعالی کی اس واضح یقین دہانی کے بعد مسلمان کمزور یا تیاری کے بغیر نہیں رہے۔ بلکہ وہ تمام طاقتوروں سے زیادہ طاقت ور ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی جب کہ موجودہ زمانے کے مسلمان بدر کا حوالہ دے کر کم از کم ڈیڑھ سو سال سے بار بار لڑ رہے ہیں۔ اور ہر موقع پر یک طرفہ شکست سے دوچار ہوئے ہیں۔ اگر وہ "بدر" کو دہرا رہے ہیں تو بدر کا نتیجہ ان کے حصے میں کیوں نہیں آیا۔

ایک صاحب جو مدرسہ سے فارغ تھے انہوں نے کہا کہ آپ نے علما کے کارناموں پر کچھ نہیں لکھا اس کا سبب کیا ہے میں نے کہا شاید آپ ماہنامہ الرسالہ کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ ابھی ستمبر 2000 کا شمارہ جو خصوصی طور پر 80 صفحات میں شائع ہوا ہے وہ پورا کا پور شمارہ علما کے کارناموں ہی پر مشتمل ہے۔

2 نومبر کی صبح کو آزاد مدرسہ اسلامیہ ڈھاکہ کا معائنہ کیا۔ یہ مدرسہ 1942 میں قائم

کیا گیا۔ اس مدرسہ کا قیام مولانا حسین احمد مدنی کی تحریک پر عمل میں آیا۔ اس مدرسہ کے ناظم قاری محمد انوار الحق اور صدر مدرس مولانا عبد السلام صاحب ہیں۔ یہاں طلبہ و اساتذہ کے سامنے ایک مختصر خطاب کیا۔ اس موقع پر میں نے مختصر طور پر علم کی اہمیت بتائی۔ میں نے کہا کہ اس دنیا میں علم ہی طاقت کا سرچشمہ ہے۔ قدیم زمانے میں اہل اسلام دنیا میں غالب ہوئے تو اس کا راز شمشیر نہیں تھا بلکہ علم تھا۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں اہل مغرب نے دنیا میں جو غلبہ حاصل کیا ہے اس کا راز بھی اہل مغرب کی سازش نہیں ہے بلکہ علم ہے۔ علم طاقت ہے (knowledge is power) یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو بیک وقت دو چیزوں میں کمال حاصل کرنا ہے۔ دین اور علم۔ دونوں میں سے کسی ایک کی کمی بیک وقت دونوں ہی کے لیے نقصان کا باعث ہوگی۔

ایک پندرہ سالہ بچہ ابراہیم ڈھاکوی سے مجھ کو ملایا گیا۔ اس کے والد نے کہا کہ یہ بچہ پڑھنے میں محنت کرتا ہے لیکن اس کو کچھ یاد نہیں رہتا۔ میں نے کہا کہ اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دنیا کے بہت سے بڑے لوگ اپنی ابتدائی عمر میں کمزور طالب علم کی حیثیت رکھتے تھے مگر یہی لوگ تھے جنہوں نے بعد کو بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ فطرت کی طرف سے ہر انسان کو صلاحیتیں دی جاتی ہیں۔ البتہ کسی کی صلاحیت شروع ہی سے نمایاں ہوجاتی ہے اور کسی کی صلاحیت بعد کو ظہور میں آتی ہے۔

2 نومبر کو دس بجے ہم لوگ جامعہ الامام ابن تیمیہ چندن بارہ پہنچے۔ اس ادارہ کی بنیاد 1964 میں رکھی گئی۔ اس جامعہ کو دیکھ کر ایک عجیب تاثر ہوا۔ میں نے بعض ہندی اور انگریزی اخباروں میں پڑھا تھا کہ نیپال کی سرحد کے قریب مسلمانوں نے اپنے تعلیمی ادارے بنائے ہیں جہاں جنگجوئی کی تربیت دی جاتی ہے۔ جامعہ ابن تیمیہ نیپال کی سرحد سے صرف تین کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور مذکورہ رپورٹوں میں خصوصی طور پر اس کا بھی ذکر تھا۔ میں نے اگرچہ اس سے پہلے ٹی وی انٹرویو میں اس کی تردید کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں خود مدرسہ ہی

کا ایک پروڈکٹ ہوں۔ اور اگر آپ لوگ مجھ کو ایک امن پسند انسان سمجھتے ہیں تو اسی سے سمجھ لیجیے کہ ہر مدرسہ امن پسندی کی تربیت گاہ ہے۔

آج جب میں نے جامعہ کے کیمپس میں قدم رکھا تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ پڑے۔ یہ آنسو اس درد کے تحت نکلے تھے کہ ہمارا ملک کتنی بڑی حقیقت سے بے خبر ہے۔ جامعہ ابن تیمیہ میں مجھے ہر طرف امن اور انسانی خیر خواہی اور علم دوستی کا ماحول نظر آیا۔ ایسا ادارہ بلاشبہ ملک کے لیے ایک سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے، مگر کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اس قسم کے تعمیری اداروں پر بے بنیاد طور پر تخریب کا الزام لگائیں۔ تاہم یہاں آنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مدارس کے بارے میں جس غلط پروپیگنڈے کی تردید میں دیکھے بغیر قیاس کی بنیاد پر کر رہا تھا اب میں خدا کے فضل سے اس کی تردید مشاہدہ کی بنیاد پر کر سکتا ہوں۔

جامعہ میں خواتین کا ایک مدرسہ بھی ہے اس کو بھی دیکھا۔ اس کا ایک الگ اور مستقل کیمپس ہے۔ اس میں دار الاقامہ سے لے کر مسجد تک ہر چیز موجود ہے۔ پچھلے سالوں میں ہندستان کے مسلمانوں میں خصوصی طور پر یہ رجحان پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو پڑھائیں۔ چنانچہ بہت سے مدرسے اور اسکول خواتین کی تعلیم کے لیے قائم ہوئے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک روشن علامت ہے۔

جامعہ الامام ابن تیمیہ چندن بارہ پندرہ یکڑ کے رقبہ میں واقع ہے۔ اس کے مختلف شعبوں کو دیکھنے کے لیے مجھے کار سے چلنا پڑا۔ اس کے وسیع کیمپس میں چلتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہاں زمین کے اوپر ایک اسلامک یونیورسٹی ابھر رہی ہو۔ دل سے دعا نکلی کہ اللہ اس ادارہ کو وہ ادارہ بنائے جو اسلام کی جدید ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہو۔

میں نے یہاں کے اساتذہ کی ایک مجلس میں کہا کہ دعوتی نقطۂ نظر سے موجودہ زمانے کا سب سے بڑا کام اسلام کو جدید ذہن کے لیے قابل فہم بنانا ہے۔ دعوت کا کام ایک دوطرفہ عمل ہے۔ اس میں ایک طرف داعی ہوتا ہے اور دوسری طرف مدعو۔ دعوت کے عمل کو درست طور پر

انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ داعی اپنے مدعو کے ذہن کو سمجھے۔ اس کی زبان اوراس کا اسلوب کلام ایسا ہو جو اس کے مدعو کے لیے قابل فہم ہو جو مدعو کو سوچنے پر مجبور کردے۔

مولانا ذکاء اللہ عبدالقدوس صاحب نے کہا کہ قرآن میں واضح طور پر یہ آیت ہے کہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (24:55)۔یعنی، اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں اقتدار دے گا۔ موجودہ حالات کی روشنی میں اس آیت کی تفسیر کیا ہے۔ میں نے کہا کہ استخلاف بلاشبہ اللہ کا ایک وعدہ ہے، مگر خود آیت بتاتی ہے کہ یہ ایک مشروط وعدہ ہے۔ یعنی جب شرط پوری ہوگی اسی وقت وعدہ کی تکمیل ہوگی۔ آیت کے مطابق یہ شرطیں بنیادی طور پر دو ہیں۔ ایمان اورعمل صالح۔ ایمان اورعمل صالح کے بغیر خلافت کے وعدہ کی تکمیل ممکن نہیں۔

اس آیت کے مطابق امت میں اگر ایمان اورعمل صالح موجود ہو تو لازماً اس کو خلافت حاصل ہوگی۔ اسی طرح اس کے برعکس، اگر خلافت موجود نہ ہو تو یہ اس کا لازمی ثبوت ہوگا کہ امت کے اندر مطلوب ایمان اور مطلوب عمل صالح موجود نہیں۔ یہ ایک لازم وملزوم معاملہ ہے۔ اس لیے اگر ایک چیز موجود ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ دوسری چیز موجود نہیں ہے۔

11 بجے جامعہ الامام ابن تیمیہ کے ہال میں طلبہ واساتذہ کو خطاب کیا۔ وسیع ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ قرب وجوار کے لوگ بھی کافی تعداد میں شریک تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں دو چیزوں کی اہمیت بتائی۔

ایک علم اور دوسری دعا۔ علم کے ذریعہ آدمی صاحب شعور بنتا ہے اور دعا کے ذریعہ وہ اس برتر طاقت کی نصرت حاصل کرتا ہے جو اس کو ہر جگہ کامیاب کرنے والی ہے۔

میں نے کہا کہ امام ابن تیمیہ سے میں نے ذاتی طور پر یہ دونوں چیزیں سیکھی ہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب قرآن کی کسی آیت کے سلسلے میں ان کو اشکال پیش آتا تو وہ تنہائی

میں چلے جاتے اور وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھتے اور سجدہ میں سر رکھ کر کہتے: يَا مُعَلِّمَ إِبْرَاهِيمَ عَلِّمْنِي (إعلام الموقعين، جلد4، صفحہ 198)۔ یعنی، اے ابراہیم کے معلم، مجھے بھی علم دے دے۔ یہ دعا کوئی سادہ دعا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کا قاری (مطالعہ کرنے والا) اس کے مصنف سے ہر لمحہ کنسلٹ (consult) کرسکتا ہے، خواہ یہ قاری کسی بھی مقام پر اور کسی بھی زمانے میں ہو۔ یہ ایک ایسی خوش قسمتی ہے جو قرآن کے قاری کے سوا کسی اور کتاب کے قاری کو حاصل نہیں۔ میں نے اللہ کے فضل سے ابن تیمیہ کے اس طریقہ کو اپنا مستقل طریقہ بنالیا۔ اس سے مجھے غیر معمولی فائدے حاصل ہوئے۔ پھر میں نے کہا کہ ابن تیمیہ کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر قسم کی چیزیں کثرت سے پڑھتے تھے۔ چنانچہ ان کی کتابیں معلومات کا خزانہ بن گئیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اللہ کی توفیق سے ایسا ہی کیا۔ میں نے اپنی تقریباً پوری زندگی مختلف قسم کے علوم کے مطالعہ میں گزار دی۔ یہ مطالعہ میرے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ اگر آپ کا مطالعہ محدود ہوتو آپ مسائل کی پوری نوعیت کو نہیں سمجھ سکتے اور نہ اس کا گہرا تجزیہ کرسکتے ہیں۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ مطالعہ کو زیادہ سے زیادہ بڑھائیں نیز یہ کہ ہر قسم کی چیزیں پڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علم کے بغیر انسان کی شخصیت ادھوری رہتی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ جس تحمل اور ایڈجسٹمنٹ کی تلقین کرتے ہیں وہ ہر آدمی اپنی ذاتی زندگی میں اپنائے ہوئے ہے۔ مگر جب آپ اس طریق عمل کو ملی زندگی میں اختیار کرنے کے لیے کہتے ہیں تو یہی لوگ آپ کی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ جس حکمت کو وہ اپنی ذاتی زندگی میں جانتے ہیں، کیا وجہ ہے کہ ملی زندگی کے معاملات میں وہ اس سے بے خبر ہیں۔

میں نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ذاتی معاملات میں وہ اپنی جبلت (instinct) کے تحت عمل کرتے ہیں۔ لیکن ملی زندگی میں معاملہ شعور کا ہوجاتا ہے جہاں ان کو اپنے شعور کے تحت بالقصد کام کرنا ہے۔ مگر مسلم سماج اور مسلم اداروں نے ان کے اندر یہ شعور زندہ نہیں کیا۔

اس لیے وہ اس کو اجنبی سمجھ کر رد کر دیتے ہیں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ اس معاملے میں ان کے شعور کو جگائیں۔ شعوری بیداری کے بعد اپنے آپ ان کا یہ تضاد ختم ہو جائے گا۔

مولانا عبدالرحیم امدادی صاحب نے اس علاقہ میں مسلسل دورہ کرکے یہاں الرسالہ مشن کا ماحول بنایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس وسائل کے نام سے کوئی چیز نہ تھی۔ اس کے باوجود میں دیوانہ وار الرسالہ کے لیے گھومتا رہا۔ نہ صرف بھوک پیاس کو بلکہ ہر قسم کی تکلیفوں کو مجھے سہنا پڑا۔ آخر کار ایک وقت آیا جب کہ میرے لیے دروازے کھل گئے اور پورے علاقہ میں ساتھیوں اور مددگاروں کی ایک فوج مجھے حاصل ہوگئی۔ اپنا تجربہ بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دین کے کام میں اللہ کی مدد ضرور آتی ہے۔ مگر وہ اس وقت آتی ہے جب کہ آدمی کے اوپر سو میں سے ننانوے مرحلے گزر چکے ہوں۔ اللہ کی مدد سویں مرحلے پر آتی ہے، اس سے پہلے نہیں۔

3 نومبر کی صبح کو ہم لوگ ڈاکٹر اے رحمٰن ماڈل اکیڈمی دیکھنے کے لیے گئے۔ مسٹر سہیل اختر اس کے پرنسپل ہیں۔ وسیع اور شاداب کیمپس میں ایک خوبصورت زیر تعمیر مسجد ابھر رہی ہے۔ جو میرے جیسے آدمی کے لیے خاص طور پر جاذب نظر ہے۔ اس رحمن اکیڈمی ''اسکول'' کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ یہاں ہندو مسلم کی کوئی تفریق نہیں۔ یہاں مسلم بچوں کے ساتھ ہندو بچے بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس اسکول میں اردو زبان لازمی ہے اور ہندو بچے بھی شوق کے ساتھ اردو پڑھتے ہیں۔ ان کے والدین اس پر نہایت خوش ہیں۔ یہاں پڑھنے والے ہندو بچوں کی تعداد اس وقت تقریباً پچاس ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا یہ تعلیمی ادارہ وہ کام کر رہا ہے جو قومی یکجہتی (نیشنل انٹگریشن) کے معاملے میں بہت اہم ہے۔ یعنی مشترک زبان۔ جس ملک کی قومی زبان ایک ہو وہاں قومی یکجہتی اپنے آپ قائم ہو جاتی ہے۔ جیسے جاپان۔ جاپانیوں کی زبان ایک ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جاپان میں کسی مزید کوشش کے بغیر قومی یکجہتی اپنے آپ قائم ہے۔

محمد ثناء اللہ ندوی شریک سفر تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے الرسالہ کی تحریریں پڑھی ہیں اور اب صاحب الرسالہ کے ساتھ سفر میں نکلے ہیں، اس بارے میں اپنا تاثر بتائیے۔ ان کا جواب ان الفاظ میں تھا "میں نے بہت سارے مصنفین کی کتابیں پڑھی ہیں، لیکن مولانا وحید الدین کی تصانیف، ان کا الرسالہ بالخصوص ان کی چند روزہ صحبت نے میرے اندرون، میں میری فکر میں اور میرے جذبہ دعوت میں انقلاب پیدا کردیا۔ میں مولانا کو اس دور کا عظیم مفکر، حقیقی داعی، خادم قوم وملت مانتا ہوں اور ان کے مشن سے مکمل اتفاق رکھتا ہوں"۔

آزادی سے پہلے کے ہندستان میں یہ عام رواج تھا کہ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں ہندو نوجوان بھی پڑھا کرتے تھے۔ یہ روایت اب بھی بہار میں کسی قدر باقی ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ مثال ٹائمس آف انڈیا کے پٹنہ ایڈیشن (9 ستمبر 2000) میں شائع ہوئی ہے۔ یہ واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ ٹائمس آف انڈیا کے نئی دہلی ایڈیشن (12 ستمبر 2000) میں چھپا ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بہار کے ضلع گوپال گنج (گھیتا پور) میں ایک مسلم مدرسہ قائم ہے جس میں 400 طلبہ تعلیم حاصل کررہے ہیں ان میں سے 70 ہندو طلبہ ہیں۔ ایک سابق ہندو ایم ایل اے نے بھی اپنے بچے کو اس مدرسے میں داخل کرایا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا کی یہ رپورٹ اگلے صفحہ پر نقل کی جارہی ہے۔

HINDUS STUDYING IN MADRASA

PATNA: There were a few lessons the Maulana still had to learn. On an annual visit to a local madrasa in the backwaters of Bihar, the Maulana from UP was surprised to see two Hindu boys, aged three and five, attired in a topi, reading Urdu prescribed for the students of the minority community. "When he learnt their names, he wanted to meet me," exults their grandfather Vidya Bhusan Singh.

A strange lesson for the Maulana, yes. But for Singh, there seems to be nothing amiss in his decision. The ex-MLA has been sending his two grandsons to the local Madrasa instead

of the village primary school in Gopalganj district for a long time now.

Initially, there was a hue and cry in the Rajput community from which he hails in Meera Tola-Khetapur village of Gopalganj's Baikunthpur block. "We had to face relentless taunts from the villagers. They even said we were converting to Islam," the ex-MLA who is currently general secretary of the state Samajwadi Party told The Times of India.

But that was then. Today, Singh's experiments have borne fruit and there has been a sea change in the attitude of the villagers. "Today, about 70 children belonging to the Hindu community study in the same madrasa which has a total strength of about 400. The head Maulvi did not object to Hindu children 'studying in the madrasa," he said.

But why did he send his grandsons to the madrasa for primary education? Only because the village government primary school was virtually defunct, Singh pointed out. "The primary school has two teachers. Each draws a fat salary of over Rs 10,000 per month. But the two are always absent. On the other hand, the madrasa is efficiently run by the head maulvi and his two assistants."

Singh does not think that sending his grandsons to the madrasa intrudes on his religion. "On the contrary, they will have a better perception of their own and other's religion," he stressed pointing out that the madrasa in his village must be the only one in the state in which so many Hindu children study.

Interestingly, this has been a learning experience for the grandfather too. "I have tried to learn the Urdu script from my grandsons since I was never able to learn the language," he said.

(Reported by Dipak Mishra, *The Times of India*, New Delhi, September 12, 2000)

جناب مولانا محمد مطلوب (گیا) اور محمد اکرام الدین صاحبان اس سفر میں ہمارے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا کہ جب ہم کو الرسالہ نہیں ملا تھا تو ہمارا حال یہ تھا کہ ہمارے سینے میں دوسروں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکتی رہتی تھی۔ میرے غصہ کا حال یہ تھا کہ اگر کوئی مجھے ایک گالی دے تو میں اسے دس گالی دوں اگر کوئی مجھے ایک ڈنڈا مارے تو میں اس کو دس ڈنڈے ماروں۔ اسی کو میں اپنے لیے کمال سمجھتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہی بہادری ہے اور ایسا نہ کرنا بزدلی ہے۔ مگر الرسالہ کے مطالعے سے میرے سینے میں حسد وانتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ بجھ گئی۔ مجھے یہ تجربہ ہوا کہ زندگی دوسروں سے محبت کرنے کا نام ہے، نہ کہ ان سے نفرت کرنے کا نام۔ 3 نومبر کو ہم لوگ مدرسہ حسینیہ بیلواڑہ پہنچے۔ یہاں لوگوں سے ملاقات ہوئی یہ مدرسہ اس علاقے میں تعلیم پھیلانے کا کام کر رہا ہے۔ مدرسہ کے پر امن تعلیمی ماحول کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ تعلیم ہی احیاء ملت کے کام کا آغاز ہے۔ جب تک تعلیم لوگوں کے اندر عام نہ ہو جائے دوسرا کوئی بھی کام نہیں کیا جا سکتا۔ قوم کو تعلیم یافتہ بنائے بغیر دوسرے دوسرے ایشو پر لوگوں کو اٹھانے کی کوشش کرنا صرف شخصی مقبولیت کا ذریعہ ہے، وہ ملت کی تعمیر کا ذریعہ نہیں۔

جناب عبد المجید صاحب (70 سال) بتیا کی ایک خاص شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کئی واقعات بتائے۔ 1942 میں وہ ندوہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ جب کوئٹ انڈیا کی تحریک شروع ہوئی تو پر جوش لوگوں نے ریل کی پٹریاں اکھاڑ دیں۔ ٹرینوں کی آمد ورفت رک گئی۔ انہوں نے بتایا کہ میں اور چند دوسرے طلباء لکھنؤ سے پیدل چل کر بتیا پہنچے، اس سفر میں تقریباً ایک ماہ لگ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ سفر کے دوران جس گاؤں میں بھی ہم لوگ پہنچے وہاں ہم لوگ عزت کے ساتھ ٹھہرائے گئے۔ وہ لوگ کھانے پینے کا انتظام کرتے اور کئی کئی دن تک روکتے۔ اسی بنا پر یہ سفر اتنا لمبا ہو گیا۔

3 نومبر کو جمعہ کا دن تھا۔ بتیا کی جنگی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ وسیع مسجد مکمل طور پر

بھری ہوئی تھی۔ یہاں جمعہ سے پہلے آدھ گھنٹہ کا خطاب کیا۔ اس خطاب کے لیے میں نے ایک حدیث کا انتخاب کیا۔ وہ یہ کہ: الْمَسَاجِدُ بُيُوتُ الْمُتَّقِينَ (مصنف ابن ابی شیبۃ، حدیث نمبر 34610)۔یعنی، مسجدیں متقیوں کا گھر ہیں۔ میں نے بتایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد تقوی کی تربیت کا مرکز ہے۔ مسجد کے اعمال ان صفات کو پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہیں۔ اذان سے لے کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک، اور باجماعت نماز کی ادائیگی تک نماز کا ہر جزء متقیانہ زندگی کی تیاری ہے۔ نماز جمعہ کے بعد مولانا علی احمد ندوی (82 سال) کی رہائش گاہ پر ہم لوگ اکٹھا ہوئے۔ دوپہر کا کھانا یہیں کھایا گیا۔

مولانا علی احمد ندوی 1939 دار العلوم ندوۃ العلما میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے قدیم ندوہ کو دیکھا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ 1939ء کے ندوہ اور آج کے ندوہ میں کیا فرق ہے۔ انہوں نے کہا کہ پہلے ندوہ میں تقریباً 500 طلباء کی تعداد ہوتی تھی۔ عمارتیں بھی بہت کم تھیں۔ لیکن اب میں جب ندوہ گیا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہاں بہت زیادہ ترقی ہو چکی ہے۔ اب طلباء کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہے۔ کثرت سے عمارتیں بن گئی ہیں۔ بہت سے نئے نئے شعبے کھل گئے ہیں، جو شاندار عمارتوں میں قائم ہیں۔ قدیم ندوہ کے مقابلے میں آج ندوہ کم از کم دس گنا زیادہ ترقی کر چکا ہے۔

میں نے سوچا کہ 1947 کے بعد مسلمانوں کے تمام لکھنے والے اور بولنے والے ایک ہی پیغام مسلمانوں کو دے رہے تھے۔ اور وہ یہ کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لیے دوسرا اسپین بنایا جارہا ہے۔ یہاں ان کی شناخت مٹائی جارہی ہے، وغیرہ۔ مگر عملاً صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے اس وقت کے لیڈروں نے مسلمانوں کو یہ خبر دی تھی کہ غیر منقسم ہندستان میں ان کا کوئی مستقبل نہ ہوگا۔ لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ تقسیم کے باوجود ہندستان کے مسلمان تقریباً ہر اعتبار سے پاکستان سے زیادہ بہتر ہیں حتی کہ مسجد اور مدرسہ کے اعتبار سے بھی۔

فجر کی نماز درگاہ محلہ کی مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد لوگوں نے درس کے لیے کہا۔ امام صاحب نے نماز میں یہ آیت پڑھی تھی: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (59:18)۔ یعنی، اے ایمان والو اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا بھیجا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ باخبر ہے اس سے جو تم کرتے ہو۔

میں نے اس آیت کو لے ایک تربیتی تقریر کی۔ میں نے کہا کہ اللہ نے اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ وہ کل کے لیے کیا بھیج رہا ہے۔ لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ مسجد میں تو اس آیت کو سنتے ہیں لیکن باہر جا کر برعکس طور پر اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ اپنے آج کے لیے میں کیا کماؤں۔ یعنی ساری فکر اس بات کی ہوجاتی ہے کہ آج میں کیا حاصل کروں۔ میں نے کہا کہ لوگ نماز تو پڑھتے ہیں مگر اس سے اپنے لیے ہدایت نہیں لیتے۔ وہ مسجد والے اعمال تو کرتے ہیں مگر وہ مسجد والے اسباق نہیں لیتے۔ میں نے کہا کہ یاد رکھیے اصل اہمیت مسجد والے اعمال کی نہیں بلکہ مسجد والے اسباق کی ہے۔

4 نومبر کی صبح کو مدرسہ اسلامیہ بتیا کا معاینہ کیا۔ اس مدرسہ کی بنیاد 1894 میں رکھی گئی۔ یہ ایک تاریخی مدرسہ ہے۔ اس مدرسہ کے ذمہ دار پروفیسر ناظم صاحب ہیں۔ یہاں دارالافتاء ودارالقضاء بھی قائم ہے۔ یہاں طلبہ واساتذہ کے سامنے ایک مختصر تقریر کی۔ میں نے کہا کہ پچھلے دوسو سال کے درمیان مسلمانوں نے بہت سے کام شروع کیے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ ختم ہوتے رہے۔ لیکن مدرسہ کا کام غالباً واحد کام ہے جو قابل بقا (sustainable) ثابت ہوا۔ ایک حدیث ہے کہ: أَفْضَلَ الْأَعْمَالِ أَدْوَمُهَا (صحیح ابن خزیمۃ، حدیث نمبر 1277)۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مداومت میں کوئی پراسرار صفت ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے جو کام شروع کرنے کے بعد مسلسل کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ تائیدی عوامل شامل ہوتے رہے ہیں جو اس کو تقویت دے کر آگے بڑھاتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔

4 نومبر کی دوپہر کو ہم لوگ مدرسہ جامعہ اسلامیہ قرآنیہ (سمرا) گئے۔ اس مدرسہ کا قیام 1818ء میں ہوا۔ اس کے بانی مولانا احسان اللہ ومولانا جعفر علی صاحب ہیں۔ یہ مدرسہ پہلے بوڑی گنڈگ ندی کے کنارے پر واقع تھا۔ وہاں وہ سیلاب کے دوران 1962 میں دریائی کٹاؤ کی نذر ہو گیا۔ اس وقت کا مدرسہ موجودہ مدرسہ سے چھوٹا تھا۔ لیکن پھر دو سال بعد 1964 میں زیادہ بڑے اور وسیع مدرسہ کی صورت میں قائم ہو گیا۔ یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ دنیا میں ناکامی کوئی چیز نہیں۔ عین ممکن ہے، پہلی بار ناکام ہونے کے بعد آدمی دوسری بار پہلے سے بھی زیادہ بڑی کامیابی حاصل کر لے۔ اس مدرسے میں طلبہ واساتذہ کا ایک جلسہ ہوا جس میں میں نے مختصر خطاب کیا۔ جلسہ کو شروع کرتے ہوئے عزیز الرحمن صاحب نے یہ شعر پڑھا:

فکر عقبیٰ نہ خوف خدا ہے کیسا نادان وہ آدمی ہے
کام کرتا ہے دوزخ کا لیکن سوچتا ہے کہ جنت ملے گی

4 نومبر کو ساڑھے بارہ بجے مدرسہ جامعہ اسلامیہ (سمرا) سے ہم لوگ دوبارہ بتیا کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں اپنے ساتھیوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ دنیا میں کام کرنے کے لیے صرف اخلاص کافی نہیں، اسی کے ساتھ لازمی طور پر ڈسپلن بھی ضروری ہے۔ کوئی آدمی بالفرض اخلاص کا پہاڑ ہو لیکن اگر اس کے اندر ڈسپلن نہ ہو تو وہ کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا۔ اخلاص اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی آخرت کی ناکامی سے محفوظ رہے۔ مگر موجودہ دنیا اسباب کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہاں اپنے عمل کو کامیاب بنانے کے لیے ڈسپلن ضروری ہے۔ ڈسپلن سے مراد منظم عمل ہے، اور منظم عمل کسی بھی بڑے کام کے لیے لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

4 نومبر کی رات کو نماز عشاء کے بعد مدرسہ تعلیم القرآن سبیا دیوراج کے وسیع میدان میں عمومی جلسہ ہوا۔ اس جلسہ میں مدرسہ کے طلباء اور اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں اطراف کے لوگ شریک ہوئے۔ یہاں میری تقریر کا موضوع دعوت تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں چند باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ دعوت دوسرے کے درد کو اپنے سینہ میں محسوس کرنے کا نام ہے۔ دردمند دل ہی دعوت کا کام کرسکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ دعوت کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا ہو، تعصب ونفرت کا ماحول نہ ہو۔ اس قسم کے ماحول کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مدعو جو بات سنتا ہے اس پر وہ ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے۔ کوئی منفی احساس اس کی سوچ کے عمل میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانے میں ہمیں دو قسم کے کام کرنے ہیں، ایک طرف مسلمانوں کی اصلاح اور دوسری طرف غیر مسلموں میں دین کی اشاعت۔ یہ دونوں ہی کام یکساں طور پر اہم ہیں۔ ضرورت ہے کہ تقسیم کار کے اصول پر دونوں کام کو مؤثر انداز میں انجام دیا جائے۔

5 نومبر کی صبح کو مدرسہ تعلیم القرآن کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھی گئی۔ پوری مسجد بھری ہوئی تھی۔ پروگرام میں شرکت کے لیے باہر کے لوگ بھی آئے تھے۔ مثلاً فجر کی نماز کے بعد حافظ ممتاز عالم سے ملاقات ہوئی انہوں نے کہا کہ میں کھیرٹیا کا رہنے والا ہوں۔ بیس کلو میٹر سفر کر کے صرف آپ کی بات سننے آیا ہوں۔

نماز فجر کے بعد مجھ سے درس کے لیے کہا گیا۔ تقریبا آدھ گھنٹہ تک میں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں تذکیری انداز کا خطاب کیا۔ ایک آیت اور ایک حدیث بیان کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اسلام نہ تو کوئی پراسرار دین ہے اور نہ کوئی رسمی اور نسلی دین۔ اسلام اللہ کی ایک نعمت ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے کھولی ہے۔ حقیقی معنوں میں مومن و مسلم وہ ہے جو اسلام کو ایک ایسی عظیم نعمت کے طور پر پائے جس سے اس کی روح سرشار ہوگئی ہو۔

جناب مولانا محمد بدرالحق قاسمی (45 سال) صدر مدرس تعلیم القرآن سے سبیا میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے الرسالہ کے سلسلے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا "الرسالہ پڑھ کر مجھے ایک شعوری زندگی گزارنے کا احساس ہوا۔ اس لیے کہ شعور ہی کے ذریعہ انسان اپنے کمال تک پہنچتا ہے۔

5 نومبر کی صبح کو مدرسہ تعلیم القرآن سبیا، دیوراج کو دیکھا۔ یہاں مدرسہ کے طلبا اور اساتذہ پر مشتمل ایک اجتماع ہوا۔ بچے زیادہ تر چھوٹی عمر کے تھے۔ جب میں نے ان چھوٹے بچوں کو دیکھا تو مجھے ستر سال پہلے 1930 کا اپنا زمانہ یاد آیا۔ اس وقت میں اسی طرح ایک بچے کی

صورت میں اپنے گاؤں کے مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کران کی تعلیم کے لیے مدرسہ چلانا کتنا بڑا کام ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر بہت چھوٹا کام نظر آتا ہے۔

ان چھوٹے بچوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ یہ ان کے بڑے ہیں جن کو ان کے مستقبل کے بارے میں سوچنا اور فیصلہ کرنا ہے۔ بچوں کا بے خبری کی عمر میں ہونا باخبری کی عمر والے بڑوں کی ذمہ داری میں بے پناہ اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ بچے خود اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ نہیں سکتے۔ یہ ان کے بڑوں کے لیے دوہرا کام ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچیں اور بچوں کے مستقبل کے بارے میں بھی۔

مدرسہ کا پروگرام شروع ہوا تو پہلے قرآن کی تلاوت کی گئی۔ ایک طالب علم نے قرآن کا ایک رکوع پڑھا۔ مدرسہ تعلیم القرآن میں تقریر کے بعد ایک صاحب کھڑے ہوئے۔ وہ انگریزی اخبار میں شائع شدہ ایک مضمون لیے ہوئے تھے جس میں کسی انتہا پسند ہندو نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کو ہندستان میں سکنڈ کلاس سٹیزن بن کر رہنا ہوگا ورنہ ان کی حالت اس ملک میں درست نہیں ہوسکتی۔

5 نومبر کی رات کو جامعہ ہارونیہ یتیم خانہ (بگہا) میں ایک تقریر ہوئی۔ اس تقریر میں میں نے اسلام کی اخلاقی اور سماجی تعلیمات بیان کیں اور بتایا کہ اسلام امن اور محبت اور خیر خواہی کا مذہب ہے۔ وہ نفرت وتشدد کا مذہب نہیں۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب خانقاہ خیر آباد (بگہا) مدرسہ شمس العلوم کے پرنسپل ہیں۔ خانقاہ خیر آباد کے نائب سجادہ نشین مولانا فضل الرحمن ہارونی ہیں۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب نے کہا کہ میرے والد مولانا ہارون نقشبندی کہا کرتے تھے کہ جو شخص اپنا کام کسی کی برائی سے شروع کرتا ہے تو اس میں شر چھپا ہوا ہوتا ہے اور جو شخص اپنا کام کسی کی خیر سے شروع کرتا ہے تو اس میں خیر کا پہلو ہوتا ہے۔ مزید وہ فرماتے تھے کہ تم اپنے آپ کو ایک پھلدار درخت کی طرح بناؤ۔ جب کوئی اس پر پتھر پھینکتا ہے تو چوٹ کھا کر کے بھی وہ اس کو پھل دیتا ہے۔ تم اگر کسی کو ایک پھل نہ دے سکو تو اس کو دعا ہی دے دو۔

خانقاہ ہارونیہ خیرآباد کے آس پاس ہر مذہب کے لوگ آباد ہیں۔ یہاں عیسائی بھی ہیں، ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ مگر سب کے سب امن و محبت کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس علاقے میں زیادہ تر ہندو لوگ ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے مگر اس علاقے کی اخلاقی قیادت مولانا حفظ الرحمن ہارونی کو حاصل ہے۔

مولانا محمد ثناء اللہ ندوی جو پورے سفر میں میرے ساتھ رہے ان سے میں نے پوچھا کہ پہلے آپ نے صرف تحریروں کو پڑھا تھا، اب آپ نے میرے روز وشب کو دیکھا اور براہ راست طور پر میری زبان سے میری باتوں کو سننے، پڑھنے اور دیکھنے میں آپ نے کیا فرق پایا۔

انہوں نے جو تاثر بیان کیا اس کے الفاظ یہ تھے۔ ''میں نے آپ کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ ان کتابوں میں جو پیغام ہے، انسانیت کی فلاح کے لیے جو درد جھلکتا ہے، اپنے وطن اور اہل وطن کے لیے جو محبت ہے، آپس میں اتحاد و اتفاق کا جو سندیش ہے، ان تمام چیزوں کا مکمل عملی نمونہ میں نے آپ میں پایا۔ اخلاق وعمدہ برتاؤ کا حقیقی روپ آپ کے اندر دیکھنے کو ملا۔ اخلاص کو انتہائی حد تک موجود پایا۔ وقت کی پابندی، اپنے ہم سفر ساتھیوں کی سہولت کا خیال، ہر ایک کے لیے خیر خواہی کا جذبہ، مخلوقات خدا سے بے حد محبت، مناظر فطرت کے شیدائی، علم دوست، انسانیت کے خیر خواہ، احکامات خداوندی کے بہت پابند، سنت رسول پر زندگی گزارنے والا، صبر وشکر کا حقیقی پیکر، انسانوں میں گھل مل کر رہنا، ہر آدمی سے قریب ہونے اور ہر ایک کو قریب رکھنے کی خصلت، قول وعمل میں مکمل مطابقت رکھنے والا پایا۔ الغرض ظاہر و باطن میں قول وعمل میں پورے سفر کے اندر زندگی کے کسی گوشے میں فرق اور تضاد نہیں پایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک مومن کی جو صفات ہیں ان کو آپ کے اندر بدرجہ اتم دیکھا''۔

مولانا عبدالرحیم امدادی (46 سال) عجیب وغریب شخصیت کے آدمی ہیں۔ مادیات سے بے پرواہ، بے غرضی کی زندہ تصویر، اپنے حلیہ کے اعتبار سے قلندر، اپنے مزاج کی بنا پر میں اکثر ان کو سخت وسست کہہ دیتا تھا مگر وہ ہمیشہ مخلصانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا جواب

دیتے تھے۔ ایک مجلس میں ان کے بارے میں اپنا تاثر بتاتے ہوئے میں نے کہا کہ میرے تجربے کے مطابق وہ اس حدیث کی ایک زندہ تصویر ہیں۔ جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رُبَّ أَشْعَثَ، مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2622)۔ یعنی، بہت سے بکھرے بال والے، گرد آلود اور جسے لوگ دروازوں سے لوٹا دیتے ہیں، اگر وہ اللہ پر قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم کو پوری کرے گا۔

6 نومبر کو ہم لوگ بگہا سے نرکٹیا گنج جا رہے تھے۔ پورا سفر سرسبز درختوں کے ماحول میں گزر رہا تھا۔ لیکن سڑک اتنی زیادہ خراب تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کار پر سفر نہیں کر رہے ہیں بلکہ ٹریکٹر پر سفر کر رہے ہیں۔ خراب سڑک اچھی کار کو ٹریکٹر جیسا بنا دیتی ہے۔ یہ دنیا کا نظام ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ حضرت، میرے لیے دعا کر دیجیے۔ میں ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ اس کتاب کا نام ہوگا: امت مسلمہ نے قائدین کو کیا دیا۔ میں نے کہا کہ یہ تو ادھوری کتاب ہے۔ آپ کو یہ بھی لکھنا چاہیے کہ قائدین نے امت مسلمہ کو کیا دیا۔ پھر میں نے کہا کہ میرے مطالعہ کے مطابق قائدین نے امت مسلمہ کو بے شعوری دی، اور امت مسلمہ نے قائدین کو بھیڑ لوٹائی۔ میں نے جب یہ بات کہی تو مولانا عبد الرحیم امدادی نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ نے تو خود ہی دینی مدارس الرسالہ ستمبر 2000 میں کہا کہ علما ہند نے مدارس کی صورت میں بہت بڑا کام کیا ہے، پھر کیا آپ کی ان دونوں باتوں میں تضاد نہیں۔

میں نے کہا کہ میں نے اس وقت جو بات کہی اس کا تعلق سیاسی قائدین سے ہے۔ مدارس کا کام بلاشبہ ایک عظیم کام ہے۔ مگر وہ تمام تر غیر سیاسی علما نے انجام دیا ہے۔

مولانا حافظ محمد ممتاز عالم مفتاحی سے نرکٹیا گنج میں ملاقات ہوئی۔ وہ الرسالہ کے قاری ہیں۔ ان سے میں نے ان کا تاثر پوچھا تو انھوں نے کہا کہ میں اس کو اتنا مفید سمجھتا ہوں کہ میں چاہتا ہوں کہ سارے ہی لوگ اس رسالے کو پڑھیں۔ انھوں نے بتایا کہ الرسالہ کا شمارہ 2000 ”دینی مدارس“ کو پڑھ کر میں اتنا متاثر ہوا کہ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے بھی ایک مدرسہ

چلانا ہے۔ میرے اقتصادی حالات زیادہ اچھے نہیں ہیں پھر بھی میں نے اپنی جیب سے ایک رقم نکالی اور ایک مدرسہ ابتدائی طور پر شروع کر دیا۔ میرا یقین ہے کہ ان شاء اللہ یہ ایک کامیاب تعلیمی ادارہ بن کر رہے گا۔ میں جس گاؤں میں رہتا ہوں وہاں بہت کم پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ الرسالہ کو اتنا آگے بڑھاؤں کہ وہ پوری قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کا ذریعہ بن جائے۔ ان کے گاؤں کا نام کھیرٹیا بوریا (مغربی چمپارن) ہے۔

نرکٹیا گنج اور بتیا کے راستے میں ایک معاملہ پیش آیا۔ اس کے بعد میں نے مولانا عبد الرحیم امدادی سے کہا کہ آپ لوگ صرف ایک کام جانتے ہیں۔ کوئی عالم مل جائے تو اس کا سر اور پاؤں دبانا، اس کے لیے وضو کے لیے پانی رکھنا، جب وہ وضو کرے تو اس کے پیچھے تولیہ لے کر کھڑے رہنا، جب وہ بات کرے تو تسبیح لے کر اس کے دانہ پر انگلیاں پھراتے رہنا، وہ اٹھے تو اس کا ہاتھ پکڑ لینا، جانے لگے تو جلدی سے اس کا جوتا سیدھا کرنا، اور یہ سب کر کے صرف یہ کہنا کہ حضرت میرے لیے دعا کیجیے اور پھر مطمئن ہو جانا کہ حضرت کی برکت سے دنیا و آخرت کے تمام معاملات درست ہو گئے۔

میں نے کہا کہ ہمارا مشن اس سے بالکل مختلف ہے۔ پوری امت ایک ایسے نقشہ کار کی عادی ہو گئی ہے جس میں سوچنے کے عمل کا کوئی خانہ ہی نہیں ہے یہ پورا عمل برکت کے تصور پر قائم ہے، نہ کہ شعور پر۔ ہمیں اس نقشے کو بدلنا ہے، ہمارا مشن امت کو باشعور بنانا ہے، نہ کہ برکت کی پراسرار گولیاں تقسیم کرنا۔

قاری محمد ظفیر عالم صاحب (45 سال) بھی اس سفر میں ہم لوگوں کے ساتھ تھے وہ نیپال میں پورنیا کے قریب رہتے ہیں۔ یہاں مدرسہ حسینیہ ہے جو 1913 میں قائم کیا گیا۔ قاری محمد ظفیر عالم اس کے صدر مدرس ہیں۔ اس مدرسہ میں چار سو طلباء ہیں۔ اساتذہ کی تعداد دس ہے۔ اس مدرسہ کی اپنی عمارت ہے۔ اس کے احاطہ میں ایک باقاعدہ مسجد بھی ہے۔ یہ اس علاقہ کا سب سے بڑا مدرسہ ہے۔ اور اسی طرح ترائی کے علاقہ میں ایک اور بہت بڑا مدرسہ محمودیہ راجپور گٹو، نیپال ہے جو ندوۃ العلما کی شاخ ہے۔

وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انہوں نے اپنے تاثرات بتاتے ہوئے کہا: الرسالہ میں دین اور دنیا کی حکمت بتائی جاتی ہے۔ الرسالہ کا پیغام یہ ہے کہ تھوڑا نقصان برداشت کرلو تاکہ تم زیادہ فائدہ حاصل کرسکو۔ انہوں نے کہا کہ خوش اخلاقی ایک طاقت ہے، آدمی کے اندر اگر خوش اخلاقی ہو تو وہ اس کے ذریعہ بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہے۔

واپسی میں پٹنہ میں چند گھنٹہ قیام کے بعد ریلوے اسٹیشن کے لیے روانگی ہوئی۔ پٹنہ سے مجھے راجدھانی اکسپریس کے ذریعہ دہلی آنا تھا۔ ٹرین ٹھیک وقت پر پٹنہ سے دہلی کے لیے روانہ ہوئی اور ٹھیک وقت پر پہنچ گئی۔ یہ پورا سفر رات میں طے ہوا۔ بیشتر وقت سوتے ہوئے گزرا۔ 7 نومبر کی صبح کو میں دہلی واپس آ گیا۔ (الرسالہ، مارچ 2001)

انتم گیت

ٹیگور نے کہا تھا کہ ساری عمر باجے کے تاروں کو درست کرنے میں بیت گئی، اور میں انتم گیت نہ گا سکا۔

The song that I came to sing remains unsung to this day. (Gitanjali, Ch. 13)

میرا نشانہ انتم گیت نہ تھا بلکہ جنت تھا۔ میں کہوں گا کہ ساری عمر جنت کے شوق میں بیت گئی اور میں جنت کی اہلیت کا ثبوت نہ دے سکا۔ اب 75 سال کی عمر کو پہنچ کر میں اپنی عمر کے آخری مرحلہ میں ہوں۔ بہت جلد میں اپنے آپ کو اگلی دنیا میں پاؤں گا۔ اہلیت کی بنا پر تو میں جنت کا مستحق نہیں الّا یہ کہ اللہ اپنی رحمت خاص سے مجھے جنت میں داخلہ دے دے۔

(ڈائری، 31 دسمبر 1996)

ایک سفر

(مدرسہ مصباح العلوم آسنسول، مدرسہ باب العلوم، کلکتہ)

مئی 1985 کے چند دن مغربی بنگال میں گزرے۔ 2 مئی کی صبح کو میں آسنسول پہنچا۔ 4 مئی کی صبح کو کلکتہ گیا اور اسی دن شام کو دہلی واپس آیا۔

آسنسول مغربی بنگال کا دوسرا سب سے بڑا تجارتی شہر ہے۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی تقریباً 40 فی صد ہے۔ یہاں ان کے دو عربی مدرسے اور دو اسکول ہیں۔ کالج کے قیام کی کوشش ہو رہی ہے تعلیم میں پیچھے ہونے کے باوجود مسلمان عام طور پر خوش حال ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تعلقات اچھے ہیں۔ یہاں وہ فرقہ وارانہ تعصب نہیں پایا جاتا جو یوپی جیسے علاقوں کی خصوصیت ہے۔ ہندستان ایک ملک نہیں وہ کئی مختلف ملکوں کا مجموعہ ہے۔

آسنسول میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مسلمانوں کا نوجوان طبقہ تعمیری کاموں کی طرف متوجہ ہے۔ مسجد میں امام اور مؤذن کے معیار کو بہتر بنانا، مدرسے کو ترقی دینا، لائبریری قائم کرنا، قوم کے مختلف حلقوں کو جوڑنا، نوجوان نسل کو دینی اور تعمیری رخ پر ڈالنے کی کوشش کرنا۔ یہ مناظر یہاں کے قیام کے دوران واضح طور پر نظر آئے۔

مجھے یہاں مدرسہ مصباح العلوم کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے بلایا گیا تھا۔ مدرسہ کے سکریٹری جناب سمیع الدین صاحب نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ یہ مدرسہ 1912 میں قائم ہوا۔ اس میں مقامی طلبہ کے علاوہ بیرونی طلبہ تقریباً ایک سو زیر تعلیم ہیں۔ اس کا طریقہ تعلیم درس نظامیہ کے نصاب پر مبنی ہے۔ فی الحال اس مدرسہ میں عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم سے لے کر مشکوٰۃ تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ حفظ اور قرآت کی تعلیم کا بھی معقول انتظام ہے۔ اس کے تحت بارہ اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ مدرسہ میں ایک دارالافتاء بھی ہے۔ مدرسہ کا پرائمری سکشن حکومت بنگال سے منظور شدہ ہے۔ اس سیکشن میں طلبہ کی تعداد

250 ہے۔ شہر کے مختلف محلوں میں مدرسہ کی پانچ شاخیں قائم ہیں جن میں طلبہ کی تعداد عمومی طور پر 800 ہے۔

مدرسہ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر جو وسیع ڈائس تیار کیا گیا تھا اس میں ایک پرکشش چیز یہ دکھائی دی کہ ڈائس کے دونوں طرف الرسالہ کے صفحہ اول کے دو اقتباسات جلی حرفوں میں لکھ کر لگائے گئے تھے۔ یہ دونوں اقتباسات حسبِ ذیل تھے:

بلند مقام ہمیشہ اپنے آپ کو بلند کرنے سے ملتا ہے، نہ کہ نعرے اور جھنڈے کو بلند کرنے سے۔ (الرسالہ، اگست 1984)

دوسروں سے نہ لڑنے کے لیے اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔ (الرسالہ، اکتوبر 1983)

اس قسم کا کام یہاں نوجوانوں کی ایک ٹیم کر رہی ہے جو حال میں ابھری ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ یہاں کے نوجوانوں میں جو تعمیری رجحان ابھرا ہے، اس میں الرسالہ کا خاص دخل ہے۔ یہاں الرسالہ کے پڑھنے والے کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اکثر مقامات پر دینی پرچوں میں اب الرسالہ ہی سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ الرسالہ اب خدا کے فضل سے دور حاضر میں مسلمانوں کی حقیقی بیداری کی علامت بنتا جا رہا ہے۔

آسنسول میں قیام کے دوران بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس طرح کی ملاقاتوں میں اکثر لوگ مسائل عالم پر گفتگو کرتے ہیں۔ مگر میری ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ آدمی کے شخصی تجربات کو جانوں۔ کیونکہ شخصی تجربات میں حقیقی سبق ہوتا ہے جب کہ مسائل عالم کی بحثیں الفاظ کی بے فائدہ نمائش کے سوا اور کچھ نہیں۔

آسنسول کی ایک تقریر میں میں نے کہا کہ اس ملک کے مسلمانوں کی پسماندگی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے لیڈر انہیں رزرویشن کا سبق دیتے رہے۔ مگر یہ مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں اہلیت کا ثبوت دے کر کسی کو جگہ ملتی ہے۔ رزرویشن کی باتیں کرنا محض ایک قیادتی فریب ہے۔ کیوں کہ اس طرح کچھ لوگوں کو سستی قیادت تو مل سکتی ہے، مگر اس طرح اصل مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔

4 مئی کی صبح کو آسنسول سے کلکتہ گیا۔ کم وقت کی وجہ سے وہاں زیادہ پروگرام نہ رکھے جا سکے۔ تاہم اسلامیہ ہال میں ”اسلام اور عصر حاضر“ کے موضوع پر ایک خطاب ہوا۔ اخبار مشرق کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی اور مدرسہ باب العلوم کا معائنہ کیا، وغیرہ۔

مدرسہ باب العلوم تقریباً دس سال سے قائم ہے۔ مدرسہ کے بانی قاری محمد اسمٰعیل ظفر صاحب کے والد تھے۔ وہ ایک درویش صفت بزرگ تھے۔ وہ اینٹ کا تکیہ لگا کر سوتے تھے۔ کھانا اور کپڑا بے حد معمولی استعمال کرتے تھے۔ ان کے صاحبزادہ نے ایم اے کیا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی جدید ادارہ میں کام کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کے والد نے اصرار کیا کہ تم کو مدرسہ والا کام کرنا ہے۔ سعادت مند صاحبزادہ نے والد کی بات کے آگے سپر ڈال دیا اور مدرسہ کے کام میں لگ گئے۔

مدرسہ باب العلوم ایک غیر معروف مدرسہ ہے۔ کلکتہ کے موجودہ سفر سے پہلے مجھے مدرسہ کے بارے میں مطلق کوئی واقفیت نہ تھی اور نہ میں اس مدرسہ کے ذمہ داروں کے نام سے واقف تھا۔ مگر معائنہ کے دوران معلوم ہوا کہ ابتدائی سطح پر یہ ایک معیاری دینی مدرسہ ہے۔ ان کے پاس زیادہ بڑی جگہ نہیں۔ مگر عالم یہ ہے کہ اس وقت سات سو طلبہ کی درخواست داخلہ ”ویٹنگ لسٹ“ پر ہے۔ مگر جگہ کی کمی کے باعث وہ ان کو نہیں لے سکتے۔

اس تجربہ کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے تاریخ اسلام کے ایک سوال کا جواب پالیا ہے۔ اسلامی تاریخ کی کتابوں میں اس بات کی تفصیل نہیں ملتی کہ تاریخ اسلام کے بعض بہت بڑے بڑے واقعات کس طرح ظہور میں آئے مثلاً دورِ اول میں ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں اسلام کی اشاعت تاتاریوں کا مسلمان ہونا۔ کتابوں سے واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ واقعات کن لوگوں کے ذریعہ اور کس طرح وقوع میں آئے۔

ان واقعات کے غیر مذکور ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ غیر مشہور لوگوں کے ذریعہ انجام پائے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جو لوگ سیاسی انداز سے کام کرتے ہیں یا جن کا حکمرانوں سے ٹکراؤ پیش

آتا ہے وہ بہت جلد شہرت عام حاصل کر لیتے ہیں۔ اشاعت اسلام کے میدان میں کام کرنے والے یہ لوگ چونکہ سیاست وحکومت سے الگ تھے اس لیے وہ غیر مشہور رہ گئے اور اسی طرح ان کے کام کی تفصیلات بھی۔

اکثر زیادہ بڑا کام کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں، جو بظاہر دیکھنے والوں کو بہت چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔

آسنسول اور کلکتہ میں جو گفتگوئیں اور تقریریں ہوئیں۔ ان کا موضوع مشترک طور پر یہ تھا کہ دور جدید میں ہم کو ایک نئے چیلنج کا سامنا ہے۔ اس کا مقابلہ نہ روایتی وعظ سے کیا جا سکتا ہے اور نہ پر جوش خطابت سے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ایک طرف اسلام کو اس کی اصل حیثیت میں جانیں اور دوسری طرف عصر حاضر کو گہرائی کے ساتھ سمجھیں۔ دونوں کو بخوبی طور پر جاننے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ دور جدید میں اسلام کو اور مسلمانوں کو اٹھانے کی موثر جدوجہد کی جا سکے۔ 4 مئی 1985 کی شام کو انڈین ائیر لائنز کی فلائٹ کے ذریعے کلکتہ سے دہلی واپس پہنچ گیا۔ (الرسالہ، ستمبر 1985)

مزاج کا فرق

ہمارے مدرسوں میں جب استاد کوئی مضمون پڑھائے گا تو اپنی بات کہنے کے بعد وہ طلبہ سے کہے گا — کیا میری بات سمجھ میں آئی۔ کیا میری بات سمجھ گئے تم لوگ۔ لیکن، مغربی یونیورسٹیوں میں جب ایک پروفیسر لیکچر دیتا ہے تو اپنی بات کہنے کے بعد وہ طلبہ سے اس طرح نہیں پوچھتا۔ بلکہ خود اپنے اوپر لیتے ہوئے کہتا ہے کہ کیا میں اپنی بات واضح کر سکا

Am I clear?

یہ دو الگ الگ کلچر ہیں اور دونوں سے الگ الگ مزاج بنتا ہے۔ اوّل الذکر سے ذاتی برتری کا مزاج بنتا ہے اور ثانی الذکر سے تواضع اور ماڈسٹی کا مزاج۔ (ڈائری، 26 فروری 1996)

الجامعۃ الاسلامیۃ

(مدینہ منورہ)

29 فروری 1984 کی صبح کو میں دہلی کی مسجد کی اذان پر فجر کی نماز کے لیے اٹھا تھا۔ اگلے دن یکم مارچ کی صبح کو میں مدینہ منورہ کے موذن کی اذان پر فجر کی نماز کے لیے اٹھا اور مسجد نبوی کے امام کے پیچھے ''بین اقوامی جماعت'' میں شریک ہو کر فجر کی نماز ادا کی۔

ہزاروں کلومیٹر کا فاصلہ ''راتوں رات'' طے ہونے کا واقعہ بظاہر اتنا ہی عجیب ہے جتنا چودہ سو سال پہلے: سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلاً مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى (17:1)۔ پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک— کا واقعہ لوگوں کو عجیب معلوم ہوا تھا۔ مگر آج کا انسان چونکہ تیز رفتار کاروں اور ہوائی جہازوں کے زمانے میں ہے اس لیے ایسی خبر سن کر آدمی کے اوپر حیرانگی طاری نہیں ہوتی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ چودہ سو سال پہلے ''اسراء'' کا واقعہ بھی اتنا ہی غیر عجیب تھا جتنا موجودہ زمانے کا واقعہ۔ آج کا ''اسراء'' جس نظام اسباب کے تحت ہوتا ہے وہ چونکہ انسان کے سامنے کھلا ہوا ہے اس لیے اس پر انسان کو حیرانی نہیں ہوتی۔ مگر چودہ سو سال پہلے کا ''اسراء'' جس نظام اسباب کے تحت ہوا تھا وہ انسان کی نظروں سے اوجھل تھا اس لیے انسان اس کو سمجھ نہ سکا۔ تاہم قیامت میں اس دوسرے نظام (خدائی نظام) سے پردہ ہٹ جائے گا۔ اس وقت انسان جان لے گا کہ اسراء خداوندی بھی اسی طرح عین ممکن تھا جس طرح آج اسراء مشینی بالکل ممکن نظر آتا ہے۔

''بیل گاڑی'' کے دور میں انسان کے لیے ''ہوائی جہاز'' ایک ناقابل یقین چیز تھی۔ کیوں کہ اس وقت ہوائی جہاز مستقبل کے پردہ میں چھپا ہوا تھا۔ اسی طرح موجودہ زندگی میں ابھی آخرت کا دور انسان کی نظروں سے چھپا ہوا ہے۔ پردہ ہٹنے کے بعد عالم غیب کی باتیں بھی آدمی کے لیے اسی طرح قابل فہم بن جائیں گی جس طرح عالم شہود کی باتیں آج قابل فہم بنی ہوئی ہیں۔

غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے میرے پروگرام کی قطعی اطلاع الجامعۃ الاسلامیۃ (مدینہ) کونہیں دی جاسکی تھی۔ میری روانگی کے بعد 29 فروری کی دوپہر کو جامعہ کے نام دہلی سے ٹیلکس کیا گیا جب کہ اسی دن شام کو میں مدینہ پہنچنے والا تھا۔ ظہران اور ریاض ہوتا ہوا مدینہ ایئر پورٹ پر پہنچا تو جامعہ کا نمائندہ وہاں معاونت کے لیے موجود تھا— موجودہ زمانے میں مواصلات کی ترقی نے انسان کے لیے کس قدر آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس کے باوجود انسان خدا کا شکر ادا نہیں کرتا۔

مدینہ ائیر پورٹ سے ہم الجامعۃ الاسلامیۃ کے نمائندہ کے ساتھ چلے۔ یہاں تک کہ ہم لوگ فندق النخیل میں پہنچا دیے گئے۔ یہاں ہمارا قیام کمرہ نمبر 901 اور 902 میں تھا۔ اگلے دن ہم الجامعۃ الاسلامیۃ لے جائے گئے۔ وہاں رئیس الجامعۃ دکتور عبداللہ صالح العبید اور دوسرے ذمہ داروں سے ملاقات ہوئی۔ ذمہ داروں کے مشورے کے بعد محاضرات کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ پروگرام کی تفصیل اگلے صفحہ پر موجود ہے۔

مدینہ کا یہ سفر الجامعۃ الاسلامیۃ (مدینہ منورہ) کی دعوت پر ہوا۔ جمادی الاوّل 1404ھ میں جامعہ میں المؤتمر الثانی للدعوۃ الاسلامیہ کا اجلاس ہوا۔ جس میں دنیا کے مختلف حصوں سے دعاۃ اور اہل علم بلائے گئے تھے۔ مجھے بھی اس موتمر میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ مطبوعہ پروگرام میں میرا نام شامل کیا جا چکا تھا۔ مگر اس وقت میں بعض اسباب کی بنا پر سفر نہ کر سکا۔ تاہم جامعہ مجھ کو بلانا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے ایک ہفتہ کا مستقل پروگرام بنایا جس میں جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ سے ملاقاتیں تھیں اور ہر روز شام کو جامعہ میں میرا ایک محاضرہ (لکچر) رکھا گیا تھا۔ اس پروگرام کے تحت یہ سفر ہوا۔

2 مارچ کو جامعہ کے بڑے ہال میں پہلا محاضرہ تھا۔ اصل محاضرہ عربی میں تھا اور اس کا موضوع تھا: التضامن والدعوۃ الاسلامیۃ۔ وسیع ہال بھرا ہوا تھا۔ ابتدائی کارروائی کے بعد میں نے مقالے کے چند صفحات پڑھے اور پھر یہ کہہ کر اس کو مولانا صفی احمد صاحب کو دے دیا اور انہوں نے بقیہ صفحات پڑھ کر مقالہ کو مکمل کیا۔

بسم الله الرحمن الرحيم

الجامعة الإسلامية بالمدينة المنورة

عمادة شؤون الطلاب

برنامج لقاءات

الشيخ وحيد الدين خان بمنسوبي الجامعة

تستضيف الجامعة المفكر الإسلامي المعروف الشيخ وحيد الدين خان ..

وتنظم له عدة لقاءات مع منسوبي الجامعة كالآتي :

اليوم والتاريخ	الوقت	المكان	موضوع المحاضرة
الأحد ٢/٦/١٤٠٤	بعد المغرب	قاعة المحاضرات	الإسلام والإنسان المعاصر
الاثنين ٣/٦/١٤٠٤	""	مسجد الجامعة	الإسلام والمشاكل العصرية
الثلاثاء ٤/٦/١٤٠٤	""	قاعة المحاضرات	التضامن والدعوة الإسلامية
السبت ٨/٦/١٤٠٤	""	صالة الدور الثالث بمهجع ب	امكانيات جديدة للدعوة الإسلامية
الأحد ٩/٦/١٤٠٤	""	قاعة المحاضرات	حوار مفتوح

والدعوة عامة للجميع.

والله الموفق...

عميد شؤون الطلاب

د. أحمد بن سعد حمدان الغامدي

3 مارچ کو جامعہ کی مسجد میں پروگرام تھا۔ یہ مسجد بہت بڑے ہال کی مانند ہے اور انتہائی سادہ ہونے کے باوجود انتہائی شاندار ہے۔ یہ دوسرا محاضرہ انگریزی میں تھا۔ میں نے اصل انگریزی محاضرہ کا کچھ حصہ بطور خلاصہ پڑھا اور اس کے بعد کہا:

هٰذِهِ خُلَاصَةُ مَقَالَتِي، وَسَيُلْقِيهَا مُفَصَّلَةً بِاللُّغَةِ الْعَرَبِيَّةِ فَضِيلَةُ الْأُسْتَاذِ مُحْيِي الدِّينِ الْعَرَبِيِّ.

محی الدین عربی ایک مصری عالم ہیں۔ انہوں نے پہلے سے میرے انگریزی مقالہ کا عربی ترجمہ تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مکمل ترجمہ خالص عربی لہجہ میں پڑھ کر سنایا۔

4 مارچ کو دوبارہ جامعہ کے بڑے ہال (قاعۃ المحاضرات) میں پروگرام تھا۔ محاضرہ کا عنوان تھا: امکانیات جدیدۃ للدعوۃ۔ یہ مقالہ عربی میں تھا۔ میں نے خود پورا مقالہ پڑھ کر سنایا۔ بعد کو لوگوں نے کہا کہ آپ کے پڑھنے کا طریقہ بہت اچھا تھا۔ اور آئندہ آپ کو اپنا مقالہ خود ہی پڑھنا چاہیے، خواہ وہ عربی میں ہو یا انگریزی میں۔

اس کے بعد تین دن کا وقفہ تھا۔ اگلا پروگرام 11 مارچ کو دن میں ہوا۔ اصل مقالہ انگریزی میں تھا۔ میں نے ابتداءً کچھ کلمات خلاصہ کے طور پر کہے۔ اس کے بعد محی الدین عربی نے اس کا مکمل عربی ترجمہ پڑھ کر سنایا۔ شام کو نماز مغرب کے بعد حوار مفتوح (سوال وجواب) کا پروگرام تھا۔ میں نے تمہید کے طور پر کچھ ابتدائی کلمات عربی میں کہے۔ اس کے بعد طلبہ کے سوالات کاغذ پر لکھے ہوئے آنا شروع ہوئے۔ کافی سوالات آئے اگرچہ بعض سوالات میرے ذوق کے خلاف تھے۔ تاہم میں نے تمام سوالات کے جوابات دیے۔ اس کی شکل یہ ہوئی کہ ایک ایک سوال پڑھ کر سنایا جاتا اور میں اس کا جواب دیتا۔

یہ مجلس کافی دلچسپ رہی۔ لوگ آخر تک نہایت دلچسپی کے ساتھ سنتے رہے۔ اساتذہ اور ذمہ داروں کی بھی ایک تعداد ہال کے اندر تھی۔

6 مارچ کی شام کو نماز عشا کے بعد جامعہ اسلامیہ کے ہندستانی طلبہ بڑی تعداد میں ہوٹل

کے کمرہ میں آگئے۔ ان کی خواہش پر میں نے بتایا کہ میرا حاصل مطالعہ کیا ہے اور میں نے اب تک کے مطالعہ سے کیا پایا ہے۔ یہ گفتگو زیادہ تر اسلامی دعوت کے جدید امکانات کے پہلو پر تھی۔ اس مجلس میں جامعہ کے بعض استاد بھی شریک تھے۔ مزید میں نے کہا کہ سورہ یوسف سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی دنیا میں یہ بھی ممکن ہے کہ جہاں لوگ آپ کی تاریخ ختم کرنا چاہتے ہوں وہاں سے آپ کے لیے ایک نئی تاریخ کا آغاز ہو جائے۔ آپ کا اسوء القصص احسن القصص میں تبدیل ہو جائے۔ مگر اس عظیم خدائی انعام کو پانے کی دو لازمی شرطیں ہیں، تقویٰ اور صبر (یوسف، 12:90)۔

7 مارچ کی شام کو ایک صاحب کے مکان پر ہندستانی طلبہ کا اجتماع ہوا۔ یہاں میں نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا کہ "مومن" ہونے کا مطلب کیا ہے اور جنت میں داخلہ آدمی کو کس طرح ملے گا۔ آخر میں کچھ لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ اپنے مرکز کے مقاصد کے بارے میں کچھ بتائیں۔ میں نے اس سلسلے میں ضروری تفصیلات عرض کیں۔

مجھ کو ایک عجیب تجربہ یہ ہوا کہ اگر الاسلام یتحدی کی قسم کی سائنس والی باتیں کی جائیں تو لوگ خوب خوش ہوتے ہیں اور ھل من مزید کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر حمد خداوندی کی باتیں کی جائیں، اگر جنت اور جہنم کا تذکرہ کیا جائے، اگر رزق ربانی کے نغمے چھیڑے جائیں تو لوگوں کو کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلا اسلام ان کی پہچان والا اسلام ہے۔ جب کہ دوسرا اسلام ان کی پہچان والا اسلام نہیں۔ آج مسلمانوں نے اسلام کو اپنے لیے سرمایہ فخر بنا رکھا ہے۔ اس لیے پہلی قسم کی باتیں ان کو اسلام کا سائنسی قصیدہ معلوم ہوتی ہیں۔ ان کو سن کر ان کی نفسیاتِ فخر کو تسکین ملتی ہے اور وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ مگر دوسری قسم کی باتیں ان کو اجنبی معلوم ہوتی ہیں۔ کیوں کہ اسلام کے نام سے وہ اس قسم کی کسی چیز کو جانتے ہی نہیں، اسلام ان کے لیے قومی فخر کا عنوان ہے، نہ کہ اصلاح ذات کا عنوان۔ فخر والی بات کی جائے تو وہ اس میں اپنے لیے غذا پا لیتے ہیں۔ مگر اصلاح ذات والی باتیں کی جائیں تو وہ اس سے متوحش

ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اس کا مطلب اپنی نفی ہے۔ اور کون ہے جو اپنی نفی کی قیمت پر حق کا اعتراف کرے۔

المعہد العالی للدعوۃ الاسلامیہ (مدینہ) کی طرف سے ایک ماہانہ پرچہ نکلتا ہے جس کا نام ہے رسالۃ المعہد۔ اس کے نمائندہ محمد ضیاء الدین صاحب نے 5 مارچ کی شام کو رسالۃ المعہد کے لیے انٹرویو لیا۔ محمد ضیاء الدین صاحب نوجوان ہیں اور حلب (شام) کے رہنے والے ہیں۔ اس وقت وہ مدینہ میں وزارۃ الاعلام کے تحت کام کر رہے ہیں۔ رسالۃ المعہد کے جوابات کا اردو ترجمہ یہاں بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔

1۔ دعوت اسلامی کا مطلب میرے نزدیک دعوت الی اللہ ہے۔ موجودہ زمانے میں دعوت الی اللہ کو جو چیلنج درپیش ہے وہ میرے نزدیک الحادی فکر کا غلبہ ہے۔ اس لیے دعوت اسلامی کی راہ ہموار کرنے کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ دنیا سے الحادی فکر کا غلبہ ختم کیا جائے۔ قدیم زمانے میں مادی مظاہر کو خدا قرار دے کر انسان نے خدا کو چھوڑ دیا تھا۔ موجودہ زمانے میں مادی مظاہر کے پیچھے کام کرنے والے سلسلۂ اسباب کو خدا قرار دے دیا گیا ہے اور اسی کا نام الحاد ہے۔ جب تک اس فکری ڈھانچہ کو توڑا نہ جائے کوئی دوسرا کام نہیں کیا جا سکتا۔

2۔ موجودہ زمانے کے داعیوں کا اصل مسئلہ وہ ہے جو داخلی ہے۔ وہ ابھی تک دعوت اور قومیت کو اور اسی طرح دعوت اور سیاست کو الگ الگ نہیں کر سکے ہیں۔ جس دن وہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے میں کامیاب ہوں گے اسی دن ان کے مسائل کے خاتمہ کا بھی آغاز ہو جائے گا۔

3۔ صحافت یقیناً اسلامی دعوت کے لیے نہایت اہم ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ مسلمان ابھی تک صرف قومی صحافت کو جانتے ہیں، وہ عالمی صحافت کے میدان میں داخل نہیں ہوئے۔ عالمی صحافت کے لیے موضوعیت (objectivity) لازمی طور پر ضروری ہے اور مسلمان موضوعیت سے محروم ہیں۔

4۔ میری زندگی کسی ’’حادثہ‘‘ کے نتیجہ میں نہیں بنی۔ میں نے اسلامی علوم اور غیر اسلامی علوم کا تقریباً 40 سال تک مطالعہ کیا ہے۔ میری شخصیت اسی مطالعہ کے ذریعہ بنی ہے۔

5۔ جدید علمی انکشافات کو تفسیر قرآن میں استعمال کرنا میرے نزدیک عین درست ہے، شرط صرف یہ ہے کہ معیار اصلی قرآن ہو، نہ کہ جدید انکشافات۔ یعنی جدید انکشافات کو قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے، نہ کہ قرآن کو جدید انکشافات کی روشنی میں۔

علمی نظریات کے بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دور اوّل میں جب قرآن نے کہا کہ زمین و آسمان کی نشانیوں پر غور کرو تو انسان نے اپنی اس وقت کی معلومات کی روشنی میں زمین و آسمان پر غور کیا۔ آج بھی یہی ہوگا کہ انسان اپنی موجودہ معلومات کی روشنی میں آیات پر غور کرے گا۔ اس کی وجہ سے نہ پہلے کوئی اعتقادی خرابی پیدا ہوئی اور نہ آج ہو سکتی ہے۔

ایک غیر عرب سے ملاقات ہوئی۔ وہ عالم تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ قرآن پر ایک تحقیقی کتاب لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ قرآن کے مطالعہ میں گزارا ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اپنے مطالعہ کی روشنی میں بتائیے کہ قرآنی تعلیمات کا خلاصہ کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا ”اس حیثیت سے میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ میرے لیے یہ سوال اچانک ہے۔ اس لیے مجھے سوچ کر بتانا ہوگا“۔ اسی طرح ایک اور صاحب ملے انہوں نے کہا کہ میرا موضوع قرآن ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی ایسی بات بتائیے جو آپ نے خود قرآن میں پائی ہو، جو آپ کی اپنی دریافت ہو۔ مگر وہ قرآن سے کسی ایسی حقیقت کی نشاندہی نہ کر سکے جو انہوں نے خود دریافت کی ہو— کیسے عجیب ہوں گے وہ قرآن کو پڑھنے والے جن کے ذہنی اثاثہ خانہ میں قرآن نے کسی نئی چیز کا اضافہ نہ کیا ہو۔

اس سفر کے دوران ایک عرب ملک کی ایک بڑی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ عرب امام نے کافی لمبا خطبہ دیا۔ اس خطبہ میں ’’بیع‘‘ کے مسائل نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے تھے۔ تاہم ان مسائل میں اکثر ایسے تھے جن کا آج کے حالات سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ بس کتاب کی باتوں کو دہرائے چلے جا رہے ہیں۔

مثلاً انہوں نے کہا کہ جو لوگ مسلمانوں سے جنگ کریں ان کو ہتھیار بیچنا حرام ہے (بَيْعُ السِّلَاحِ عَلَى مَنْ يُحَارِبُ الْمُسْلِمِينَ حَرَامٌ)۔ یہ مسئلہ صلیبی جنگوں کے زمانے کا ہے۔ اس زمانے میں عراق وشام کے علاقہ میں دنیا کے بہترین ہتھیار بنتے تھے۔ چنانچہ جنگ کے وقفوں میں یوروپی تاجر یہاں آکر ہتھیار خریدتے تھے۔ چونکہ یہ اندیشہ تھا کہ یہ ہتھیار وہ یورپی قوموں کے ہاتھ بیچیں گے اور وہ ان کو اگلی صلیبی جنگ میں مسلمانوں کے خلاف استعمال کریں گے۔ اس لیے اس وقت کے علما نے فتویٰ دیا کہ جو لوگ مسلمانوں سے برسر جنگ ہوں ان کو ہتھیار فروخت کرنا حرام ہے۔

یہ مسئلہ خود بتاتا ہے کہ وہ ایسے وقت سے متعلق ہے جب کہ مسلمان ہتھیار فروخت کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ مگر موجودہ زمانے میں تو مسلمان صرف اس کے خریدار ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج ہتھیاروں کی صنعت پوری طرح "کافروں" کے ہاتھ میں جا چکی ہے۔ اور خود مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ ان سے ہتھیار خریدے بغیر اپنے دشمنوں سے اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔ ہمارے اکثر بڑے بڑے خطیبوں کا یہ حال ہے کہ جب وہ بولتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ "بیسویں صدی میں نہیں بول رہے ہیں" بلکہ "صلاح الدین کے منبر" پر کھڑے ہو کر اقوام عالم کو خطاب کر رہے ہیں۔

5 مارچ کو دوپہر کا کھانا رئیس جامعۃ اسلامیہ دکتور عبداللہ صالح العبید کی طرف سے تھا۔ انہوں نے میرے اعزاز میں مدینہ کے ہوٹل میں ظہرانہ دیا۔ اس ظہرانہ میں چنی ہوئی اعلیٰ شخصیتیں موجود تھیں۔ جس میں وزارت تعلیم کے وکیل بھی تھے۔ اسی طرح ایک اور صاحب نے ایک خصوصی دعوت کی جس میں رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل کے پی اے استاد اسامہ خلیفہ بھی شریک تھے۔

ان مواقع پر ذمہ دار لوگوں سے باتیں ہوئیں۔ شیخ محمد عمر فلاتہ سے اسلامی مرکز کے موضوع پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہم سیاست سے دور رہ کر خالص دعوت کے میدان میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں میری زبان سے نکلا کہ ہندستان کے حالات میں موثر کام کرنے کے لیے سیاست سے دور رہنا ضروری ہے۔ شیخ محمد عمر فلاتہ نے فوراً کہا کہ ہندستان ہی میں نہیں بلکہ ہر ملک میں ضروری ہے۔ سیاست میں مشغول ہو کر کوئی موثر کام نہیں کیا جاسکتا۔

رئیس الجامعہ دکتورعبداللہ صالح العبید سے میں نے پوچھا کہ آپ نے الاسلام یتحدیٰ پڑھی ہے۔ انہوں نے فوراً کہا: کس نے نہیں پڑھی ہے۔ اکثر لوگ مجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ الاسلام یتحدیٰ کے بعد دوسری تصنیفات کیا ہیں اور وہ عربی میں منتقل ہوئیں یا نہیں۔

یہاں جس جگہ بھی جانا ہوا یا جس سے بھی ملاقات ہوئی اس نے یہی بتایا کہ اس نے الاسلام یتحدیٰ پڑھی ہے۔ بعض نے کہا کہ میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ اور اس کو پڑھنا چاہتا ہوں۔ الجامعۃ الاسلامیۃ میں انڈونیشیا کے ایک طالب علم نے بتایا کہ انڈونیشی زبان میں بھی الاسلام یتحدیٰ کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ انہوں نے میرا پتہ لیا اور کہا کہ اس کا ایک نسخہ میں آپ کو ڈاک سے روانہ کروں گا۔

10 مارچ کی شام کو شیخ محمد عمر فلاتہ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے الجامعۃ الاسلامیۃ کے بعض عجیب واقعات سنائے۔ انہوں نے بتایا کہ میں جامعہ کے تحت ایک سفر کے دوران کیمرون گیا۔ وہاں جامعہ کے ایک فارغ طالب علم سے ملاقات ہوئی تو وہ بار بار جامعہ کے ایک مستخدم (ملازم) کے بارے میں سوال کرتا اور اس کا حال پوچھتا۔ میں نے پوچھا کہ تم جامعہ کے شیوخ سے زیادہ مستخدم کے حالات دریافت کر رہے ہو، کیا بات ہے۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ میں تعلیم کی غرض سے جامعہ گیا۔ میں اپنے ساتھ کوئی رقم نہیں لے گیا تھا۔ کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ ساری کفالت جامعہ کی طرف سے ہوگی۔ جب وہ مدینہ کے ایئر پورٹ پر اترا تو اس کو یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ وہاں کوئی گاڑی اس کی مدد کے لیے موجود نہیں ہے۔

نوجوان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ٹیکسی کرے۔ اگرچہ اس کی جیب میں کوئی رقم موجود نہ تھی۔ تاہم اس نے ٹیکسی کی اور اس کے ذریعہ ایئر پورٹ سے جامعہ پہنچا۔ یہاں جب ٹیکسی والے نے کرایہ (پندرہ ریال) مانگا تو نوجوان نے کہا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس پر ٹیکسی والا غصہ میں آ گیا۔ اور نوجوان کو دھوکہ باز، شیطان وغیرہ کہنے لگا۔

نوجوان بے بسی کے انداز میں ٹیکسی والے کی سخت کلامی کو سن رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں

نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ اتنے میں جامعہ کا ایک مستخدم شورسن کر وہاں آ گیا اور ٹیکسی والے سے کہا کہ تم کیوں اس طالب علم کو پریشان کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ یہ دھوکے باز ہے۔ مجھ کو ایئر پورٹ سے لایا اور اب کرایہ دینا ہے تو کہتا ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں۔ مستخدم نے کہا کہ اپنی زبان روکو، یہ ضیوف الرحمٰن ہیں اور یہ مجھ سے اور تم سے بہت زیادہ بہتر ہیں۔

اس کے بعد مستخدم نے اپنی جیب سے پندرہ ریال نکالے اور اس کو ٹیکسی کے مالک کے حوالے کیا۔ اس کے بعد یہ مستخدم نوجوان کو لے کر دفاتر میں گیا۔ ضروری کارروائی کرائی اور اس کے سامان کو اس کے کمرہ تک پہنچایا۔ آخر میں جب وہ رخصت ہونے لگا تو اس نے دوبارہ اپنی جیب سے 20 ریال نکالے اور طالب علم کے حوالہ کر کے باہر چلا گیا۔

ایک ہندستانی طالب علم سے میں نے عربوں کے بارے میں ان کے تجربات پوچھے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے عربوں میں ایک خاص بات یہ دیکھی کہ ان کے اندر توسع کا مزاج ہوتا ہے جو ہندستان اور پاکستان جیسے علاقوں میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ ہم لوگ کسی محفل میں ایک تقریر کرتے ہیں یا کسی موقع پر ایک سوال کا معمولی جواب دیتے ہیں تو ہمارے اساتذہ فراخ دلی کے ساتھ احسنت احسنت کہتے ہیں۔ ان کا مزاج ہوتا ہے کہ جو خوبی ہے اس کا بھرپور اعتراف کیا جائے اور جو کمی ہے اس کو نظرانداز کیا جائے۔

5 مارچ کی صبح کو ہم دو فلسطینی نوجوانوں کے ساتھ مدینہ کے تاریخی آثار دیکھنے کے لیے نکلے۔ تقریباً نصف دن گزرا۔ مصطفیٰ شاور (فلسطینی ثم اردنی) کو آثار عرب کے بارے میں خاصی معلومات ہیں۔ چنانچہ وہ رہنمائی کرتے رہے۔ مدینہ میں رسول اللہ اور صحابہ کے زمانے کے اصل آثار اب بہت کم باقی ہیں۔ ان آثار کی ایک حیثیت تاریخی تھی اور دوسری یہ تھی کہ لوگ ان کو مقدس قرار دے کر یہاں آ کر مشرکانہ افعال کرتے تھے۔ ذمہ داروں نے ان کی دوسری حیثیت کی بنا پر انہیں ختم کر دیا۔ اس وقت جو آثار ہیں ان میں اکثر وہ ہیں جہاں نئی تعمیرات کھڑی ہیں۔ مثلاً ایک شخص آپ کو بتائے گا کہ یہاں سقیفہ بنی ساعدہ تھا۔ مگر آج

وہاں صرف کھجور کے درخت نظر آتے ہیں۔ مسجد الجمعہ اور مسجد قبا آج موجود ہیں، مگر ان کی تعمیرات وہ نہیں ہیں جو ابتدا میں تھیں۔

تاہم کچھ چیزیں آج بھی اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہیں۔ مثلاً بئر رومہ جس کو حضرت عثمان نے ایک یہودی سے خرید کر عام مسلمانوں کے لیے وقف کیا تھا۔ اسی طرح کعب بن اشرف کا قلعہ نما مکان بھی کھنڈر کی صورت میں ابھی تک موجود ہے۔ ہم نے یہ مقامات دیکھے۔ ان کو دیکھ کر عجیب عبرت حاصل ہوئی۔

پھر ہم احد پہاڑ کو دیکھنے گئے۔ یہاں دیگر آثار کے علاوہ وہ شق (غار) بدستور موجود ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے شکست کے بعد پناہ لی تھی۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑ کے اوپر چڑھ کر غار میں داخل ہوا اور ان پتھروں پر دیر تک بیٹھا رہا جہاں حسب روایت رسول اللہ ﷺ زخمی ہونے کے بعد بیٹھے تھے۔ اس وقت طبعیت پر عجیب اثر ہوا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے تاریخ کا درمیانی وقفہ حذف ہو گیا ہے اور میں براہ راست رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پہنچ گیا ہوں۔

ایک عرب عالم نے کہا کہ میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدیٰ پڑھی، الدین فی مواجہۃ العلم پڑھی، الاسلام والعصر الحدیث پڑھی یہ سب کتابیں مجھے پسند آئیں۔ ان کتابوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر رحمت کا دروازہ کھولا ہے۔ مگر اس کے بعد میں نے آپ کی کتاب ”حکمۃ الدین“ پڑھی تو وہ پسند نہیں آئی۔ اس میں آپ نے اخوان المسلمین کی سیاست پر تنقید کی ہے۔ یہ زمانہ ایسا ہے کہ دشمنان اسلام ہمارے اختلاف سے فائدہ اٹھانے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ہم کو صرف وہی باتیں کرنی چاہئیں جس سے اتفاق پیدا ہو۔

اس قسم کی باتیں اور بھی کئی بار سننے کو ملی ہیں۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ یہ کیسا عجیب مطالبہ ہے۔ جن جماعتوں پر میں نے تنقید کی ہے، وہ موجودہ زمانے میں باہمی اختلاف کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ انہوں نے مسلم ملکوں میں مسلمانوں کو حکمراں اور غیر حکمراں کے دو طبقوں میں بانٹ

رکھا ہے اور دونوں کے درمیان زبردست ٹکراؤ جاری کر دیا ہے۔ میں تو زیادہ سے زیادہ صرف علمی تنقید کرتا ہوں۔ جب کہ دوسرے لوگوں کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اختلاف سے گزر کر مسلمانوں کو باہمی تصادم میں ڈال دیا ہے۔ پھر بھی اختلاف پیدا کرنے کا الزام میرے اوپر ہے۔

تاہم عربوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ اختلاف کے باوجود کسی آدمی سے محبت کر سکتے ہیں۔ عرب نوجوانوں کی بڑی تعداد اخوانی تحریک سے متاثر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں اخوانی تحریک کا ناقد ہوں۔ اس کے باوجود الاسلام یتحدیٰ کی بنیاد پر وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ محمد ضیاء الدین ملا جفجی (حلب، شام) اخوانی نوجوان ہیں اور اخوانیوں کے بارے میں میرے خیالات کو جانتے ہیں۔ مگر وہ نہایت احترام اور محبت کے ساتھ مجھ سے ملتے رہے۔ وہ دوسری بار آئے تو بتایا کہ میں نے شام میں اپنے والد سے ٹیلیفون پر بات کی۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت میں خود نہیں آسکتا۔ تم شیخ وحید الدین کو میرا سلام کہو اور میری طرف سے ان کے ہاتھ کا بوسہ دو (قَبِّلْ يَدَهُ بِالنِّيَابَةِ عَنِّي)۔

12 مارچ 1984 کو مسجد نبوی میں فجر کی نماز پڑھی۔ یہ مسجد نبوی میں ہماری آخری نماز تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر جب میں باہر نکل رہا تھا تو بے اختیار میری زبان سے نکلا: خدایا یہ وہ مقام ہے جہاں تیرے پیغمبر نے نمازیں پڑھی ہیں۔ جہاں پیغمبر کے اصحاب کے قدم پڑے ہیں۔ جہاں ان لوگوں کی مجلسیں قائم ہوئی ہیں جن کو تو نے جنت کی بشارت دی ہے۔ خدایا مجھے بھی اس مجلس میں شریک ہونے والوں میں شامل فرما۔ خدایا، جس طرح تو نے انھیں بخشا اسی طرح مجھے بھی اپنی رحمت سے بخش دے۔

12 مارچ کی دوپہر کو ہم مدینہ سے ریاض پہنچے۔ (الرسالہ، جولائی 1984)

ریاض

مارچ 1984 میں الجامعۃ الاسلامیہ کی دعوت پر مدینہ (سعودی عرب) کا سفر ہوا۔ مدینہ

سے واپسی میں، میں اور مولانا محمد ہاشم القاسمی 12 مارچ کی دوپہر کو ریاض پہنچے۔ ریاض قدیم زمانہ میں ایک گاؤں تھا جس کا نام حجر الیمامہ تھا۔ 14 مارچ 1984 کو سعودی عرب کے سب سے بڑے عالم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کو ٹیلی فون پر بتایا گیا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ "شیخ سے میرا اسلام کہو اور یہ کہو کہ آج دوپہر کا کھانا وہ میرے ساتھ کھائیں"۔ چنانچہ ہم لوگ ظہر کی نماز کے بعد ان کے مکان پر پہنچے۔

یہ غیر معمولی طور پر ایک بہت بڑا مکان تھا۔ ایک نہایت وسیع ہال میں نشست تھی۔ تقریباً بیس علما کرسیوں پر موجود تھے۔ مجھ کو شیخ ابن باز کی بالکل قریبی کرسی پر بٹھایا گیا۔ اس کے بعد حسب معمول قہوہ آیا۔ آدمی نے پہلی پیالی شیخ ابن باز کی طرف بڑھائی۔ شیخ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: فَضِّلْ یَا شَیْخ۔ شیخ ابن باز نہایت عزت اور محبت کے ساتھ پیش آئے۔ زیادہ تر مسلم دنیا اور میرے کام کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ کھانا کھانے کے بعد دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

ریاض سے روانگی کے دن دوبارہ شیخ ابن باز سے ان کے دفتر میں ملنے گیا۔ شیخ کا دفتر اتنا بڑا ہے کہ وہ حکومت کا سکریٹریٹ معلوم ہوتا ہے۔ شیخ ایک بہت بڑے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسیوں پر نشست تھی۔ وہ عام طور پر لوگوں کو بیٹھے بیٹھے رخصت کر رہے تھے۔ مگر جب میں سامنے آیا تو شیخ فوراً کھڑے ہو گئے اور دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ مجھ کو رخصت کیا۔

14 مارچ کو دکتور عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی سے ملاقات کا پروگرام تھا۔ وہ سعودی عرب کی سب سے بڑی یونی ورسٹی جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کے مدیر (Rector) ہیں۔ ان کا دفتر اتنا بڑا ہے جو خود ایک یونی ورسٹی معلوم ہوتا ہے۔ ملاقات کا کمرہ ہندستان کے وزیر اعظم کے کمرہ سے بھی زیادہ وسیع اور شاندار نظر آیا۔ تاہم اس کے اندر جو انسان بیٹھا ہوا تھا وہ سراپا تواضع اور سنجیدگی کی تصویر معلوم ہوتا تھا۔

زیادہ تر ہندستان کے حالات اور اسلامی مرکز (دہلی) کے بارے میں گفتگو رہی۔ آخر میں وہ نماز ظہر کے لیے اٹھے۔ میں یہ سمجھا کہ وہ عقبی کمرہ میں نماز ادا کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ مگر

وہ ہمارے ساتھ بیرونی دروازہ کی طرف چلے، یہاں تک کہ ہم لوگ زینہ سے اتر کر قریب کی مسجد میں پہنچے جو مدیر کے دفتر سے متصل بنائی گئی ہے۔ یہاں کافی لوگ نماز کے لیے جمع تھے۔ دکتور ترکی چلتے رہے یہاں تک کہ وہ امام کی جگہ پہنچ گئے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ جو شخص یونی ورسٹی کا ریکٹر ہے وہ یہاں کی مسجد کا امام بھی ہے۔

دکتور عبد الحلیم عویس جامعۃ الامام میں علوم اجتماعیہ (Social Sciences) کے پروفیسر ہیں۔ ان سے بڑی دلچسپ اور مفید ملاقاتیں رہیں۔ ایک گفتگو میں انہوں نے بڑی عمدہ بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ انسان مال بناتا ہے مگر مال انسان نہیں بناتا (الإِنْسَانُ يَصْنَعُ الْمَالَ، وَلَكِنَّ الْمَالَ لَا يَصْنَعُ الإِنْسَانَ)۔

دکتور عبد الحلیم عویس مصری ہیں اور نہایت ذہین ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کئی مصریوں نے اردو پڑھی ہے اور وہ اردو اتنی ہی اچھی جانتے ہیں جتنا کہ اہل زبان (هُمْ يُجِيدُونَ الأُرْدِيَّةَ كَأَهْلِهَا)۔ دکتور عبد الحلیم عویس نے اخبار الشرق الاوسط کے لیے میرا انٹرویو لیا۔

ریاض میں ایک سعودی نوجوان عبد اللہ الشویعر سے ملاقات ایک یادگار ملاقات تھی۔ ان کے پاس میری تمام عربی کتابیں کئی کئی تعداد میں موجود ہیں۔ وہ خود پڑھنے کے علاوہ دوسروں کو بھی تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ ایک روز گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ واللہ ہم آپ سے صرف اللہ کی خاطر محبت کرتے ہیں۔ ہم کو تمام اسلامی مصنفین سے محبت ہے اور آپ اس میں چوٹی پر ہیں (وَأَنْتُمْ عَلَى قِمَّتِهَا)۔

ساحل العاج کے ایک نوجوان ابو بکر السماسی سے ملاقات ہوئی۔ وہ یہاں جامعۃ الامام میں کلیۃ الشریعۃ کے طالب علم ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ساحل العاج کی آبادی 10 ملین ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس میں سے 45 فی صد مسلمان ہیں۔ تاہم خود مسلمانوں کا خیال ہے کہ ان کی آبادی 65 فی صد سے کم نہیں۔ یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ صدر حکومت مسلمان ہے اور وزارت میں کئی مسلمان شامل ہیں۔

مذکورہ نوجوان سے میں نے پوچھا کہ ساحل العاج میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ انہوں نے کہا، ہاں۔ مسلمانوں نے یہاں کی یونی ورسٹی میں شاندار مسجد بنالی ہے۔ ٹیلی ویژن پر ہر جمعہ کو اسلامی پروگرام ہوتا ہے۔ ان کو حکومت ہر طرح کی سہولت دیتی ہے، وغیرہ۔ مگر اس کو انہوں نے حکومت کے ''تملق'' سے تعبیر کیا۔ یہ بھی عجیب ذہن ہے کہ حکومت اگر کچھ کرے تو وہ متملق ہے اور نہ کرے تو ظالم۔

انہوں نے بتایا کہ ساحل العاج میں لوگ کثرت سے مسلمان ہو رہے ہیں۔ ایک مقام پر صرف ایک دن میں چار ہزار آدمی مسلمان ہو گئے۔ میں نے پوچھا کہ کن لوگوں کی کوششوں سے ایسا ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا: الفضل یرجع الی اللہ والی الکتب المترجمۃ الی الفرنسیۃ۔

15 مارچ کو دوپہر کا کھانا شیخ ابو عبد الرحمٰن بن عقیل الظاہری کے یہاں تھا۔ وہ اعلیٰ پایہ کے مصنف اور عالم ہیں۔ مگر ہندستان میں اور عرب میں یہ فرق ہے کہ ہندستان کے علما بول چال کے موقع پر بھی کتابی زبان بولتے ہیں۔ مگر اکثر عرب علما لکھتے وقت تو کتابی زبان لکھتے ہیں مگر بولنے کے وقت ان پر عوامی زبان کا اثر آجاتا ہے۔ مثلاً ہمارے میزبان نے ایک موقع پر گھر کے ایک لڑکے سے کہا: أَيْش تَبْغُونَ (تم کیا چاہتے ہو)۔ اس طرح کی زبان سمجھنا ان لوگوں کے لیے کسی قدر مشکل ہوتا ہے جو صرف کتابی عربی سے واقف ہیں۔

ایک صاحب جو محامی (وکیل) ہیں اور یہاں کھانے میں شریک تھے، انہوں نے ایک گفتگو کے درمیان بڑے درد کے ساتھ کہا: النَّاسُ كُلُّهُمْ يَا أَخِي مُتَعَطِّشُونَ إِلَى الإِسْلَامِ (میرے بھائی، آج تمام لوگ اسلام کے پیاسے ہیں)۔

16 مارچ (بروز جمعہ) ڈاکٹر احمد توتونجی کو ٹیلی فون کیا گیا اور میری ریاض میں آمد کا ذکر کیا گیا۔ جمعہ کی نماز ہم لوگوں نے مسجد سلیمانیہ میں ادا کی۔ ایک عرب باصرار اپنے ساتھ وہاں لے گئے تھے۔ نماز سے فراغت کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر لوٹے تو دکتور احمد توتونجی یہاں موجود تھے۔ مجھ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ وہ ایک خوبصورت قسم کا بند پیکٹ اپنے ساتھ

لائے تھے۔ شیخ احمد توتونجی نے کہا کہ یہ آپ کے لیے ہے۔ میں نے کھولا تو اس کے اندر دو ایسی کتابیں تھیں جو عین میرا مطلوب تھیں۔ ایک قرآن کا جیبی نسخہ جو بائبل پیپر پر چھاپا گیا تھا۔ دوسرا حیات الصحابہ (مولانا محمد یوسف کاندھلوی) کی جلدیں دمشق کی چھپی ہوئی۔ مجھے قرآن کے مذکورہ نسخہ کی عرصہ سے تلاش تھی۔ اسی طرح حیات الصحابہ کا دمشق میں چھپا ہوا نسخہ بھی، جو میں بہت چاہتا تھا۔ الحمدللہ کہ آج ڈاکٹر توتونجی کے ذریعہ دونوں چیزیں مجھے مل گئیں۔

دکتور احمد توتونجی آج ہی بیرونی (افریقہ) جا رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دکتور طٰہ جابر العلوائی کو مقرر کیا کہ ان کی غیر موجودگی میں وہ مجھ سے ملتے رہیں اور میری جو بھی ضرورت ہو اس میں میری معاونت فرمائیں۔

اصحاب رسول کی زندگیاں اسلام کا زندہ نمونہ ہیں۔ چنانچہ اصحاب رسول کے بارے میں اسلاف نے کثرت سے کتابیں اور تراجم لکھے ہیں۔ تاہم اس موضوع پر قدیم کتابوں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک صحابی کو عنوان بنا کر اس کے تحت ان کے حالات لکھے جاتے ہیں۔ مولانا محمد یوسف کاندھلوی نے یہ کیا کہ عملی عنوانات قائم کر کے اس کے تحت صحابہ کے احوال درج کیے۔ یہ ایک بے حد مشکل کام تھا جو سالہا سال کی محنت کے بعد تمام ہوا۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن حیدرآباد سے چھاپا گیا تھا۔ تاہم اس میں کثرت سے طباعت کی غلطیاں تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے دو عرب علما، شیخ نائف العباس اور شیخ محمد علی دولہ کو یہ توفیق دی کہ وہ پوری کتاب کو دوبارہ تصحیح اور تعلیق کے ساتھ شائع کریں۔ وہ دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے جگہ جگہ جزئی اضافے بھی کیے ہیں (وَنُضِيفُ الْكَلَامَ الَّذِي نَسِيَهُ الْمُؤَلِّفُ أَثْنَاءَ النَّقْلِ)۔

ریاض میں ڈاکٹر عبدالرشید صاحب سے ملاقات بھی قابل ذکر ہے۔ انہوں نے ایک بڑی عجیب بات کہی۔ وہ قرآن کے مطالعہ کا بے حد ذوق رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ قرآن اللہ اور بندہ کے درمیان مقام اتصال (point of contact) ہے۔ اسی طرح انہوں نے کہا کہ بحیثیت ڈاکٹر جب میں انسان کے جسم کو دیکھتا ہوں تو میں خدا کے کمالات میں ڈوب جاتا

ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ہر وقت خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ گویا ایک ریموٹ کنٹرول کا نظام ہے۔ خدا اگر ریموٹ کنٹرول سے ہارٹ بیٹنگ کو روک دے تو ایک لمحہ میں ہمارا وجود ختم ہو جائے — جدید دریافتوں نے اسلامی حقیقتوں کی تفہیم کو کتنا آسان بنا دیا ہے۔

روزنامہ المدینہ (7 جمادی الثانی 1404ھ) میں دکتور عبداللہ عمر نصیف کا ایک انٹرویو نظر سے گزرا۔ موصوف اس سے پہلے جامعہ الملک عبدالعزیز (جدہ) میں مدیر تھے۔ اب وہ رابطہ عالم اسلامی کے امین عام ہیں۔ انٹرویور نے ان سے جو سوالات کیے ان میں سے ایک سوال دنیا کے مسلمانوں کے بارے میں تھا۔ دکتور عبداللہ نصیف نے غم ناک انداز میں کہا:

نَحْنُ نَرَى حَالَ الْمُسْلِمِينَ فِي كُلِّ مَكَانٍ، وَوَضْعَهُمُ السَّيِّئَ — إِمْكَانِيَّاتُهُمُ الضَّعِيفَةُ، فَقْرُهُمْ، جَهْلُهُمْ، وَانْتِشَارُ الْأَمْرَاضِ بَيْنَهُمْ۔ (ہم ہر مقام کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں۔ ان کا حال برا ہے۔ ان کے وسائل بہت کم ہیں۔ ان میں غریبی اور جہالت ہے۔ ان کے درمیان بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں)۔

19 مارچ کی شام کو ہم ریاض سے جدہ کے لیے روانہ ہوئے۔ 20 مارچ کی صبح کو ہم جدہ میں تھے۔ دکتور عبداللہ عمر نصیف سے ملاقات کا وقت طے تھا، لیکن ہم لوگ جدہ میں دیر سے پہنچے اور بظاہر ممکن معلوم نہیں ہوا کہ ہم لوگ ان سے مل سکیں گے۔ میں نے جناب حامد الدین صاحب سے کہا تو انہوں نے کہا کہ ابھی ان سے ٹیلی فون کر کے دوسرا وقت مقرر کر لیا جائے۔ حامد الدین صاحب نے ٹیلی فون ملایا تو السلام علیکم کے بعد پہلا جملہ یہ کہا:

I hope I did not disturb you.

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ انداز خطاب تعلیم سے آتا ہے۔ اگر قوم کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے تو قوم کے تمام مسائل اپنے آپ ختم ہو جائیں۔ کیوں کہ تعلیم قوم کے افراد کو مہذب بھی بناتی ہے اور باشعور بھی۔ اس کے مطابق شام کو نماز عصر کے بعد دکتور عبداللہ نصیف سے ان کی

قیام گاہ (جدہ) پر ملاقات ہوئی۔ جدہ میں ہم نے سرکاری مہمان بننے کے بجائے جناب محمد رفیق قریشی کی میزبانی کو پسند کیا۔ اس کی وجہ سے یہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔

دکتور احمد محمد علی سے ملاقات ہوئی جو اسلامک ڈولپمنٹ بنک کے صدر ہیں۔ مختلف ملاقاتوں کے درمیان میں نے محسوس کیا کہ راقم الحروف نے جو آواز بیس سال پہلے بلند کرنا شروع کیا تھا اس کی اہمیت اب عام طور پر محسوس کی جانے لگی ہے۔ اب سوچنے سمجھنے والا طبقہ عام طور سے تسلیم کرتا ہے کہ دعوت اسلامی کا کام قومی اور سیاسی جھگڑوں سے الگ ہو کر کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ جو بات پچھلے برسوں میں اجنبی بنی ہوئی تھی، بہت جلد وہ وقت آرہا ہے جب کہ وہی تمام لوگوں کی بات ہوگی۔ 21 مارچ کی شام کو ہم جدہ سے دوبئ کے لیے روانہ ہوئے۔ جہاز میں مجھے سردی کا احساس ہوا تو اوپر کا خانہ کھولا کہ اس میں سے کمبل نکال کر پیروں پر ڈال لوں۔ مگر وہاں صرف تکیہ رکھا ہوا تھا۔ مجھ کو ٹٹولتے ہوئے دیکھ کر جہاز کا ایک کارکن قریب آیا اور بولا:

Can I help you

(کیا میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں)۔ اردو میں اسی بات کو کہنا ہو تو آدمی کہے گا "آپ کو کیا چیز چاہیے"۔ زبان کا یہ اسلوب دونوں زبان کے بولنے والوں کے مزاج میں بھی منتقل ہوا ہے جس کا مظاہرہ مختلف عملی پہلوؤں سے ہوتا رہتا ہے۔

20 مارچ کی شام کو ہمارا جہاز دوبئ کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ وہاں چند روز گزارنے کے بعد 26 مارچ 1984 کی صبح کو ہم برٹش ایرویز (147) کے ذریعہ دہلی واپس پہنچے۔ (الرسالہ، مئی 1984)

المعہد العالی الاسلامی

حیدرآباد کے سفر میں 10 دسمبر 2002 کی شام کو یہاں کے المعہد العالی الاسلامی کو دیکھا اور اُس کے بانی مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے ساتھ شام کا کھانا کھایا۔ اس موقع پر کئی لوگ میرے ساتھ تھے — ڈاکٹر شیزان صاحب، عمر عابدین صاحب، عبدالرؤف صاحب، عبدالغفار صاحب، وغیرہ۔ یہ ادارہ 1420ھ میں قائم کیا گیا۔ اس میں مدارس دینیہ کے فارغین کو داخل کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد اُس کے تعارف نامہ میں یہ بتایا گیا ہے: مختلف علوم اسلامی میں افراد کار کی تیاری، زمانہ شناس داعیوں کی تربیت، علما کو انگریزی زبان اور جدید علوم سے باخبر کرنا، تحقیق وتالیف۔

یہ ادارہ ایک پہاڑی کے اوپر قائم کیا گیا ہے۔ یہاں بالکل پُرسکون ماحول ہے۔ فضائی کثافت بھی یہاں تقریباً موجود نہیں۔ تعلیم وتحقیق کے لیے یہ ادارہ اپنے جائے وقوع کے اعتبار سے بہت موزوں ہے۔ اس ادارہ کی جو چیزیں میں نے دیکھیں اُن میں سے ایک اُس کی لائبریری تھی۔ یہ لائبریری بہت جامع اور خوبصورت نظر آئی۔ اس لائبریری کی ایک قابل ذکر بات یہ تھی کہ اُس کی ایک الماری میں ماہنامہ الرسالہ کے تمام شمارے نمبر 1 سے لے کر اب تک مجلد صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ مکمل فائل مسٹر کشن جیونت راؤ پاٹل (ناندیڑ) نے دی ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ المعہد کے مقاصد نہایت اہم ہیں اور عین زمانہ کے مطابق ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ المعہد میں انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا دیں۔ یہاں عربی اور دینی علوم انگریزی زبان میں پڑھائے جائیں۔ طلبہ کو تاکید کی جائے کہ وہ المعہد کے احاطہ میں صرف انگریزی زبان بولیں۔ کوئی اور زبان بولنے کی صورت میں اُن پر جُرمانہ عائد کیا جائے۔

میں نے کہا کہ المعہد کے موجودہ اساتذہ کو بظاہر یہ مشکل معلوم ہوگا۔ وہ سوچیں گے کہ ہم تو انگریزی زبان بہت کم جانتے ہیں۔ پھر ہم انگریزی زبان میں تعلیم کس طرح دیں۔ مگر میرے نزدیک اصل اہمیت زبان جاننے کی نہیں ہے بلکہ اپنے مقصد کے بارے میں مجنونانہ جذبہ کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ سرسیّد احمد خاں انگریزی زبان نہیں جانتے تھے۔ مگر اُنھوں نے ہندستان میں مسلمانوں کا سب سے بڑا انگریزی ادارہ قائم کیا۔ میں نے کہا کہ سرسید کا حال یہ تھا کہ اُنھوں نے ایک انگریز مستشرق کی انگریزی میں لکھی ہوئی سیرت کی کتاب کا جواب دیا تو پہلے اُس کا ترجمہ اردو زبان میں کروایا۔ اسی طرح ایک بار اُنھوں نے "انگریزی" میں تقریر کی۔ یہ انگریزی تقریر اُردو الفاظ میں کاغذ پر لکھ دی گئی تھی۔ پھر اس اُردو تحریر کی مدد سے اُنھوں نے اپنی انگریزی تقریر کی۔

میں نے کہا کہ آج ساری دنیا میں ایسے علما کی ضرورت ہے جو انگریزی زبان میں اسلام کی بات کہہ سکیں۔ میں نے کانفرنسوں میں دیکھا ہے کہ کچھ غیر عالم مسلمان انگریزی میں اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں مگر غیر عالم ہونے کی بنا پر اُن کی نمائندگی صحیح نہیں ہوتی۔ دوسرے مذہبوں میں ایسے علما کثرت سے موجود ہیں۔ مگر مسلمانوں میں ایسے علما کی شدید کمی ہے جو انگریزی زبان میں درست طور پر اسلام کی نمائندگی کرسکیں۔ اگر المعہد اس ضرورت کو پورا کرے تو بلاشبہ یہ اُس کا ایک تاریخی کارنامہ ہوگا۔

المعہد کے کچھ طالب علموں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگ آج ہی سے انگریزی بولنا شروع کر دیجیے۔ میں نے افریقہ کے ایک تاجر کی مثال دی۔ انہوں نے تجارتی ضرورت کے تحت انگریزی بولنا شروع کیا۔ ابتدا میں اُن کی انگریزی بہت غلط ہوتی تھی مگر بعد کو وہ صحیح انگریزی بولنے لگے۔ ابتدائی دور میں اُنھوں نے اس سلسلہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں غلط انگریزی بولتا ہوں تا کہ مجھے صحیح انگریزی بولنا آجائے:

I speak incorrect English, so that I may be able to speak correct English.

میں نے کہا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے لامحدود صلاحیت دی ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ منصوبہ بند اور منظّم انداز میں اپنی صلاحیت کو برروئے کار لانے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ میں میں نے مالیگاؤں کے مولانا انیس لقمان ندوی کی مثال دی۔ وہ ماشاء اللہ بیک وقت عربی اور انگریزی دونوں زبان روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ ایسا کیوں کر ممکن ہوا۔ اُس کا راز یہ ہے کہ اُنھوں نے خود اپنے گھر کو تربیت گاہ بنا دیا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ ہمیشہ انگریزی میں بولتے تھے اور اپنے برادر نسبتی کے ساتھ ہمیشہ عربی میں۔ اس طرح اُنھوں نے خود اپنے گھر میں دونوں زبان میں بولنے کی عمدہ مشق پیدا کرلی۔ یہی طریقہ ہر نوجوان اپنے حالات کے اعتبار سے استعمال کرسکتا ہے۔ (الرسالہ، مارچ 2002)

اختلاف ایک علمی روش

ابن القیم نے اپنی کتاب مدارج السالکین (جلد 2، صفحہ 52) میں اپنے استاذ شیخ ابن تیمیہ سے اختلاف کیا ہے۔ پھر اپنی اس روش کو درست قرار دینے کے لیے لکھا ہے کہ ہدہد اور اللہ کے نبی سلیمان کے درمیان درجہ کے اعتبار سے کتنا زیادہ فرق ہے۔ اس کے باوجود قرآن کے مطابق، ہدہد نے سلیمان سے کہا کہ میں ایک ایسی بات جانتا ہوں جو آپ کو معلوم نہ تھی (27:22)۔ چنانچہ شیخ الاسلام اللہ کے نبی سے زیادہ بڑے عالم نہیں۔ اور شیخ الاسلام پر اعتراض کرنے والا ہدہد سے زیادہ کم علم نہیں: فَكَمْ بَيْنَ الْهُدْهُدِ وَنَبِيِّ اللّٰهِ سُلَيْمَانَ؟ وَهُوَ يَقُولُ لَهُ: أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ (النمل)۔ وَلَيْسَ شَيْخُ الْإِسْلَامِ أَعْلَمَ مِنْ نَبِيِّ اللّٰهِ۔ وَلَا الْمُعْتَرِضُ عَلَيْهِ بِأَجْهَلَ مِنْ هُدْهُدٍ۔ (ڈائری، 6 جون 1997)

ایک سفر

اپریل 1969 میں میں نے پہلی بار اَلور (راجستھان) کا سفر کیا تھا۔ اس کے بعد وہاں کے کئی سفر ہوئے۔ اس کا تفصیلی تذکرہ "میوات کا سفر" نامی کتاب میں موجود ہے۔ الور کا موجودہ سفر 20 مئی 1989 کو ہوا، اور 25 مئی کو دوبارہ دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) میں الور کے تذکرہ کے تحت درج ہے کہ یہاں، دوسری تاریخی عمارتوں کے علاوہ کئی قدیم مسجدیں بھی پائی جاتی ہیں:

It contains..... several ancient mosques (Vol. 1, p. 285)

مگر یہ بیان صحیح نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ 1947 تک الور میں ایک سو سے زیادہ تعداد میں پُر رونق مسجدیں موجود تھیں۔ مگر یہ سب مسجدیں آزادی کے بعد ہونے والے فسادات کی نذر ہو گئیں۔ اب یہاں صرف دو باقاعدہ مسجدیں ہیں جو آزادی کے بعد کے دور میں ازسرِنو تعمیر کی گئی ہیں۔ ایک، مدرسہ اشرف العلوم کی مسجد، دوسرے، میو بورڈنگ کی مسجد۔ ان کے علاوہ ایک قدیم چھوٹی سی مسجد ہے جہاں ایک "شرنارتھی" خاندان آباد ہے۔

مولانا محمد ابراہیم صاحب اور مولانا مفتی جمال الدین صاحب 1949 میں دوبارہ الور میں آئے۔ موجودہ جگہ اس وقت چٹیل میدان کی صورت میں تھی۔ صرف کچھ ٹوٹے ہوئے پتھر اس بات کی علامت تھے کہ یہاں کبھی کوئی عمارت یا کوئی مسجد کھڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک چھپر ڈال کر یہاں تعمیرِ نو کا آغاز کیا۔

میں پہلی بار اپریل 1969 میں الور آیا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ مولانا ابراہیم صاحب ایک نیم کے درخت کے نیچے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور دور چُھپے ہوئے مستقبل کو تصوراتی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ 30 برس بعد آج یہاں دوبارہ ایک پورا ادارہ کھڑا ہو گیا ہے۔ مسجد اور مدرسہ کی شکل میں اسلامی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اس

علاقے میں چونکہ یہ واحد اسلامی ادارہ ہے، اس لیے اطراف کے مسلمان اس سے جڑ گئے ہیں: ہر بربادی کو دوبارہ آبادی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بربادی آخری بربادی نہیں۔

21 مئی کی شام کو مدرسہ میں کچھ مقامی تعلیم یافتہ اصحاب جمع ہو گئے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے موضوع پر گفتگو ہونے لگی۔ میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمان تعلیم میں پیچھے ہو گئے ہیں۔ ہمارے رہنما اس کی ذمہ داری انگریزوں کی سازش اور ہندوؤں کے تعصب پر ڈالتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک اس کی تمام تر ذمہ داری خود مسلم رہنماؤں کے اوپر ہے۔

موجودہ زمانہ میں ملک کے اندر بے شمار اسکول اور کالج کھلے۔ انھیں عیسائیوں اور ہندوؤں نے قائم کیا تھا۔ مگر مسلمان تحفظ کے ذہن کے تحت اس سے دور رہے۔ انہوں نے کہا کہ دوسری قوموں کی طرف سے ہمارے اوپر تہذیبی حملہ ہو رہا ہے، ہمیں اس سے بچاؤ کی فکر کرنا چاہیے۔ بہت سے لوگوں نے ان اسکولوں اور کالجوں کو مسلمانوں کے لیے "قتل گاہ" بتایا۔ اکبر الہ آبادی نے ان پر طنز کرتے ہوئے کہا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

یہ فکر میرے نزدیک سراسر لغو تھا۔ بعد کے تجربات بتاتے ہیں کہ انھیں اسکولوں اور کالجوں سے بے شمار لوگ ہماری دینی جماعتوں کو ملے۔ اگر یہ ادارے واقعۃً قتل گاہ ہوتے تو یہ تمام لوگ ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے قتل ہو چکے ہوتے، پھر وہ ہماری دینی جماعتوں کو کیسے ملتے۔

میں نے کہا کہ اصل مسئلہ تحفظ اور بچاؤ کا نہ تھا بلکہ جوابی فکری اقدام کا تھا۔ ضرورت یہ تھی کہ اسلام کی تعلیمات کو جوابی نظریہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے اور مسلمانوں کی نئی نسلوں میں اسلام پر اتنا یقین اور حوصلہ پیدا کر دیا جائے کہ وہ جدید تہذیبی حملوں کے مقابلہ میں پُرعزم طور پر ٹھہر سکے۔

میں نے کہا کہ ہمیں ملک کے تعلیمی نظام سے کٹنا نہیں تھا، بلکہ اپنی نسلوں کو ان اداروں میں پڑھاتے ہوئے ان کی ذہنی تعمیر کا کام کرنا تھا۔ اس طرح کے کام کی ایک مثال تبلیغی جماعت ہے۔ تبلیغی جماعت کا کام اگرچہ خالص روایتی انداز میں چل رہا ہے، مگر اپنی حقیقت

کے اعتبار سے وہ یہی ہے۔ وہ فکر کا جواب فکر سے دیتی ہے۔ مادی تہذیب کے پرستاروں کا کہنا تھا کہ "چیزوں سے ہوتا ہے" اس کے جواب میں تبلیغ نے کہا کہ "چیزوں سے نہیں خدا سے ہوتا ہے" یہ گویا ایک نظریہ کے جواب میں دوسرا نظریہ تھا۔ اس جوابی نظریہ نے بہت سے زیرِ تعلیم نوجوانوں کو متاثر کیا اور وہ مادی فکر سے کٹ کر دینی فکر سے جڑ گئے۔

یہاں کی مسجد دوبارہ زیادہ بہتر اور وسیع انداز میں تعمیر کی جارہی ہے۔ 25 مئی کو صبح روانگی سے پہلے میں مسجد کے اندرونی حصہ میں کھڑا ہوا اس کی تعمیرات کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ قدیم مسجد پہلی بار 1947 میں مکمل طور پر ڈھادی گئی تھی۔ اس کے بعد اس کی نئی تعمیر ہوئی۔ یہ نئی تعمیر بھی دوبارہ 1988 میں پوری کی پوری ڈھادی گئی۔

میں نے سوچا کہ "ڈھانے" کے اعتبار سے 1947 کا واقعہ اور 1988 کا واقعہ، دونوں بظاہر یکساں ہیں۔ مگر نوعیت کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ پہلا واقعہ دشمنوں نے کیا تھا، دوسرا واقعہ دوستوں نے کیا ہے۔ پہلا انہدام مسجد کو ختم کرنے کے لیے تھا، دوسرا انہدام مسجد کو ازسرنو زیادہ بہتر بنانے کے لیے۔ اس دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو چیزوں کی شکل بظاہر یکساں ہوتی ہے۔ مگر دونوں کی حقیقت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جو لوگ اس راز کو نہ جانیں، وہ کبھی اس دنیا میں کامیاب روش اختیار نہ کرسکیں گے۔

جس مدرسہ میں میرا قیام تھا، اس سے ریلوے اسٹیشن قریب ہے۔ یہ سفر میں نے بالقصد سائیکل رکشہ کے ذریعہ کیا۔ اسٹیشن پہنچ کر رکشہ والے سے کرایہ پوچھا تو اس نے دو روپیہ بتایا۔ میں نے فوراً اس کو دو روپیہ دیا اور اسٹیشن میں داخل ہوگیا۔ یہاں مدرسہ کے لوگوں سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ہم نے رکشہ والے کو کرایہ کی رقم ادا کردی تھی۔ اس قصہ کو سن کر مدرسہ کے ایک استاد حافظ محمد اسماعیل صاحب (35 سال) بولے: دو روپیہ لے جانے سے کون سا اس کا رکشہ چلانا چھوٹ جائے گا، چلائے گا تو وہ رکشہ ہی۔

ہماری ٹرین (سپر فاسٹ اکسپریس) الور اسٹیشن پر پہنچی تو وہ پندرہ منٹ لیٹ تھی۔ مگر دہلی

پہنچتے پہنچتے وہ پورے ایک گھنٹہ لیٹ ہوگئی۔ اس کی وجہ ایک مسافر نے اپنے لفظوں میں اس طرح بتائی: لیٹ ہونے کے بعد پٹتی جاتی ہے گاڑی۔ جوٹرین ایک بار لیٹ ہوجائے تو اس کو مزید لیٹ ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ریلوے کا اصول یہ ہے کہ جوٹرین اپنے صحیح وقت پر چل رہی ہو اس کو پہلے راستہ دیا جائے۔ اور جوٹرین لیٹ ہوگئی ہو اس کو روک دیا جائے۔ چنانچہ آگے سے آنے والی ٹرین کو راستہ دینے کی خاطر ہماری ٹرین بار بار درمیانی اسٹیشنوں پر روکی جاتی رہی۔ اس طرح ایسا ہوا کہ جو گاڑی ابتداء میں پندرہ منٹ لیٹ تھی وہ آخر میں ایک گھنٹہ لیٹ ہوگئی۔

یہی وسیع تر زندگی کا معاملہ ہے۔ جو زندگی کی دوڑ میں ایک بار پیچھے ہوجائے وہ مزید پیچھے ہوتا چلا جائے گا، خواہ اس نے اپنی سواری کا نام ''سپر فاسٹ'' کیوں نہ رکھ لیا ہو۔

(الرسالہ، ستمبر 1989)

ذہنی صلاحیت

حافظہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس سے ہر بات آدمی کو یاد ہوجائے، یعنی تصویری حافظہ (photographic memory)۔ دوسری قسم حافظہ کی وہ ہے جس کو الذاکرۃ الانتقائیہ (selective memory) کہا جاتا ہے۔ علمی اعتبار سے دوسری قسم کے حافظہ کی اہمیت زیادہ ہے۔ کیوں کہ حقیقی عالم وہ ہے جس کے اندر تجزیہ اور تحلیل (analysis) کی صفت ہو۔

کسی عالم سے ایک بار کہا گیا کہ فلاں شخص نے پوری صحیح بخاری حفظ کرلی ہے۔ یہ سن کر وہ کچھ دیر چپ رہے۔ اس کے بعد سنجیدگی کے ساتھ کہا کہ ہاں، شہر میں بخاری کا ایک نسخہ اور بڑھ گیا: زَادَتْ نُسْخَةٌ فِي الْبَلَدِ۔

(ڈائری، 10 جنوری 1996)

انٹرویو، سوال و جواب

مطالعہ کے بغیر انسانی شخصیت کی تکمیل ممکن نہیں

س : انسانی زندگی میں آپ مطالعہ کو کیا اہمیت دیتے ہیں؟

ج : انسانی زندگی میں مطالعہ کی اہمیت بے حد بنیادی ہے۔ غذا اگر جسمانی وجود کے لیے ضروری ہے تو مطالعہ ذہنی وجود کے لیے۔ مطالعہ کے بغیر انسانی شخصیت کی تکمیل ممکن نہیں۔

س : آپ کے اندر مطالعہ کا شوق کب اور کیسے پیدا ہوا؟

ج : میں جس خاندان میں پیدا ہوا وہاں مطالعہ، خاص طور پر ادبی مطالعہ کا رواج پہلے سے موجود تھا۔ اس لیے بچپن ہی سے میرے اندر مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا۔ تاہم باقاعدہ شعور کے طور پر میرے اندر مطالعہ کا ذوق اس وقت پیدا ہوا جب میں نے سر جیمز جینز (Sir James Jeans, 1877-1946) کی کتاب پڑھی۔ اس کتاب نے میرے سامنے مطالعہ کی نئی دنیا کھول دی۔

س : مطالعہ کی غرض کیا رہی ہے؟

ج : میرے مطالعہ کی غرض خاص طور پر دو رہی ہے — اسلام کو اس کے اصل ماخذ اور قدیم علمائے اسلام کے ذریعہ سمجھنا، اور دوسرے، اسلام کے خلاف جدید فکری چیلنج کو براہِ راست ذرائع سے معلوم کرنا۔ پھر اس مطالعہ کی روشنی میں اسلام کے تعارف پر اور جدید فکری چیلنج کے رد میں کتابیں تیار کرنا۔

س : آپ نے کس قسم کی کتابوں سے مطالعہ کا آغاز کیا؟

ج : ابتداءً میں زیادہ تر ادبی کتابیں پڑھتا تھا۔ اس کے بعد مدرسہ کی تعلیم کے نتیجہ میں اسلامی کتابیں پڑھنے لگا۔ اور اس کے بعد جدید الحاد سے تعلق رکھنے والی کتابوں کو پڑھنا شروع کیا۔

س : آپ کے مطالعہ کی رفتار کیا ہے؟

ج : میرا مطالعہ اور تحریر دونوں ساتھ ساتھ جاری رہتے ہیں۔ اس لیے مطالعہ کی مقداری رفتار متعین کرنا مشکل ہے۔ میں رات دن بس پڑھتا ہی رہتا ہوں۔ اور دورانِ مطالعہ جب کوئی مضمون ذہن میں آتا ہے تو اس کو لکھ لیتا ہوں۔

س : کن زبانوں کی کتابیں آپ کے مطالعہ میں رہتی ہیں؟

ج : عام طور پر میں عربی، انگریزی اور اردو کتابیں پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی فارسی اور ہندی کتاب یا مضمون بھی پڑھتا ہوں۔

س : آپ کے مطالعہ کا وقت کیا ہوتا ہے؟

ج : میرے مطالعہ کا مقرر وقت نہیں۔ اپنے تمام وقت کو میں مطالعہ ہی میں صرف کرتا ہوں۔ مطالعہ میری ذہنی خوراک ہے۔

س : مطالعہ کے ابتدائی دور میں آپ کو کس قسم کی ذہنی وفکری کیفیت سے سابقہ پیش آیا ہے؟

ج : مطالعہ ابتداءً میرے لیے ذہنی تفریح کے ہم معنی تھا۔ اس کے بعد وہ تلاشِ حق کا ہم معنی بنا۔ اب مطالعہ میرے لیے خدمتِ اسلام کا وسیلہ ہے۔

س : آپ کے اپنے موضوع یا موضوعات کی اول درجے کی کتابیں آپ کی نظر میں کون سی ہیں؟

ج : کسی موضوع کے تاریخی ماخذ کے طور پر تو مجھے بہت سی کتابیں اول درجہ کی نظر آئیں۔ مثلاً تفسیر میں محمد بن احمد بن ابو بکر القرطبی (وفات 1273ء) کی الجامع لاحکام القرآن، علم حدیث میں ابن حجر عسقلانی (وفات 1449ء) کی فتح الباری، سیرت میں سیرۃ ابن کثیر، وغیرہ۔ اسی طرح جدید ذہن کو سمجھنے کے لیے برٹش فلاسفر برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell, 1872-1970) کی کتاب ہیومن نالج (Human Knowledge)۔ مگر اسلام کو سائنٹفک اسلوب اور جدید فکری مستوی پر پیش کرنے کے لیے کوئی بھی کتاب مجھے اول درجہ کی نظر نہیں آئی۔

س : کیا کسی موضوع پر تقابلی مطالعہ کا بھی آپ کو موقع مل سکا ہے؟

ج : تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں خاص طور پر میں نے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔

س : تقابلی مطالعہ میں کن باتوں کو پیش نظر رکھنا آپ ضروری سمجھتے ہیں؟

ج : تقابلی مطالعہ کو کامیاب بنانے کی دو لازمی شرطیں ہیں: گہرا مطالعہ، اور موضوعیت۔

س : ریسرچ اور تحقیق کے لیے مطالعہ میں کن باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں؟

ج : علمی ریسرچ کے لیے ضروری ہے کہ جس موضوع کا مطالعہ پیش نظر ہے، اس کی براہِ راست کتابوں کو پڑھا جائے اور جو کچھ پڑھا جائے غیر جانبدارانہ ذہن کے تحت پڑھا جائے۔

س : تصنیف و تالیف کا کام کرنے والوں کو مطالعہ میں کن باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے؟

ج : کسی مصنف کی تصنیف کو اس کے مطالعہ کا نتیجہ ہونا چاہیے، نہ کہ تصنیف ہی مطالعہ کا محرک ہو۔

س : آپ کے مطالعہ کا کیا طریقہ ہوتا ہے؟

ج : مجھے علم سے دلچسپی ہے۔ میں ہر اس کتاب کو پڑھتا ہوں جو علمی اسلوب میں لکھی گئی ہو۔

س : حاصل مطالعہ کو محفوظ رکھنے کے لیے آپ کیا تدابیر اختیار کرتے ہیں؟

ج : حاصل مطالعہ کو محفوظ رکھنے کے لیے میں: قَيِّدُوا الْعِلْمَ بِالْكِتَابَةِ (علم کو لکھ کر محفوظ کرو) پر عمل کرتا ہوں۔ حافظہ خواہ کتنا ہی اچھا ہو وہ ہر گز کتاب کا بدل نہیں ہے۔

س : کیا آپ دوران مطالعہ کتاب کے اہم جملوں یا پیراگراف کو نشان زد بھی کرتے ہیں؟

ج : اگر ذاتی کتاب ہو تو مطالعہ کے دوران میں ضروری نشانات کرتا رہتا ہوں۔ مگر لائبریری کی کتابوں پر نشانات لگانا مجھے پسند نہیں۔

س : سفر میں آپ کس طرح کی کتابیں پڑھتے ہیں؟

ج : سفر میں زیادہ تر میں اخبار یا رسالہ جیسی ہلکی پھلکی چیزیں پڑھتا ہوں۔

س : کیا آپ مطالعہ برائے تفریح یا مطالعہ برائے وقت گزاری کو بھی روا رکھتے ہیں اور اگر روا رکھتے ہیں تو کس حد تک؟

ج : تفریح یا وقت گزاری کے لیے مطالعہ اس شخص کو روا ہے جو سنجیدہ مطالعہ نہ کر سکتا ہو۔

س : آپ کے پسندیدہ موضوعات کیا ہیں؟ ترجیحی ترتیب کے ساتھ۔

ج : میرے پسندیدہ موضوعات یہ ہیں: تمام اسلامی موضوعات، اور تمام مخالفِ اسلام موضوعات۔

س : ادب میں آپ کس نظریے کے حامی ہیں؟

ج : ادبی مطالعہ سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کو میں صرف ضیاعِ وقت سمجھتا ہوں۔

س : ایک ادیب یا شاعر کی زندگی میں آپ مطالعہ کو کیا اہمیت دیتے ہیں؟

ج : ادیب یا شاعر کو صرف یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ ادب یا شاعری کو چھوڑ دے۔

س : وہ کون سی کتابیں ہیں، جنہیں آپ اپنی پسندیدہ کتابوں میں شمار کرتے ہیں اور اس کی پسندیدگی کے اسباب کیا ہیں؟

ج : تاریخی ماخذ کے طور پر مجھے بہت سی کتابیں پسند ہیں۔ مگر جدید علمی اسلوب میں اسلام کی ترجمانی کرنے کے لیے جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے کوئی کتاب مجھے پسند نہیں۔

س : آپ کے پسندیدہ مصنفین کون کون سے ہیں؟ وجہ پسندیدگی پر بھی روشنی ڈالیے؟

ج : دورِ جدید کے مسلم مصنفین میں سے کوئی مصنف مجھے پسند نہیں۔ ان میں سے کسی کی کتاب میرے نزدیک (جدید) علمی اسلوب پر نہیں ہے۔

س : آپ کو سب سے زیادہ کس مصنف نے متاثر کیا؟

ج : مجھے سب سے زیادہ میرے شعورِ فطرت نے متاثر کیا۔ میرے نزدیک سب سے بڑی کتاب فطرت کی کتاب ہے۔

س : آپ کے پسندیدہ ادیب و شاعر کون کون سے ہیں؟ انہیں دوسروں کے مقابلے میں آپ کیوں ترجیح دیتے ہیں؟

ج : مجھے کوئی ادیب یا شاعر پسند نہیں۔ ادب اور شاعری کو میں ایک فطری صلاحیت کا غلط استعمال سمجھتا ہوں۔

س : کیا آپ کو اجتماعی مطالعہ کا موقع میسر آتا ہے؟

ج : اجتماعی مطالعہ کا ذوق میرے اندر نہیں ہے۔

س : آپ کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں یا دوسروں کی کتابوں اور لائبریریوں سے استفادہ کرتے ہیں؟

ج : میں حسب مقدور کتابیں خریدتا ہوں، ورنہ دوسروں سے یا لائبریری سے مستعار لے کر پڑھتا ہوں۔

س : کیا آپ کی کوئی ذاتی لائبریری بھی ہے؟ اسے درست رکھنے کے لیے آپ کیا صورت اختیار کرتے ہیں؟

ج : میری ذاتی لائبریری ہے۔ اس کو درست رکھنے کے لیے میں یہ کرتا ہوں کہ ہر کتاب کو اس کی متعین جگہ پر رکھتا ہوں۔

س : مطالعہ کے تعلق سے اپنا کوئی خاص تجربہ؟

ج : مطالعہ کے سلسلہ میں میرا تجربہ یہ ہے کہ آدمی لکھنے سے زیادہ پڑھنے پر دھیان دے۔ ذاتی طور پر میری تحریر میرے مطالعہ کا حاصل (by-product) ہوتی ہے۔

س : مطالعہ کے شائقین کے لیے اگر کوئی تجویز یا مشورہ ہو تو پیش فرمائیں؟

ج : تمام بہترین کتابیں سنجیدہ اسلوب میں ہوتی ہیں۔ اس لیے مطالعہ کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی سنجیدہ مطالعہ کا ذوق اپنے اندر پیدا کرے۔ سطحی چیزوں کا مطالعہ آدمی کے اندر سطحی مزاج پیدا کرتا ہے، اور گہری چیزوں کا مطالعہ اس کے اندر گہرے فکر کی پرورش کرتا ہے۔ مطالعہ کا مقصد صرف واقفیت میں اضافہ نہیں، بلکہ بصیرت میں اضافہ ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے: یک من علم را دہ من عقل می باید (ایک حصہ علم کے لیے دس حصہ عقل کی ضرورت ہوتی ہے)۔ بصیرت کے بغیر علم سے حقیقی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

(بحوالہ: میرا مطالعہ، مرتب تابش مہدی، نئی دہلی، 1995، صفحات 212-209)

ایک انٹرویو

زیر نظر انٹرویو مسٹر یوگندر سکند (پیدائش 1967) نے 10 اگست 2007 کو لیا تھا۔ اس کی ریکارڈنگ بھی ہوئی تھی، جو سی پی ایس سینٹر میں موجود ہے۔

س: آپ مدارس کے نظام کو کس طرح دیکھتے ہیں؟ اس وقت مدارس کے نصاب ونظام میں اصلاح کی ضرورت کی بات ہو رہی ہے؟

ج: بعض دوسرے لوگوں کی طرح میں مدارس کا مخالف یا اس کا ناقد نہیں ہوں۔ مسلمانوں کو مذہبی اور سیکولر دونوں نظام ہائے تعلیم کی ضرورت ہے۔ مسلم بچوں کو دونوں طرح کے مضامین کی واقفیت ہونی چاہیے۔ لیکن تمام مسلم طلبہ کے لیے یہ مطلقاً ضروری نہیں کہ وہ کل وقتی طور پر مدرسہ جا کر عالم بننے کی تربیت حاصل کریں۔ البتہ اتنا ضروری ہے کہ سماج کا ایک طبقہ علم دین حاصل کرے تاکہ مذہبی تعلیم کے حصول کی روایت باقی رہے۔ ہمیں مدارس کے تربیت یافتہ ایسے علما کی ضرورت ہے جو قرآن، حدیث، فقہ اور عربی زبان کے واقف کار ہوں۔ جہاں تک مدارس میں اصلاح کی ضرورت کا سوال ہے حقیقت یہ ہے کہ میں مدارس کی جدید کاری میں یقین نہیں رکھتا۔ آپ قرآن وحدیث کی جدید کاری نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس سیاق میں جدید کاری یا جدت پسندی کی بات بالکل بے محل اور غیر ضروری ہے۔ جدید کاری کے تعلق سے میں کہنا چاہوں گا کہ ہمارے جدید اسکول اور یونیورسٹیوں میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس نکتے کو وہ لوگ جو مدارس میں اصلاح کے زبردست طور پر حامی ہیں، فراموش کر دیتے ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تعلیم کا کوئی بھی نصاب ہر طرح سے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ نصاب سے زیادہ اہمیت اس کو پڑھانے والے کی ہے۔ اس لیے کہ کتابیں نہیں پڑھاتیں، اساتذہ پڑھاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مدارس میں فلسفے اور منطق کی صدیوں پرانی

یونانی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یونیورسٹیز کے انگریزی شعبے میں بھی صدیوں سال پہلے کی لکھی ہوئی کلاسیکل کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔میری نظر میں نصاب کا مسئلہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔اصل مسئلہ باصلاحیت اور ذمہ دار اساتذہ کا ہے۔ہمیں اصلاًان کی ضرورت ہے۔

س : تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مدارس کے طلبہ کو جدید مضامین سے روشناس کرانے کی ضرورت نہیں ہے؟

ج : میری تجویز یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے علاحدہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے جانے چاہئیں جہاں مدارس کے طلبہ فراغت کے بعد جدید مضامین کی تعلیم حاصل کرسکیں۔خاص طور پر مختلف زبانیں جیسے انگریزی، ہندی، وغیرہ۔خود میں نے ایک روایتی مدرسے میں تعلیم مکمل کی اور پھر اپنے طور پر انگریزی سیکھی اور دوسرے جدید مضامین پڑھے۔میرا خیال ہے کہ مدارس کے نصاب کے ساتھ ساتھ اگر مدارس کے طلبہ کو جدید مضامین پڑھنے پر مجبور کیا جائے تو بلاشبہ یہ ان پر بوجھ بن جائے گا جسے وہ نہیں اٹھا پائیں گے۔اس سے مدرسے کا تعلیمی نظام بکھر جائے گا۔

س : حالیہ دنوں میں مدارس کے فارغ طلبہ کے لیے اس طرح کے ادارے جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے، قائم کیے گئے ہیں، آپ اس ظاہرے کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟

ج : میری نظر میں یہ نہایت خوش آئند قدم ہے۔ اگرچہ اسے مزید منظم انداز میں کیا جانا چاہیے۔اس طرح کے اداروں میں بہر حال ایسے اساتذہ کی کمی ہے جو پوری اسپرٹ کے ساتھ تدریسی ذمہ داری نبھانے پر کمربستہ ہوں۔ ہمارے دور میں مدرسۃ الاصلاح میں ایسے اساتذہ تھے۔انہوں نے ہمارے اندر تلاش وتجسس کی روح پیدا کی۔تلاش وتجسس کی یہی روح اصل میں علم ومعرفت کی بنیاد ہے، اس کے بغیر کوئی شخص تعلیم کی راہ پر ترقی نہیں کرسکتا۔اس روایت کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔اس وقت ہمارے پاس

مدارس کے اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے کوئی ادارہ نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اساتذۂ مدارس کو تعلیم و تربیت اور اس سے متعلقہ امور کی ٹریننگ دی جائے۔ میرے خیال میں یہ ایک اہم اِشو ہے جس پر مسلم تنظیموں کو توجہ دینی چاہیے۔

س : مدرسہ کے فارغ علما اور یونیورسٹی کے تربیت یافتہ دانش وروں کے درمیان جو شدید دوئی اور ثنویت پیدا ہوگئی ہے، آپ کی رائے میں اسے کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے؟

ج : میرے بچپن میں یہ دوئی اتنی واضح نہیں تھی۔ اس وقت سیکولر تعلیم گاہیں اخلاقی اقدار سے اس قدر دور نہیں تھیں۔ لیکن اب صورتحال بہت زیادہ افسوسناک ہے۔ دونوں طبقوں کے درمیان اس دوئی اور کھائی کو دور کرنے اور پاٹنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں نظام تعلیم کے طلبہ واساتذہ کے درمیان خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، زیادہ سے زیادہ اختلاط اور میل جول ہو۔ ماضی میں ایسا ہوتا تھا۔ بہت سے ہندو مدرسوں میں پڑھتے تھے، لیکن اب ایسا نہیں ہوتا۔ چونکہ اب ان دونوں طبقوں کے درمیان اس نوع کا میل ملاپ اور باہمی قربت باقی نہیں رہی، اس لیے ان دونوں کے اندر مفاہمت کی کمی پائی جاتی ہے۔

س : بعض علما آپ کی اس رائے پر چیں بہ جبیں ہوں گے اور کہیں گے کہ اس طرح کے میل جول سے مدرسہ کے طلبہ کی مذہبی نفسیات پر برا اثر مرتب ہوگا۔ اس تعلق سے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج : مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ حضرت عمر فاروق کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ہر کسی سے سیکھتے تھے اور ان کا یہ سیکھنا مختلف قسم کے لوگوں سے میل جول کے ذریعہ ہوتا تھا۔ دوسروں کے ساتھ میل جول کے ذریعہ آپ اپنی اخلاقیات کو مزید بہتر بنا سکتے ہیں۔ نیز اس کے ذریعہ آپ دوسرے لوگوں کی صحیح شناخت اور ان کا احترام بھی کر سکتے ہیں۔ مدارس اور ان کے طلبہ کو دوسروں کے ساتھ میل ملاپ پر مائل کرنے اور ان کو مدرسہ کی چہار دیواری سے باہر نکالنے کا سب سے اہم طریقہ یہ ہے ان کے اندر مشنری اسپرٹ بھر

دی جائے۔اس مقصد کے لیے مدارس کی طرف سے کانفرنسیں اور سیمینار منعقد کیے جائیں جن میں مدارس اور یونیورسٹیز کے لوگوں کو، جن میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل ہوں، بلایا جائے۔ یہ طریقہ دونوں طرف معلومات کے دروازے کو کھولنے اور باہمی غلط فہمیوں کو دور کرنے کا زبردست ذریعہ ہوگا۔

خود میری مثال لیجیے! میں روزانہ مختلف مذاہب اور سماجی پس منظر کے لوگوں سے ملتا ہوں۔ میں اسے اللہ کی نعمت سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس عمل کے ذریعہ میں مختلف طرح کی معلومات، دوسروں کے تعلق سے انسانی جذبۂ یکانگت، نئے تجربات اور اخلاقی اقدار سیکھتا اور حاصل کرتا ہوں۔

س : آپ کے خیال میں اہل مدارس اور علما بین مذاہبی مکالمے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

ج : میرے خیال میں وہ اس تعلق سے نہایت مرکزی کردار ادا کر سکتے ہیں۔لیکن بدقسمتی سے وہ اس میں مشغول نہیں ہیں۔ مدارس کو غیر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ میل جول کے فائدے کا احساس نہیں ہے۔میرا خیال ہے کہ اس سے طلبہ پر منفی اثر پڑنے کے بجائے ان پر مثبت اثر پڑے گا اور اس سے ان کی مذہبیت کو مزید تقویت حاصل ہوگی۔

اس سلسلے میں میں مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک شاگرد کا واقعہ سنانا چاہوں گا۔انہوں نے مولانا سے اپنے لڑکے کی مذہب سے بیگانگی کی شکایت کی۔مولانا تھانوی نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اس لڑکے کو عیسائی اسکول میں بھیج دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اس کے نتیجے میں وہ لڑکا ایک باعمل مسلمان بن گیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں اس لڑکے کو مذہب کے تعلق سے مستقل چیلنج درپیش تھا۔اس کے عیسائی ساتھی اس سے اسلام سے متعلق سوالات کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس کو اسلام کے متعلق پڑھنا پڑا۔ اسی طرح ان لوگوں نے اس سے نماز کے بارے میں سوال کیا تو اس کے دل میں نماز پڑھنے کا داعیہ پیدا ہوا اور وہ اس کا پابند ہوگیا۔

اس حوالے سے میں خود اپنی ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ تقریباً نصف صدی قبل جب میں لکھنؤ میں تھا، تو میری ایک ہندو اسکالر سے ملاقات ہوئی، جو ملحد تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر حضرت محمد کو تاریخ سے ہٹا دیا جائے تو اس سے دنیا کی تاریخ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ میں اس کے اس بیان سے بالکل نہیں بھڑکا۔ اس کے بجائے میں نے اس جملے کو ایک چیلنج کے طور پر لیا۔ اس کے بعد میرے ذہن میں ایک خاص طرح کا فکری عمل شروع ہو گیا۔ مسلمان رسول اللہ کو آخری پیغمبر اور پوری انسانیت کے لیے ایک نمونہ تصور کرتے ہیں۔ مذکورہ شخص کے اس جملے نے مجھے مجبور کیا کہ میں رسول اللہ کے تاریخی رول کا مختلف کتابوں کے حوالے سے مطالعہ کروں۔ اس مطالعہ کا نتیجہ میری کتاب "اسلام دورِ جدید کا خالق" کی شکل میں سامنے آیا۔ حقیقت میں یہ کتاب ایک ملحد شخص کے ساتھ انٹرایکشن کا ثمرہ ہے۔ اگر میری اس شخص سے ملاقات نہیں ہوتی تو میں متعلقہ موضوع کے مطالعہ پر آمادہ بھی نہ ہوتا۔ بہر حال اس حوالے سے میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کے ساتھ اختلاط سے خطرے کا جو تصور ہے، وہ بالکل بے بنیاد ہے۔ جو لوگ اس خطرے کے احساس سے دو چار ہیں، وہ اس چیلنج کی قدر و قیمت کو نہیں سمجھ رہے ہیں، جو اس اختلاط اور میل جول کی دَین ہے۔ یہ میل جول بجائے خود تعلیم ہی کی ایک شکل اور ذریعہ ہے۔ اگر مدارس کے لوگوں کا دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ میل جول ہو تو میرے خیال میں ہندستان میں اس سے ہندو — مسلم تعلقات کے باب میں کافی فائدہ حاصل ہوگا۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ میل جول کو فروغ دینا علما کی ذمہ داری ہے؟ لیکن اگر علما میل جول میں دلچسپی نہ لیتے ہوں تو؟

ج: میں مدرسوں کو اس کا الزام نہیں دے رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ دوسروں کے درمیان اسلام کا تعارف پیش کرنا یہ باہمی میل جول پر منحصر ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع

پر ہزاروں لوگوں کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں اللہ کا ایک پیغام لے کر مبعوث ہوا ہوں۔ تم لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ تم لوگ میرے بعد اسے پوری انسانیت تک عام کر دو (صحیح البخاری، حدیث نمبر 67)۔ چنانچہ اس کے بعد آپ کے اصحاب کی بڑی تعداد تبلیغ و ارشاد کے لیے مکہ و مدینہ کو چھوڑ کر اس سے متصل علاقوں میں چلی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ اور مکہ میں اصحاب رسول کی بہت کم قبریں ہیں۔

س: علما کی طرف سے دوسروں کے ساتھ تعامل میں سب سے بڑی رکاوٹ زبان کا مسئلہ ہے۔ علما کی اکثریت اردو کے علاوہ دوسری زبان سے واقف نہیں ہے۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ یہ اس سلسلے کی ایک بڑی مشکل ہے؟

ج: جہاں چاہ وہاں راہ۔ میں نے انگلش اور ہندی خود سے سیکھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر مدارس کے فارغین صحیح عزم سے کام لیں تو وہ بالکل سیکھ سکتے ہیں۔ جب ایک شخص دوسروں سے میل قائم کرتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ اس کی زبان بھی سیکھتا جاتا ہے اور ان کی تہذیب وروایت سے بھی اس کی آشنائی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

س: مدارس کے بہت سے طلبہ و اساتذہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے بارے میں غلط تصورات رکھتے ہیں۔ اس معاملے سے کس طرح نمٹنا چاہیے؟

ج: اس طرح کی ذہنیت دونوں طرف پائی جاتی ہے۔ میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ باہمی تعامل (interaction) کی کمی ہے۔ مثبت تعامل منفی ذہنیت کو ختم کر دیتی ہے۔ اگر کسی ہندو کا کسی مسلمان سے تعلق یا دوستی نہیں ہے، اس نے صرف مسلمانوں کے بارے میں میڈیا کے حوالے سے پڑھا اور جانا ہے، تو مسلمانوں کے بارے میں اس کا تصور نہایت غلط ہوگا۔ دوسری صورت میں اگر ایک ہندو مخلوط ہندو مسلم آبادی یا مسلم محلے میں رہتا ہے تو اس کے زیادہ امکانات ہیں کہ مسلمانوں سے متعلق اس کا تصور زیادہ مثبت ہوگا۔ مثبت تعامل غلط فہمیوں کے ازالے کا سب سے بہتر ذریعہ ہے اور اس کے لیے کسی

مصنوعی پروگرام یا اسکیم کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تعمیری تعامل کے مثبت نتیجہ کی ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک گاؤں کے مقامی باشندے وہاں واقع مدرسہ اور اس کے مولوی حضرات کے بارے میں جو وہاں پڑھاتے تھے، نہایت غلط اور مفروضات پر مبنی تصورات رکھتے تھے۔ ایک دن بعض ہندوؤں کے گھر میں آگ لگ گئی۔ اس کو بجھانے کے لیے مدرسہ کے لڑکے دوڑ پڑے۔ اس کے بعد مدرسہ کے تعلق سے وہاں کے ہندوؤں کا رویہ بدل گیا۔ مدرسہ اور مدرسہ والوں سے وہ جس قدر نفرت رکھتے تھے اب وہ ان سے اتنی ہی محبت کرنے لگے۔ یہ ہے باہمی تعلق اور میل جول کا معجزہ۔

س : کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مدارس میں دوسرے مذاہب سے متعلق بھی پڑھایا جانا چاہیے؟

ج : جی ہاں! بالکل، اس سے ان کو یہ موقع ملے گا کہ وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ زیادہ بہتر تعلقات قائم کرسکیں۔ اس سے ان کی دعوت واصلاح کی مہم کو بھی تقویت حاصل ہوگی۔ دوسرے مذاہب کے بارے میں پڑھانے کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ان مذاہب کے بارے میں ان کے اندر معروضی شعور پیدا ہو جائے۔ دوسرے مذاہب کی مذمت کا رویہ ترک کیا جانا چاہیے۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے پڑوسی کو سمجھنے کی کوشش کریں، خواہ آپ سے متعلق ہوں یا نہ ہوں۔ جدال غیر احسن اسلامی اخلاق کے مطابق نہیں ہے۔ اس لیے مثال کے طور پر جب میں کسی مندر، گردوارہ یا چرچ وغیرہ میں جاتا ہوں تو میں بالکل خالی ذہن کے ساتھ ان سے انٹرایکشن کرتا ہوں۔ اس طرح ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میرا ارادہ دوسروں کو سمجھنے، دوسرے کے متعلق معلومات حاصل کرنا ہوتا ہے، ان کی مذمت کرنا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کا پیغام دوسروں تک پہنچانا ہمدردی کی بات ہے، دشمنی کی نہیں۔ یہ فخر کرنے کی بات نہیں ہے کہ ایک مذہب کا ماننے والا دوسرے سے افضل ہے۔ قرآن ہم سے چاہتا ہے کہ ہم دوسروں کے ہمدرد بنیں۔

س : دوسروں کے ساتھ تعامل میں علما کے لیے ایک بڑی رکاوٹ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلم مخالف فضا کی وجہ سے انھیں یہ لگتا ہو کہ انہیں مسترد کر دیا جائے گا۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

ج : اس تعلق سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ تعارفِ اسلام کی راہ میں ہر طرح کی مشقت کو برداشت کرنے اور اپنی ذات کو پسِ پشت ڈالنے کی ضرورت ہے۔ میں خود اپنی مثال دیتا ہوں۔ جب میں ایک عرصہ قبل دہلی منتقل ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہندوؤں کا ایک گروپ ہفتے میں ایک مرتبہ ایک جگہ ملا کرتا ہے۔ مجھے شدید خواہش ہوئی کہ میں ان کی میٹنگ میں شریک ہوں۔ چنانچہ میں شریک ہونے لگا۔ ایک دن ایک شخص نے ایک مسئلے کے بارے میں مجھ سے پوچھا جو اس کے گمان کے مطابق قرآن سے تعلق رکھتا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ بات قرآن میں موجود نہیں ہے۔ اس نے اس پر اصرار کیا۔ اس نے کہا کہ وہ اردو جانتا ہے اور اس نے قرآن کا ترجمہ پڑھا ہے۔ اس نے کہا کہ میں اس سے واقف نہیں ہوں۔ میرے لیے یہ بات توہین کے مترادف تھی، نیز قرآن کے تعلق سے اس کے تحقیری رویے سے مجھے شدید دکھ پہنچا۔ لیکن میں نے یہ سب برداشت کیا۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی سختی کا رویہ نہیں اپنایا۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں وہ آگے چل کر میرا دوست بن گیا۔ اسلام سے متعلق گفتگو اور دعوت کے عمل میں اس قسم کے صبر و اعراض کی ضرورت ہے۔

س : مدارس پر لگائے جانے والے دہشت گردی کے الزام سے متعلق آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج : یہ بالکل بے بنیاد الزام ہے۔ کوئی بھی مدرسہ دہشت گردی کی سرگرمیوں میں شامل نہیں ہے۔ پاکستان کے بعض مدارس کے تعلق سے یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ بھی کوئی مدرسے کا ظاہرہ (phenomenon) نہیں، بلکہ پاکستانی ظاہرہ ہے۔ پاکستان کے پارلیمانی سکریٹری برائے دفاع نے ابھی چند دنوں قبل پاکستانی پارلیمنٹ میں ہندستان کے خلاف جہاد کی بات کہی ہے۔ یہ بالکل پاگل پن کی بات ہے۔ یہ شخص مدرسہ کا فاضل نہیں ہے، یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہے۔ اس لیے میں نے

کہا کہ پاکستان کے بعض مدارس کا دہشت گردی میں ملوث ہونا ایک پاکستانی معاملہ ہے۔ یہ پاکستان میں سیاسی مفادات کی خاطر اسلام کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا نتیجہ ہے۔ یہ نہایت غلط بات ہے کہ میڈیا کا ایک حلقہ ہندستانی اور پاکستانی مدرسوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور یہ کہ ہندستانی مدرسوں کو بھی پاکستانی مدرسوں کی طرح دہشت گردی میں ملوث سمجھتا ہے۔

س: کیا آپ پاکستان میں اسلام کی اپنی من مانی تشریح کے مذکورہ بالا نکتے پر مزید روشنی ڈالنا چاہیں گے؟

ج: اصل میں پاکستان کی تحریک ہندستانی مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کی تشکیل کے مطالبے اور جدوجہد پر مبنی تھی۔ اس کے لیے اسلام کو ایک آلے اور ذریعہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ آپ اس کا تو مطالبہ کر سکتے ہیں کہ آپ کو الگ سے اپنا ملک چاہیے، لیکن اس کے لیے آپ کو اسلام کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ پاکستان کی تحریک کے علمبردار کہتے تھے کہ اسلام اور پاکستان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اس لیے انہیں اسلام کو مضبوط کرنے اور فروغ دینے کے لیے ایک علاحدہ ملک کی ضرورت ہے۔ یہ بالکل غلط بات تھی۔ اسلام یا کوئی اور مذہب ایک خطۂ ارضی کو حاصل کر کے مستحکم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ صرف اس طرح مضبوط و مستحکم کیا جا سکتا ہے کہ افراد کے دلوں اور دماغوں میں اس کی جڑیں مضبوط کی جائیں۔ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے دل کی جانب اشارہ کر کے فرمایا تھا کہ تقویٰ اور نیکی کا مقام یہ ہے (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2564)۔

استحصال تمام برائیوں کی جڑ ہے اور چونکہ پاکستان کے لیڈروں نے پاکستان کے آغاز سے ہی اسلام کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا، اس لیے یہ بات بالکل فطری تھی کہ ملک اسلام کے نام پر قائم ہونے کے باوجود کشمکش اور مار دھاڑ کا گہوارہ بن جائے۔

س : ایسا کیوں ہے کہ مدارس میں زیادہ تر انتہائی غریب خاندانوں کے بچے ہی تعلیم کے لیے آتے ہیں؟

ج : اس کی وجہ تعلیمی نظام میں پائی جانے والی ثنویت ہے۔ جس کا میں نے اوپر حوالہ دیا۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ اکثر والدین اپنے بچوں کو ماڈرن اسکولوں میں بھیجنا چاہتے ہیں، کیوں کہ مدارس کے فضلا کی تنخواہوں کا معیار نہایت کم ہے۔ مدارس کے اساتذہ کی تنخواہوں کا معیار زیادہ بہتر سے بہتر بنایا جانا چاہیے۔ اگر ایسا ہو تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ذہین اور خوشحال خاندانوں کے طلبہ بھی مدارس کا رخ کریں گے۔ ماضی میں مدرسوں سے نہایت ذہین وفہیم اسکالرس اور قائدین نکلے جنہوں نے ہندستان کی سیاسی زندگی میں نہایت اہم رول ادا کیا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہو رہا ہے اور بعض دوسرے اعتبارات سے یہ ان مدارس کے تبدیل شدہ طبقاتی کردار کا بھی نتیجہ ہے۔

س : آپ میڈیا کے بڑے حلقے میں مدارس کی شبیہ کے بگاڑے جانے کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

ج : میڈیا زیادہ سے زیادہ آمدنی پیدا کرنے میں یقین رکھتا ہے۔ وہ مارکیٹ بنانے کے لیے ناظرین کے سامنے ہاٹ نیوز پیش کرنے کی فکر میں یقین رکھتا ہے۔ میڈیا کو سافٹ نیوز میں دلچسپی نہیں ہوتی اس لیے کہ اس سے آمدنی نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ سنسنی خیز اور سلیکٹیو رپورٹنگ کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ ایک دن میں ایک ریڈیو اسٹیشن کی ہندی سروس سن رہا تھا۔ ماریشش کے ایک سامع نے ٹیلی فون پر پوچھا کہ "ماریشش" کو کوریج کیوں نہیں دیا جاتا، جب کہ یہاں ہندی بولنے اور سمجھنے والے لوگ کافی تعداد میں ہیں۔ پروگرام پیش کرنے والے نے جواب دیا کہ میڈیا صرف گرم خبروں کا شائق ہے، جبکہ ماریشش سے گرم خبریں نہیں ملتیں۔ اس نے پھر مزید کہا کہ کچھ گرم خبریں پیدا کیجیے،

پھر ہم آپ کے ملک کے بارے میں خبریں نشر کریں گے۔ اگر آپ میڈیا کی روش میں تبدیلی چاہتے ہیں تو آپ کو لوگوں کی ذہنیت کو بدلنا ہوگا۔

س : مرکزی مدرسہ بورڈ کی حکومتی تجویز پر آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج : نظریاتی سطح پر تو یہ صحیح لگتا ہے۔ خاص طور پر اس سیاق میں کہ اس سے مدارس کے نظام کو منظم کرنے میں مدد ملے گی۔ تاہم اصل مشکل حکومت اور مدارس کے درمیان صحت مند تعلقات کی ہے۔ اس بنا پر اس طرح کے بورڈ کا فائدہ بہت زیادہ نہیں ہوگا۔ بہت سے علما حکومت کے ارادے کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ بہرحال اگر یہ بورڈ وجود میں آجاتا ہے تو اس کی پالیسیاں اور سرگرمیاں علما کے مشوروں سے طے کی جانی چاہئیں۔

فقہا کون ہیں

ایک حدیث ہے: تُشَاوِرُونَ الْفُقَهَاءَ وَالْعَابِدِينَ، وَلَا تُمْضُوا فِيهِ رَأْيَ خَاصَّةٍ (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 1618)۔ یعنی دینی معاملات میں تم لوگ ایسے لوگوں سے مشورہ کرو جو فقیہ ہوں اور اللہ کے حکموں پر عمل کرنے والے بھی ہوں۔ محض اپنی ذاتی رائے پر نہ چلو۔

اس حدیث میں ”فقہاء“ کا لفظ موجودہ رواجی معنی میں نہیں ہے۔ وہ سادہ طور پر عالم کے معنی میں ہے، یعنی وہ لوگ جو دین کا گہرا علم رکھنے والے ہوں۔

(ڈائری، 11 جنوری 1996)

ایک ملاقات

زیر نظر انٹرویو مولانا وحید الدین خاں صاحب نے ماہنامہ صراط مستقیم انٹرنیشنل، پاکستان کو دیا تھا۔

س : تاریخ پیدائش اور خاندانی پسِ منظر؟

ج : میری پیدائش سرکاری ریکارڈ کے مطابق، یکم جنوری 1925 کو اعظم گڑھ (اتر پردیش) کے ایک گاؤں بڈھریا میں ہوئی۔ میرے جد اعلیٰ کا نام حسن خاں تھا۔ وہ ریاست سوات (Swat) کے رہنے والے تھے۔ سوات چترال میں واقع ہے، جو اُس زمانہ میں افغانستان کا حصہ تھا۔ اب یہ پاکستان کا ایک حصہ ہے۔ حسن خاں کے ایک اور بھائی تھے جن کا نام حسین خاں تھا۔ دونوں بھائیوں کے درمیان کسی بات پر نزاع پیدا ہو گیا۔ چنانچہ حسن خاں اپنے بھائی حسین خاں سے نہ صرف علیٰحدہ ہو گئے، بلکہ اُنھوں نے سوات سے ہجرت بھی کر ڈالی، اور انڈیا کے ایک صوبہ اتر پردیش کے علاقے جون پور میں پہنچ گئے۔ اس وقت یہاں سلطان خاں کی حکومت تھی۔ پہلے ہمارا خاندان جون پور میں بسا، پھر کچھ لوگ اعظم گڑھ کے علاقے میں جا کر بس گئے۔ یہیں میری پیدائش ہوئی۔

س : تعلیمی مراحل؟

ج : بچپن میں میرا حال یہ تھا کہ اکثر میں گھر سے نکل کر کھیتوں اور باغوں کی طرف چلا جاتا تھا۔ گاؤں کے باہر ندی پر ایک پل تھا۔ میں وہاں جا کر بیٹھ جاتا، اور دیر تک دریا کی روانی اور فطرت کے مناظر کو دیکھتا رہتا تھا۔ فطرت کو دیکھنا میرا پسندیدہ کام تھا۔ کچھ شعور ہوا تو ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک مکتب میں شروع ہوئی۔ اس کے بعد 1938 میں عربی تعلیم کے لیے میں نے مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڑھ) میں داخلہ لیا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ میں سماج میں اررِیلیونٹ ہوں، یعنی میری تعلیم اس لائق نہیں جو مجھے موجودہ سماج میں مفید بنا سکے تو میں نے دوبارہ تفاسیر وحدیث

وغیرہ کا مطالعہ کیا، انگریزی زبان سیکھی، پھر سیکولر علوم اور سائنس وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ اس طرح میں نے زمانی شعور حاصل کیا، اور پورے یقین کے ساتھ اسلام کو ازسرنو دریافت کیا۔

س : فہم قرآن کے بنیادی اصول؟

ج : ڈی کنڈیشنڈ مائنڈ کے ساتھ قرآن میں تدبر کرنا، اور تقوی کے ساتھ اللہ سے دعا کرنا۔

س : کھانے اور پہننے میں کیا پسند ہے؟

ج : لائف اسٹائل کے معاملے میں میرا اصول یہ ہے — سادہ زندگی، اونچی سوچ:

simple living, high thinking

س : ہندستان میں اسلام کی دعوت اور اس پر عمل کتنا دشوار ہے؟

ج : آج کے دور میں کسی بھی ملک میں دعوت کا کام مشکل نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ پیس فل انداز میں حکمت کے ساتھ دعوت کا کام کیا جائے۔

س : ایک داعی کو کن اَوصاف سے متصف ہونا چاہیے؟

ج : داعی کے دل میں مدعو کے لیے مکمل طور پر خیر خواہی (نصح) کا جذبہ ہونا چاہیے۔ مدعو کی کوئی بھی اشتعال انگیز بات داعی کو خیر خواہی کے جذبے سے دور نہ کرے۔

س : حقوق مسلم کے لیے آپ کی جدو جہد کی چند جھلکیاں؟

ج : میں نے مسلمانوں کو ہمیشہ یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ حقوق طلبی کی مہم ترک کریں، اور لوگوں کے لیے نافع (giver) بن کر زندگی گزاریں۔ حدیث کے الفاظ میں، وہ الید العلیا بنیں، الید السفلیٰ نہیں (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1427)۔ یعنی وہ دینے والے (giver) بنیں، نہ کہ لینے والے۔

س : غیر مسلم کس کس رکاوٹ کی وجہ سے نعمتِ اسلام سے محروم ہیں؟

ج : دعوت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود مسلمان ہیں۔ مسلم مفکرین کی یہ غلطی ہے کہ انہوں نے سیاسی میدان میں مغلوب ہونے کی وجہ سے جدید فکر یا جدید تہذیب کو اسلام کا مخالف سمجھ لیا۔ اس بنا پر ان کے اور جدید ذہن کے درمیان غیر ضروری ٹکراؤ پیدا ہو گیا

ہے۔ چنانچہ موجودہ دور میں دعوت کا کام نارمل انداز میں جاری نہیں ہے۔ میری ان کو نصیحت ہے کہ وہ جدید فکر کے خلاف اپنی منفی مہم بند کردیں۔ اس کے بعد غیر مسلموں کے درمیان دعوت کا کام بالکل فطری انداز میں جاری ہوجائے گا۔

س : فرقہ وارانہ تشدد (مذہبی، مسلکی، سیاسی، لسانی وغیرہ) کے اسباب ووجوہات؟

ج : اختلاف کو مینج کرنے کا فقدان۔ اختلاف (difference) کے معاملے میں ہمیشہ دو طریقے ہوتے ہیں — غلو کا طریقہ اور ٹالرنس کا طریقہ۔ غلو کا طریقہ یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ مختلف مسالک فکر کے درمیان ایک ہی طریقہ صحیح ہے، دوسرے تمام طریقے غلط ہیں، ان کو ختم ہوجانا چاہیے۔ اس کے برعکس، دوسرا طریقہ رواداری یا وسعتِ نظری کا طریقہ ہے، یعنی یہ سمجھنا کہ جو اختلاف ہے، وہ تنوع (diversity) کا معاملہ ہے۔ جس کا عملی فارمولا اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے — ایک کی پیروی، سب کا احترام:

follow one, respect all

س : فرقہ وارانہ تشدد کی فضا کو ختم کرنے کے لیے کون کیا کردار ادا کرے؟

ج : نفرت کی فضا کو ختم کرنے کا صرف ایک اصول ہے، یک طرفہ طور پر صلح کر لینا۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر کیا تھا۔

س : پوری دنیا میں "مسلمان ہی مظلوم" کیوں ہیں؟

ج : مسلمان مظلوم نہیں ہیں، وہ اپنی غیر حکیمانہ پلاننگ کی قیمت ادا کررہے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ وہ پریکٹکل وزڈم کی بنیاد پر اپنے عمل کی ری پلاننگ کریں۔

س : دینی مدارس کی اصلاح کے لیے کیا تجاویز دیں گے؟

ج : حدیث کے الفاظ میں، وہ بصیر زمانہ بنیں (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 361)۔ بصیر زمانہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زمانے کے مطابق اہلِ مدارس اپنے عمل کی درست منصوبہ بندی (right planning) کریں۔ زمانے سے باخبری کے بغیر اسلامی عمل کی

درست منصوبہ بندی نہیں ہوسکتی ہے۔ اس بنا پر اہلِ مدارس کو یہ کوشش کرنا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات سے پوری طرح باخبر ہوں، ورنہ ان کی سرگرمیاں بے نتیجہ ہوکر رہ جائیں گی۔ مثلاً ہم ایسے زمانے میں ہیں جو امن کا زمانہ ہے۔ ایسے زمانے میں صرف پر امن منصوبہ بندی نتیجہ خیز ہوسکتی ہے۔ اگر کوئی آج کے زمانے سے بے خبر ہو، اور وہ امن کے زمانے میں جنگ کی تیاری کرے، اور پھر اپنے زمانے کے لوگوں کے خلاف لڑائی چھیڑ دے تو بلا شبہ اس کا منصوبہ غلط ہوجائے گا۔ اپنے جان و مال کو قربان کرنے کے باوجود وہ کوئی مثبت نتیجہ (positive result) حاصل نہ کرسکے گا۔ مدارس کے تعلق سے مزید تفصیل میری کتاب ''علما اور دورِ جدید'' اور ''دین و شریعت'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

س: آپ بصیرِ زمانہ بننے پر بہت زور دیتے ہیں، کیا آپ سے پہلے کسی عالم نے ایسا کہا ہے؟

ج: قدیم علما کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہے۔ مثلاً وہب بن منبہ (وفات 114ھ) نے کہا ہے کہ آل داؤد کی حکمتوں میں ایک یہ ہے: حَقٌّ عَلَى الْعَاقِلِ أَنْ يَكُونَ عَارِفًا بِزَمَانِهِ (الصمت وآداب اللسان لابن أبی الدنیا، اثر نمبر 31)۔ یعنی، عقلمند انسان (wise person) پر لازم ہے کہ وہ اپنے زمانے سے باخبر ہو۔ اسی طرح ابن الحاجب الکردی المالکی (وفات 646ھ) کا قول ہے: وَمِنْ شِيَمِ الْعَالِمِ أَنْ يَكُونَ عَارِفاً بِزَمَانِهِ (جامع الأمہات لابن الحاجب، صفحہ 575)۔ یعنی، عالم کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ اپنے زمانے سے باخبر ہو۔ یہی بات ابن عبد البر (وفات 463ھ) نے بھی اپنی کتاب الکافی فی فقہ أہل المدینۃ (جلد 2، صفحہ 1132) میں لکھی ہے۔ ابن کثیر (وفات 774ھ) نے اپنے استاد برہان الدین الفزاری کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: عَارِفًا بِزَمَانِهِ (البدایۃ والنہایۃ، جلد 14، صفحہ 167)۔ یعنی، وہ اپنے زمانے سے باخبر عالم تھے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب درالمختار (صفحہ 95) میں اس تعلق سے ایک بامعنی قول ان الفاظ میں آیا ہے: مَنْ لَمْ يَكُنْ عَالِمًا بِأَهْلِ زَمَانِهِ فَهُوَ جَاهِلٌ (جو اپنے زمانے کا علم نہ رکھتا ہو، وہ

جاہل ہے)۔مشہور حنفی فقیہ ابن عابدین شامی (وفات 1889) نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں لکھا ہے: وَمَنْ لَمْ يَدْرِ بِعُرْفِ أَهْلِ زَمَانِهِ فَهُوَ جَاهِلٌ (الرد المحتار، جلد 3، صفحہ 724)۔یعنی، جو اپنے زمانے والوں کے ٹریڈیشن سے بے خبر ہو، وہ جاہل ہے۔تو میں نے جو بات کہی ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ میں نے جدید اسلوب میں وہی بات دہرائی ہے، جو قدیم علما کہتے رہے ہیں۔

س : 96 سالہ زندگی کے تجربات کی روشنی میں ہم جاننا چاہیں گے کہ ایک فرد کو کن اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے زندگی گزارنی چاہیے؟

ج : پرابلم کو اگنور کرنا اور مواقع کو دریافت کر کے منصوبہ بند طریقے سے اس کو اویل کرنا۔

س : کبھی پاکستان کا دورہ کیا۔۔۔اگر نہیں تو کیا خواہش ہے؟

ج : میں نے پاکستان کا تین مرتبہ سفر کیا ہے۔ان میں ایک سفر تقسیم سے پہلے 1945 میں ہوا تھا۔اس کے بعد دوسرا سفر 1971 میں ہوا، پھر تیسرا سفر 1985 میں ہوا۔ان کی تفصیل میری کتاب سفر نامہ غیر ملکی اسفار جلد اول میں موجود ہے۔اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً میں پاکستان کے تعلق سے مضامین بھی لکھتا رہا ہوں۔اس وقت ہمارے مشن سے تعلق رکھنے والی ایک ٹیم بھی پاکستان میں موجود ہے، جو وہاں ہمارے دعوتی مشن کو یکسوئی کے ساتھ آگے بڑھا رہی ہے۔

س : اُمت مسلمہ کو نشاۃ ثانیہ کے سفر میں کس مرحلہ میں دیکھتے ہیں؟

ج : مسلم مفکرین یہ سمجھتے ہیں کہ جدید فکر (modern thought) ان کے خلاف ایک چیلنج ہے۔مگر بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس چیز کو جدید فکر کہا جاتا ہے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلام مخالف نہیں ہے، وہ عین موافقِ اسلام ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جدید ذہن اور جدید تہذیب پوری کی پوری اسلام کے موافق ہے۔حقیقت کے اعتبار سے دیکھیے تو اسلام اور جدید فکر میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔اصل مسئلہ فکرِ جدید کو بدلنے کا نہیں

ہے، بلکہ مسلمانوں کی سوچ کو بدلنے کا ہے۔ اس کے بعد کوئی مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ مسلمانوں کا مزاج ہے ہر نئی چیز کے خلاف ہو جانا۔ مثلاً جب کولونیلزم کا دور آیا تو وہ اس کے خلاف ہو گئے۔ اسی مزاج نے اصل مسئلہ پیدا کیا ہے۔ اس ذہنیت کو بدلنا ہے۔

س : امت مسلمہ اپنا کھویا ہوا وقار اور مقام کیسے حاصل کر سکتی ہے؟

ج : ان کو پانچ پوائنٹ فارمولا اختیار کرنا چاہیے۔ وہ پانچ پوائنٹ فارمولا درج ذیل ہے:

(1) معرفتِ خداوندی (realization of God)

(2) مثبت سوچ (positive thinking)

(3) دعوت الی اللہ

(4) نفرت (hate) کا کلی خاتمہ، منفی سوچ کا کلی خاتمہ، مغرب کو اسلام کا دشمن سمجھنے کے بجائے اس کو اسلام مؤید سمجھنا۔

(5) سیاسی ٹارگٹ کے بجائے آخرت رخی زندگی کو اپنا ٹارگٹ بنانا۔

س : اہلِ پاکستان کے نام محبت بھرا پیغام؟

ج: وہ قرآن کی اس آیت کو اپنے لیے رہنما آیت کی حیثیت سے اختیار کرلیں: وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (34:41)۔ یعنی بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔

اس آیت کے مطابق، کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا ابدی دشمن نہیں ہے، پیدائشی طور پر ہر انسان امکانی دوست (potential friend) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس معاملے میں اہلِ پاکستان کی منصوبہ بندی یہ ہونا چاہیے کہ وہ بالقوۃ (potential) دوست کو ،قرآن کی رہنمائی کے مطابق، بالفعل (actual) دوست بنانے کا طریقہ اختیار کرے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی (وفات 1810) اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں: وَقِيلَ مَعْنَاهُ: لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ فِي جُزْئِيَّاتِهَا، وَلَا تَسْتَوِي السَّيِّئَةُ فِي جُزْئِيَّاتِهَا، بَلْ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ فِي الْحُسْنِ وَالسُّوءِ، فَإِذَا اعْتَرَضَكَ مِنْ بَعْضِ أَعْدَائِكَ سَيِّئَةٌ فَادْفَعْهَا بِأَحْسَنِ الْحَسَنَاتِ، كَمَا لَوْ أَسَاءَ إِلَيْكَ رَجُلٌ فَالْحَسَنَةُ أَنْ تَعْفُوَ عَنْهُ، وَالَّتِي أَحْسَنُ أَنْ تُحْسِنَ إِلَيْهِ (تفسیر المظہری، جلد 8، صفحہ 296)۔ یعنی، بعض علما نے آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ نیکیاں سب ایک درجہ کی نہیں ہوتی ہیں، اسی طرح برائیوں کے درجات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی دشمن کوئی بدی کرے تو اس کے مقابلہ میں اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا جائے۔ مثلاً کسی نے اگر تمہارے ساتھ بدسلوکی کی ہو تو درگزر کرنا چاہیے۔ لیکن اعلی نیکی یہ ہے کہ برائی کے بدلے دشمن سے بہترین سلوک کیا جائے — بد اخلاقی کے جواب میں حسن اخلاق بلاشبہ سب سے اعلیٰ اخلاق ہے۔

(الرسالہ، اپریل 2021)

الحادی فکر اور اسلام

مندرجہ ذیل انٹرویو ریاض سعودی عرب، سے شائع ہونے والے عربی مجلہ اوج (مطبوعہ شمارہ نمبر 4، 1439/2018) نے لیا تھا۔

س: مسلمانوں کی اکثریت یہ محسوس کرتی ہے کہ اس وقت مادی والحادی فکر اور اسلام وایمان کے درمیان ایک آئڈیولاجیکل ٹکراؤ ہے۔ چوں کہ ہر ٹکراؤ کا ایک اسلحہ ہوتا ہے، تو ان مادی اور الحادی فکر رکھنے والوں کا مشہور ہتھیار کیا ہے، جس کے ذریعہ وہ دور جدید میں اہل ایمان اور مسلم نوجوانوں کو متاثر کرتے ہیں؟

ج: اس سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں لوگوں کے اندر تبدیلی آئی ہے۔ بیسویں صدی کا دور نظریاتی دور تھا۔ اس زمانے میں چیزوں کو نظریاتی اعتبار سے جج (judge) کیا جاتا تھا۔ مگر مارکسزم کے زوال کے بعد یہ ذہن ختم ہوگیا۔ اب ساری دنیا میں چیزوں کو ان کی افادیت کے اعتبار سے دیکھا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اگر نظریے کا حوالہ دیں تب بھی حقیقت میں ان کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی ترقی کا راز کیا ہے۔ مادی ترقی کے اعتبار سے وہ کس طرح آگے بڑھ سکتے ہیں۔

مسلمان چوں کہ ابھی تک روایتی دور میں جی رہے ہیں، اس لیے نئے دور کے لوگوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلام کے ساتھ ترقی کا سفر جاری نہیں ہوسکتا۔ لوگ خواہ الفاظ جو بھی بولیں، لیکن پس منظر میں جو بات ہوتی ہے، وہ یہی ہے کہ اسلام کے روایتی ورزن کو لے کر ترقی کا سفر طے نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کے روایتی ورژن کی پیروی کرنے سے مسلمان مستقل طور پر پسماندہ کمیونٹی بنے رہیں گے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کو اس کے روایتی ورزن سے نکال کر ماڈرن ایج کے اعتبار سے اس کو متعارف کرانا ہوگا۔ تا کہ اسلام دور

جدید کے لوگوں کو سمجھ میں آسکے۔ یہ اسلام کی تعلیمات میں تبدیلی کی بات نہیں ہے، بلکہ دور جدید کی زبان میں اسلام کو متعارف کرانے کی بات ہے۔

س : دورِ جدید میں پھیلنے والے لامذہبیت اور سیکولرزم کا سبب کیا ہے، آپ کی نظر میں اس کا علاج کیا ہوسکتا ہے؟

ج : یہ بات جو کہی جاتی ہے، وہ دراصل اسلام کے اعتبار سے نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کے روایتی ورژن کے اعتبار سے ہے۔ اسلام کے روایتی ورژن کے اعتبار سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ اسلام کا تعلق زندگی کے سارے پہلو سے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی سوچ سب سے بڑا سبب ہے کہ مسلمانوں کا ذہین طبقہ کیوں سیکولرزم کی طرف مائل ہورہا ہے۔ مگر یہ سوچ بذات خود غلط ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسلام کا تعلق اصلاً انسان کے مذہبی امور سے ہے، جیسا کہ خود پیغمبر اسلام ﷺ نے واضح کردیا تھا: إِذَا كَانَ شَيْئًا مِنْ أَمْرِ دُنْيَاكُمْ فَشَأْنَكُمْ بِهِ، وَإِذَا كَانَ شَيْئًا مِنْ أَمْرِ دِينِكُمْ فَإِلَيَّ (مسند احمد، حدیث نمبر 24920)۔ یعنی، کوئی چیز اگر دنیا کے معاملہ سے متعلق ہو تو تم اس کو زیادہ جانتے ہو اور اگر وہ بات دین کے متعلق ہو تو اس کی ذمے داری میرے اوپر ہے۔

مذہبی دائرے کے سوا اسلام انسان کو پوری آزادی دیتا ہے۔ مثلاً روایتی اسلام میں رسول اللہ کے بارے میں کوئی کریٹیکل کمنٹ دینا شتم رسول کا حکم رکھتا ہے، اور شتم رسول ایک ایسا جرم ہے، جس کی سزا قتل ہے۔ جب کہ قرآن وسنت دونوں میں اس پر سزا کا براہ راست ثبوت نہیں ملتا۔ تفصیل کے لیے میری کتاب، شتم رسول کا مسئلہ ملاحظہ ہو۔

شتم رسول پر سزا آج کے انسان کے لیے قابل قبول نہیں۔ موجودہ زمانے کی فکر، اظہار خیال کی آزادی (freedom of expression) پر قائم ہے۔ اس بنا پر لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام کے ساتھ دنیا میں ترقی نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ اسلام ان مسائل کی بنیاد پر دوسری قوموں سے اتحاد میں رکاوٹ ہے، اور اتحاد کے بغیر ترقی کا کوئی پلان نہیں بنایا

جا سکتا۔ جدید ذہن کے لیے اسلام کا یہ نظریہ مستقل طور پر قیام امن میں رکاوٹ ہے، اور قیامِ امن کے بغیر کوئی ترقی کا کام عملاً ممکن ہی نہیں۔ اس معاملے کا حل صرف اسلام کے پُرامن پیغام کو عام کرنا اور شتم کرنے والے کے ساتھ اس معاملے میں افہام وتفہیم کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔

س : آپ مسلم مفکرین اور لکھنے والوں کو کیا نصیحت کرنا چاہیں گے، بطور خاص اس لیے کہ آپ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ آپ نے جب بھی کسی فکر پر تنقید کرنے کا ارادہ کیا، تو اس کے بارے میں ہزاروں صفحات پڑھے ہیں؟

ج : مسلم مفکرین اور لکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ جدید فکر (modern thought) ان کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ مگر بہ غور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس چیز کو جدید فکر کہا جاتا ہے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلام مخالف نہیں ہے، وہ عین موافق اسلام ہے۔ مسلم مفکرین کی یہ غلطی ہے کہ انہوں نے جدید فکر یا جدید تہذیب کو اسلام کا مخالف سمجھ لیا۔ اس بنا پر ان کے اور جدید ذہن کے درمیان غیر ضروری ٹکراؤ پیدا ہو گیا ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید ذہن اور جدید تہذیب پوری کی پوری اسلام کے موافق ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے دیکھیے تو اسلام اور جدید فکر میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ فکر جدید کو بدلنے کا نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی سوچ کو بدلنے کا ہے۔ اس کے بعد کوئی مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ مسلمانوں کا مزاج یہ تھا کہ ہر نئی چیز کے خلاف ہو جانا۔ تو جب کولونیلزم کا دور آیا تو وہ ہر چیز کے خلاف ہو گئے۔ اسی چیز نے اصل مسئلہ پیدا کیا۔ تو اس ذہنیت کو بدلنا ہے۔ میری ان کو نصیحت ہے کہ وہ جدید فکر کے خلاف اپنی منفی مہم کو بند کر دیں۔

س : آنے والے دنوں میں آپ اسلام کا مستقبل کیسا دیکھتے ہیں؟

ج : اسلام کا مستقبل بہت ہی اچھا ہے، بشرطیکہ مسلمان اپنے کو بدلیں۔ موجودہ زمانے کی

کوئی چیز اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ لیکن مسلمان ہر چیز کو اسلام کے خلاف سمجھنے لگتے ہیں، اور ہر چیز کے خلاف لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جب پرنٹنگ پریس آیا تو ابتداء میں ترکی کے شیخ الاسلام نے اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا۔ یہ دورِ جدید سے علما کی بے خبری کا مسئلہ تھا، نہ کہ غیر مسلموں کی اسلام سے مخالفت کا۔ اس لیے ضرورت یہ ہے کہ مسلمان اپنی سوچ کو بدلیں۔

س: آپ کے بچپن یا جوانی کا کوئی واقعہ، جس کو آپ ابھی تک یاد کرتے ہوں، اور اس کا آپ کی شخصیت پر آج تک اثر ہو؟

ج: میں تو سمجھتا ہوں کہ سب سے زیادہ جو واقعہ مجھے یاد رہتا ہے، وہ وہی سبق ہے جو میرے استاذ امین احسن اصلاحی سے مجھے ملا۔ ایک روز قرآن کی کلاس میں یہ آیت سامنے آئی: أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (88:17)۔ یعنی، کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیا گیا۔ استاذ محترم نے اس موقع پر طلبہ سے پوچھا کہ اونٹ کے سم پھٹے ہوتے ہیں یا جڑے ہوتے ہیں۔ یعنی بیل کی مانند پھٹے ہوتے ہیں یا گھوڑے کی مانند جڑے ہوتے ہیں۔ اس وقت ہماری جماعت میں تقریبا 20 طالب علم تھے۔ مگر کوئی بھی شخص یقین کے ساتھ اس کا جواب نہ دے سکا۔ ہر ایک اٹکل بچو سے کبھی ایک جواب دیتا، اور کبھی دوسرا جواب۔

اس موقع پر استاد محترم نے ہم لوگوں کو سمجھایا کہ تمھارے جوابات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم لوگ اونٹ کے سُم کی نوعیت نہیں جانتے۔ پھر انھوں نے عربی کا مقولہ سنایا: لَا أَدْرِي نِصْفُ الْعِلْمِ (میں نہیں جانتا، آدھا علم ہے)۔ اس کی تشریح انھوں نے کی کہ اگر تم لوگ یہ جانتے کہ تم اونٹ کے سم کے بارے میں بے خبر ہو تو گویا کہ اس معاملہ میں تمھارے پاس آدھا علم ہوتا۔ کیوں کہ اپنی لاعلمی کو جاننے کے بعد تمھارے اندر یہ شوق پیدا ہوتا کہ تم اپنے علم

کو مکمل کرنے کے لیے یہ معلوم کرو کہ اونٹ کے سم کیسے ہوتے ہیں۔ اگر لا ادری (میں نہیں جانتا) کا شعور تمھارے اندر بیدار رہوتا تو اونٹ پر نظر پڑتے ہی تم اس کے سم کو غور سے دیکھتے، اور پھر تم اس کے نہ جاننے کو جاننا بنا لیتے۔

مدرسہ کا یہ واقعہ میرے لیے اتنا موثر ثابت ہوا کہ یہ میرا عمومی مزاج بن گیا کہ میں ہر معاملہ میں اپنی ناواقفیت کو جانوں، تاکہ میں اس کو واقفیت بنا سکوں۔ علمی تلاش کا یہ جذبہ مجھے ابتداءً مدرسہ سے ملا تھا۔ بعد کو میں نے اس موضوع پر مغربی مصنفین کی کچھ کتابیں پڑھیں، مثلاً اسپرٹ آف انکوائری (Spirit of Inquiry)۔ ان سے معلوم ہوا کہ تجسس کا یہی جذبہ تمام علمی ترقیوں کی اصل بنیاد ہے۔ اس کی ایک مشہور مثال یہ ہے کہ ہزاروں لوگوں نے سیب کو درخت سے گرتے دیکھا تھا۔ مگر اس معاملہ میں وہ اپنے ''لا ادری'' کو نہیں جانتے تھے، اس لیے وہ حقیقت سے بے خبر رہے۔ نیوٹن پہلا شخص ہے، جس نے اس معاملہ میں اپنے ''لاادری'' کو جانا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ''ادری'' کے درجہ تک پہنچ گیا۔

اس کے برعکس، مسلم علماء دورِ جدید کو نہیں جانتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے فتوی دے کر یہ ظاہر کیا کہ أَدْرِي أَنَّ العَصْرَ الجَدِيدَ حَرَامٌ (میں جانتا ہوں کہ دورِ جدید حرام ہے)۔ جب کہ انھیں کہنا یہ چاہیے تھا کہ لَا أَدْرِي مَا هُوَ العَصْرُ الجَدِيدُ (میں نہیں جانتا کہ دورِ جدید کیا ہے)۔ اس کے بعد وہ اس قابل ہوتے کہ دورِ جدید کو جانیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔

جب انہوں نے دورِ جدید کو جانے بنا ایک قدم اٹھایا تو اس کے نتیجے میں انہوں نے اس ادری (میں جانتا ہوں) کلچر کی بنیاد پر ہر چیز کو حرام قرار دے دیا، اور یہی وہ چیز ہے جو سیکولر تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اسلام سے دور ہونے کا سبب بن رہی ہے۔ جب کہ میں ہر

چیز کو سب سے پہلے لاادری (میں نہیں جانتا ہوں) کے خانے میں ڈالتا ہوں۔ اس کے بعد موضوعی اعتبار سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

س : وہ کیا پروگرام ہیں، جس کے بارے میں آپ اللہ سے یہ تمنا کرتے ہیں کہ وہ اس کو پورا کرے؟

ج : میری صرف ایک تمنا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ ہر گھر میں اسلام کا کلمہ داخل کرے گا، روایت کے الفاظ یہ ہیں: لَا يَبْقَى عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ، وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللَّهُ كَلِمَةَ الْإِسْلَامِ (مسند احمد، حدیث نمبر 23814)۔ یعنی روئے زمین پر کوئی بھی بڑا یا چھوٹا گھر باقی نہیں رہے گا، مگر اللہ اس میں اسلام کا کلمہ داخل کرے گا۔ میری خواہش ہے کہ اس حدیث میں بیان کردہ پراسس کا میں حصہ بن جاؤں۔ یہاں تک کہ یہ حقیقت بن جائے، اور قرآن کی آیت، لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (25:1)، کے مطابق سارے عالم تک قرآن کا پیغام پہنچ جائے۔

My greatest desire is to become a part of this historical process, the process of the spreading of the word of God, until it becomes a reality.

س : آپ کی ایک اہم کتاب الاسلام یتحدی (مذہب اور جدید چیلنج) ہے۔ کیا آپ کا یہ ارادہ ہے کہ اس کو نئے سائنسی انکشافات کے اعتبار سے اپ ڈیٹ (update) کی جائے، تاکہ وہ موجودہ دور کے اعتبار سے اپ ٹو ڈیٹ (up to date) ہو سکے؟

ج : جہاں تک کتاب کو اپ ڈیٹ کرنے کی بات ہے، تو میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ اس میں جو مباحث موجود ہیں، وہ ابھی تک ریلیونٹ ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ ایک ہسٹاریکل بک بن چکی ہے۔ اس میں کسی اپ ڈیٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت میں سارا فوکس دعوت پر دیتا ہوں، اور دعوتی فوکس کے اعتبار سے اس معاملہ میں میری ایک نئی کتاب آئی ہے، اظہار دین۔ یہ کتاب فی الوقت اردو زبان میں موجود ہے۔

س : آپ مسلم نوجوانوں کو کن کتابوں کے پڑھنے کا مشورہ دیں گے، تاکہ وہ فکری اعتبار سے مضبوط ہوسکیں؟

ج : میں انھیں دو کتابیں پڑھنے کا مشورہ دوں گا۔ ایک ہے، اللّٰہ یتجلی فی عصر العلم۔ یہ جان کلوور مونسما کی کتاب The Evidence of God in an Expanding Universe کا عربی ترجمہ ہے۔ اس سے انھیں معلوم ہوگا کہ سائنس اسلام کے خلاف نہیں ہے، اور دوسری کتاب جس کو میں پڑھنے کا مشورہ دوں گا، وہ یہ ہے:

The Great Intellectual Revolution, by John Frederick West

اس کتاب سے انھیں معلوم ہوگا کہ دورِ جدید کی فکر کیا ہے۔

س : ہم کیوں نوجوان مسلم عورتوں میں دینی انحراف دیکھتے ہیں، اس کا سبب کیا ہے؟

ج : اس کی وجہ صرف ایک ہے، اسپرٹ (تقوی، محبتِ الٰہی اور اخلاق) کے بجائے ظواہرِ دین پر غلو کی حد تک زور دینا۔ مثلاً پردہ پر غیر ضروری زور دینا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو کام پردہ کے باہر جائز نہیں ہے، اس کو انھوں نے پردے کی آڑ میں جائز کرلیا ہے:

What is not allowed outside the purdah, they are allowing inside the purdah.

اِس زمانے میں برقعہ پہننے والی عورتیں فیشن کی طرف زیادہ مائل نظر آتی ہیں۔ یہ دراصل ظواہر دین پر غلو کا ردِّ عمل ہے۔ پیغمبرِ اسلام کی بیوی حضرت عائشہ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تربیت نتیجہ خیز کیسے ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا تھا: إِنَّمَا نَزَلَ أَوَّلَ مَا نَزَلَ مِنْهُ سُورَةٌ مِنَ المُفَصَّلِ، فِيهَا ذِكْرُ الجَنَّةِ وَالنَّارِ، حَتَّى إِذَا ثَابَ النَّاسُ إِلَى الإِسْلاَمِ نَزَلَ الحَلاَلُ وَالحَرَامُ، وَلَوْ نَزَلَ أَوَّلَ شَيْءٍ: لاَ تَشْرَبُوا الخَمْرَ، لَقَالُوا: لاَ نَدَعُ الخَمْرَ أَبَدًا، وَلَوْ نَزَلَ: لاَ تَزْنُوا، لَقَالُوا: لاَ نَدَعُ الزِّنَا أَبَدًا، لَقَدْ نَزَلَ بِمَكَّةَ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِنِّي لَجَارِيَةٌ أَلْعَبُ: بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ (46:54) وَمَا نَزَلَتْ سُورَةُ البَقَرَةِ وَالنِّسَاءِ إِلَّا وَأَنَا عِنْدَهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4993)۔ یعنی، سب سے پہلے جو چیزیں نازل ہوئیں، ان میں مفصل کی سورتیں

تھیں، جن میں جنت اور دوزخ کا ذکر موجود ہے۔ پھر جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے، اس کے بعد حلال وحرام (کے احکام) اترے، اگر ابتدا ہی میں یہ اترتا کہ شراب نہیں پینا تو لوگ کہتے ہم تو کبھی بھی شراب پینا نہیں چھوڑیں گے۔ اگر شروع ہی میں یہ اترتا کہ زنا نہیں کرنا تو لوگ کہتے ہم تو زنا نہیں چھوڑیں گے۔ اس کے بجائے مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت (54:46) نازل ہوئی: بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ (بلکہ قیامت ان کے وعدہ کا وقت ہے اور قیامت بڑی سخت اور بڑی کڑوی چیز ہے)۔ اس وقت جب میں بچی تھی اور کھیلا کرتی تھی۔ (اس کے برعکس،) سورۃ البقرہ اور سورۃ النساء اس وقت نازل ہوئی، جب کہ میں (مدینہ میں) آپ کے پاس آ گئی تھی۔

س: موجودہ دور میں امت کی حالت کے اعتبار سے کمی کہاں ہے؟

ج: صرف ایک ہے۔ وہ ہے دور جدید سے بے خبری۔ موجودہ دور کو سمجھنے کے لیے مودودی اور سید قطب کی کتابوں کو نہ پڑھا جائے، بلکہ اس کتاب کو پڑھا جائے:

The Great Intellectual Revolution, by John Frederick West

س: آپ کے اعتبار سے قرآن کا مطلوب انسان کون ہے، جیسا کہ آپ کی ایک کتاب بھی اسی نام سے ہے؟

ج: داعی انسان۔ قرآن کا سب سے زیادہ فوکس دعوت پر ہے، اور قرآن کا مطلوب انسان وہی ہے جو قرآن سے اس کو دریافت کرے، اور قرآن کا داعی بن جائے۔

س: آپ کی زندگی بھر کی حکمت کا کوئی خلاصہ۔

ج: پرابلم کو اگنور کرنا، اور مواقع کو دریافت کر کے اس کو اویل کرنا۔

To ignore the problem and avail of the opportunity by discovering it.

(الرسالہ، جنوری 2019)

سوال وجواب

سوال

علما اور اہل مدارس کے لیے الرسالہ مشن کی اہمیت کیا ہے؟ براہِ کرم اِس کو واضح فرمائیں۔(مولانا سید اقبال احمد عمری، عمرآباد، تمل ناڈو)

جواب

جدید تعلیم یافتہ طبقے کے علاوہ، ہمارے دعوتی مشن کے اصل مخاطب علما اور مدارسِ عربیہ کے لوگ ہیں، کیوں کہ امکانی طور پر وہ قرآن اور حدیث پر مبنی مشن کے لیے تیار ذہن (prepared mind) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس کی شرط صرف ایک ہے، وہ یہ کہ مدارسِ عربیہ کے لوگ اپنی ڈی کنڈیشننگ کرسکیں۔ سیکولر اداروں میں پڑھے ہوئے لوگ ہمارے دعوتی مشن کو بھر پور طور پر سمجھ نہیں سکتے۔ وہ اُن اصطلاحوں سے مانوس نہیں ہوتے جن میں ہم کلام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ گہرے علمی اور خالص دینی موضوعات پر میں صرف ان لوگوں سے گفتگو کر پاتا ہوں جن کا تعلیمی بیک گراؤنڈ عربی ہو۔ کیوں کہ جن لوگوں کا تعلیمی بیک گراؤنڈ عربی نہ ہو، اُن سے دینی موضوعات پر بات کرتے ہوئے ان کی ایک حد آجاتی ہے اور ان سے گفتگو جاری نہیں رہ پاتی۔ اہلِ مدارس کی ڈی کنڈیشننگ کیا ہے، وہ اصلاً صرف ایک ہے، یہ کہ وہ شخصیت پرستی کے خول سے باہر آجائیں۔ وہ چیزوں کو اپنے اکابر کے بجائے اصول کی حیثیت سے دیکھنے لگیں۔ اہلِ مدارس اگر ایسا کرسکیں تو اُن کے لیے اعلیٰ معرفت کا دروازہ پوری طرح کھل جائے گا۔ اہلِ مدارس کو دوسروں کے مقابلے میں، دو چیزیں خصوصی طور پر حاصل رہتی ہیں — ایک، حقائقِ دینیہ سے مانوس ہونا۔ اور دوسرے اصطلاحاتِ دینیہ سے آشنا ہونا۔

مزید یہ کہ حدیث کے مطابق، ایک مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے سے باخبر ہو: أَنْ يَكُونَ بَصِيرًا بِزَمَانِهِ (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 361)۔ علما اور اہلِ مدارس، دینی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کے باعث، اسلام کے روایتی علم سے آشنا ہوتے ہیں۔ لیکن عام طور پر وہ اُس صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں جس کو مذکورہ حدیث رسول میں ''بصیرتِ زمانہ'' کہا گیا ہے، یعنی اپنے زمانے سے باخبر ہونا۔ ایسی حالت میں علما اور اہلِ مدارس کے لیے ضروری ہے کہ وہ الرسالہ مشن کے تحت تیار کردہ لٹریچر کا مطالعہ کریں۔ کیوں کہ یہ لٹریچر بصیرتِ زمانہ کی اِسی کمی کی تلافی کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ (الرسالہ، دسمبر 2011)

سوال

اکثر علما یہ سوال کرتے ہیں کہ صاحب الرسالہ کا منہج اخذ واستدلال کیا ہے؟ اس سلسلے میں جواب مطلوب ہے۔ (حافظ سید اقبال عمری، عمرآباد، تامل ناڈو)

جواب

اس معاملہ میں ہمارا منہج وہی ہے جو عملاً تمام علما کا معروف منہج ہے۔ اس منہج کی اصل صحابیِ رسول حضرت معاذ بن جبل کی حدیث میں موجود ہے۔ یہ حدیث سنن الترمذی، ابوداؤد، اور مسند احمد وغیرہ کتب حدیث میں آئی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: عَنْ رِجَالٍ مِنْ أَصْحَابِ مُعَاذٍ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مُعَاذًا إِلَى اليَمَنِ، فَقَالَ: كَيْفَ تَقْضِي؟، فَقَالَ: أَقْضِي بِمَا فِي كِتَابِ اللَّهِ، قَالَ: فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِي كِتَابِ اللَّهِ؟، قَالَ: فَبِسُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِي سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟، قَالَ: أَجْتَهِدُ رَأْيِي، قَالَ: الحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِ اللَّهِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 1327)۔

معاذ بن جبل کے بعض ساتھیوں سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت

معاذ کو یمن بھیجنے کا ارادہ کیا تو پوچھا: تم کس طرح فیصلہ کرو گے۔ انہوں نے کہا اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ آپ نے پوچھا: اگر تم اللہ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ؟ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ کی سنت کے مطابق (فیصلہ کروں گا)۔ رسول ﷺ نے پوچھا: اگر سنتِ رسول میں بھی نہ پاؤ؟ انہوں نے کہا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ کہا: اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں جس نے رسول اللہ کے رسول کو اس چیز کی توفیق دی۔

اس حدیث کو بعض علما نے ضعیف بتایا ہے۔ لیکن یہ تضعیف خالص فنی بنیاد پر ہے۔ چنانچہ دوسرے علما نے اس کی تصحیح کی ہے، مثلاً ابن القیم الجوزیہ۔ اس فنی بحث سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو عملاً تمام علما نے اس روایت کو تسلیم کیا ہے۔ کیوں کہ تمام علما کے متفقہ مسلک کے مطابق مصادر شریعت چار ہیں، قرآن، سنت، قیاس، اور اجماع۔ یہ مسلک عین معاذ بن جبل کی روایت کے مطابق ہے۔ میں صرف یہ کہوں گا کہ باعتبار حقیقت مصادر شریعت چار نہیں ہیں، تین ہیں۔ کیوں کہ قیاس اور اجماع دونوں حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ جب قیاس کا لفظ بولا جائے تو اس سے مراد انفرادی قیاس ہوتا ہے اور جب اجماع کا لفظ بولا جائے تو اس سے مراد اجتماعی قیاس۔ قیاس اور اجماع دونوں کی اصل اجتہاد ہے۔

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ قرآن میں اجتہاد کا لفظ نہیں آیا ہے۔ البتہ اس کے ہم معنی دوسرا لفظ آیا ہے، اور وہ استنباط (النساء، 4:83) ہے۔ اجتہاد اور استنباط دونوں کا مشترک مفہوم ایک ہے، اور وہ استخراج (inference) ہے۔ جب کسی معاملہ میں حکم شرعی منصوص انداز میں موجود ہو تو وہاں کسی اجتہاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جب کسی معاملہ کا حکم بشکل نص موجود نہ ہو تو وہاں ضرورت ہوتی ہے کہ غور و فکر کر کے متعلقہ معاملہ میں حکم کی شرعی تطبیق (application) کو دریافت کیا جائے۔ اسی عمل کو استخراج کہا جاتا ہے۔ یعنی نص شرعی کے حدود میں رہتے ہوئے، بطریق استنباط متعلقہ معاملہ کا حل تلاش کرنا۔ (الرسالہ، جنوری 2019)

سوال

سماجی سطح پر ہندستان میں مدارس اسلامیہ کا فکری رجحان کیا رہا ہے؟

جواب

سماجی مسائل کے بارے میں مدارس اسلامیہ کا بظاہر کوئی فکری رول براہ راست طور پر نہیں ہے۔ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں کہ مدارس اسلامیہ کے سامنے شعوری طور پر سماجی فلاح کا کوئی نقشہ موجود تھا۔ تاہم اس سلسلہ میں بالواسطہ طور پر ان کی خدمات کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً فتاویٰ کے ذریعہ رہنمائی، مساجد میں خطباتِ جمعہ، عوامی جلسہ میں خطاب، مختلف تقریبات کے دوران اساتذہ اور طلبہ کا عوام سے انٹرایکشن، شادی بیاہ جیسی رسموں میں شرکت کے دوران وعظ ونصیحت اور رسالوں کے ذریعہ تعلیم ونصیحت، وغیرہ۔ سماجی اعتبار سے ایک مستقل کام سوشل سروس ہے۔ مگر مدارس میں غالباً سوشل سروس کا کوئی باقاعدہ تصور موجود نہیں۔ (الرسالہ، جون 2004)

سوال

اب تک ہندستان کے مدارس میں دہشت گردی کی فکری یا عملی تعلیمات کا کوئی ثبوت نہ ملنے کے باوجود ملکی سطح پر کچھ حلقے سے مدارس اسلامیہ پر مسلسل دہشت گردی کے فروغ کے الزامات عائد کیے جارہے ہیں، آخر اس کے اسباب وعوامل کیا ہوسکتے ہیں۔ اور اس ڈھٹائی کے پیچھے ان کے کیا مقاصد پنہاں ہیں۔

جواب

یہ صحیح ہے کہ مدارس میں دہشت گردی کی تعلیم وتربیت نہیں دی جاتی۔ اس اعتبار سے مدارس پر الزام لگانا غلط ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ صحیح ہے کہ مدارس کے نظام میں عین وہی

ذہن بنتا ہے جس کو جہادی ذہن کہا جاتا ہے۔ مدارس کے لوگوں کو امت مسلمہ کے مسائل کے سلسلہ میں پُرامن عمل کا کوئی شعور نہیں۔ وہ دور جدید کے اس امکان سے بے خبر ہیں کہ ہر میدان میں حصہ داری (sharing) کے اصول پر کام کیا جانا چاہیے۔

مدارس کے لوگ اب تک شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ غیر مسلم لوگ کافر ہیں۔ غیر مسلم ممالک دارالکفر یا دارالحرب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ دوسری قومیں مسلمانوں کے خلاف دشمنی اور سازش میں مشغول ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مدارس کی طرف سے اب تک جہاد کے نام پر متشددانہ سرگرمیوں کی کھلی مذمت نہیں کی گئی اور نہ یہ اعلان کیا گیا کہ یہ سرگرمیاں جہاد نہیں ہیں بلکہ فساد ہیں۔ ایسی حالت میں مدارس کو اس معاملہ میں مکمل طور پر بے قصور نہیں کہا جا سکتا۔ (الرسالہ، جون 2004)

سوال

الرسالہ جون 2004 کے صفحہ 28، سوال نمبر 12 کے جواب میں آپ نے فرمایا ”مدارس پر الزام لگانا غلط ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ مدارس کے نظام میں عین وہی ذہن بنتا ہے جس کو جہادی ذہن کہا جاتا ہے“۔ اور جواب کے آخری جملہ میں آپ نے تحریر فرمایا ہے ”ایسی حالت میں مدارس کو اس معاملہ میں مکمل طور پر بے قصور نہیں کہا جا سکتا“۔

جولائی 2004 کے الرسالہ میں صفحہ 30-29 پر ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا ”میں خود ایک مدرسہ کا پروڈکٹ ہوں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مدرسہ کا کوئی تعلق ٹررزم سے نہیں ہے۔ کم از کم مجھے کوئی ایسا مدرسہ معلوم نہیں جہاں مدرسہ کے نظام کے تحت ٹررزم کی تعلیم دی جاتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ صرف تعلیم کے لیے ہے۔ وہاں کے نصاب یا وہاں کے نظام کا کوئی تعلق اس چیز سے نہیں جس کو آج کل ٹررزم کہا جاتا ہے“۔

ایک طرف آپ کو اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ مدرسوں میں صرف دینی تعلیم دی جاتی

ہے اور آج کل جسے ٹررزم کہا جاتا ہے اس کا تعلق ان مدارس سے نہیں ہے۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی آپ کہہ رہے ہیں کہ ان مدارس کے نظام میں وہی ذہن بنتا ہے جس کو جہادی ذہن کہا جاتا ہے، یہ کہاں تک درست ہے۔ کیا یہ تضاد بیانی اس بات کی گواہ نہیں ہے کہ دینی مدارس کے تعلق سے آپ کی تحقیق حقیقت پر غالب آ گئی ہے اور اس الزام کو تقویت دیتی ہے کہ دینی مدارس میں جہادی ذہن سازی ہوتی ہے جو ٹررزم کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ گذارش ہے کہ آپ اس تضاد بیانی کو الرسالہ کے کسی آئندہ شمارے میں واضح فرمائیں گے۔ (محمد بشیر احمد)

جواب

آپ نے دو باتوں کے فرق کو نہیں سمجھا۔ اس لیے آپ کو میرے مضمون میں تضاد نظر آیا۔ جو لوگ فرق کے اصول کو نہیں سمجھتے ان کو قرآن میں بھی تضاد نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک مستشرق نے لکھا ہے کہ قرآن میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ منکرین قیامت میں اندھے اٹھائے جائیں گے (طٰہٰ، 20:125)۔ اور دوسری جگہ قرآن میں منکرین کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ قیامت میں ان کی نگاہ بہت تیز ہوگی (ق، 50:22)۔ مستشرق نے اس کو تضاد کا معاملہ سمجھا۔ حالاں کہ یہ فرق کا معاملہ ہے۔ یعنی ایک بات کے دو الگ الگ پہلوؤں کو بتانا۔

میں نے اپنی تحریروں میں بار بار یہ بات لکھی ہے کہ ہمارے علما جو مدارس میں تیار ہو کر نکلے، وہ تقریباً سب کے سب فکری اعتبار سے جہاد (بمعنٰی قتال) کا ذہن لے کر نکلے۔ ہر ایک نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں کہا کہ اسلام کا اقدامی عمل جہاد (بمعنٰی قتال) ہے۔ اس کی ایک تازہ مثال مولانا تقی عثمانی کی کتاب فقہی مقالات ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے والد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا یہ نظریہ بتایا ہے کہ اسلام کا اقدامی عمل جہاد (بمعنٰی قتال) ہے۔

میں اس نقطۂ نظر کو غلط سمجھتا ہوں۔ میں نے اپنی تحریروں میں بار بار یہ واضح کیا ہے کہ اسلام کا اقدامی عمل پر امن دعوت ہے۔ جہاد (بمعنٰی قتال) ایک دفاعی کارروائی ہے جو

استثنائی طور پر کبھی پیش آتی ہے۔ مزید یہ کہ اس دفاعی کارروائی کا حق صرف باضابطہ طور پر قائم شدہ حکومت کو ہے۔ غیر حکومتی تنظیموں کو ہر گز مسلح جہاد کی اجازت نہیں۔ جس شخص نے میری تحریروں کو پڑھا ہو اس کو میرا یہ نقطۂ نظر پوری طرح معلوم ہوگا۔

البتہ اسی کے ساتھ میرا یہ خیال ہے اور اس کو میں نے بار بار اپنی تحریروں میں واضح کیا ہے کہ ہندستان کے مدارس میں عملی عسکریت یا عملی ٹررزم کی نہ تو تربیت ہوتی ہے اور نہ یہ مدارس اس قسم کی کسی عملی تحریک کا اڈہ ہیں۔ البتہ بعض دوسرے ملکوں میں ایسے مدارس ضرور پائے جاتے ہیں جو عملی عسکریت میں ملوث ہیں۔ میں نے ان مدارس پر تنقید کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ کسی بھی مدرسہ کے لیے یہ جائز نہیں کہ عملی طور پر وہ عسکریت کا نظام چلائے۔ بالفرض کسی ملک میں دفاعی جہاد کی ضرورت پیدا ہو جائے تب بھی عملی دفاع کی ذمہ داری صرف قائم شدہ حکومت کی ہوگی۔ اسلامی تعلیم کے مطابق، کسی مدرسہ یا کسی غیر حکومتی تنظیم کے لیے ہر گز یہ جائز نہیں کہ وہ جہاد کے نام پر مسلح جدو جہد شروع کردے۔ (الرسالہ، جولائی 2005)

سوال

کہا جاتا ہے کہ ہندستان کے اسلامی مدرسوں میں تشدد اور علیحدگی پسندی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس طرح وہ ملک میں منفی رول ادا کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ان مدرسوں کو باقی رکھنے کا کیا جواز ہے (محمد عمران، راشٹریہ سہارا، دہلی)

جواب

یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملک میں تشدد پسندی اور علیحدگی پسندی کا رجحان ہے۔ مگر وہ زیادہ تر سیاسی لیڈروں کا پیدا کردہ ہے، ان کا مدرسوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ان مدرسوں میں دین اور اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان مدرسوں میں ایسے لوگ تیار کیے جاتے ہیں جو اصول پسند اور باکردار ہوں۔ اور اسی کے ساتھ وہ سماج میں مارل ٹیچر بن کر رہ

سکیں۔ میں خود مدرسہ کے اسی تعلیمی نظام کی پیداوار ہوں۔ اور میں پورے اعتماد کے ساتھ اس قسم کے الزام کی تردید کرسکتا ہوں۔ سیاست اور ٹی وی (الیکٹرانک میڈیا) یہ دو چیزیں لوگوں کے کردار کو بری طرح تباہ کرر ہے ہیں۔ ایسی حالت میں مدرسہ کے نظام کو مزید طاقتور کرنے کی ضرورت ہے تا کہ وہ موجودہ اخلاقی بگاڑ کے سیلاب کو روک سکیں۔ (الرسالہ، فروری 1999)

سوال

مدارس اسلامیہ کو اپنے وقار کے تحفظ اور ان سازشوں کے نتائج سے بچنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

جواب

میرے نزدیک سازش کا تصور محض ایک مفروضہ ہے۔ اسی طرح وقار کے تحفظ کا سوال بھی ایک فرضی سوال ہے۔ اس کا سادہ سا ثبوت یہ ہے کہ 1947 کے بعد ہر مدرسہ نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اگر مذکورہ مفروضہ درست ہوتا تو مدارس کی یہ ترقیاں ہرگز ممکن نہ ہوتیں۔ اس معاملہ میں مدارس کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ سازش کے فرضی وہم سے باہر آجائیں اور معتدل ذہن کے تحت اپنا کام کریں۔

مدارس، اسلامی تعلیم کا مرکز ہیں۔ اسلامی تعلیم اپنے آپ میں پُرکشش ہے۔ وہ یہ طاقت رکھتی ہے کہ خود اپنے زور پر انسان کو اپنا گرویدہ بنا سکے۔ ایسی حالت میں موجودہ زمانہ میں مدارس کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں وہ اصلاً خود مدارس کی اپنی غلطیوں کا نتیجہ ہیں۔ اس کمی کا ایک سبب یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ کے لوگ اپنی روایات کے تحت بند ماحول میں رہتے ہیں۔ وہ خارجی دنیا سے اختلاط نہیں کرتے۔

اس بنا پر ان کا حال یہ ہو گیا ہے کہ وہ نہ آج کی دنیا کو جانتے ہیں اور نہ جدید حالات کے

مطابق اپنے ذہن کو تیار کرتے ہیں۔ اس علیٰحدگی پسندی کی بنا پر ان کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کا حقیقی حل صرف یہ ہے کہ مدارس کے ماحول کو بدلا جائے۔ اور قدیم کے ساتھ جدید کو شامل کرنے کی کوشش کی جائے۔

مدارس کو یا امت مسلمہ کو موجودہ زمانہ میں جو مسائل درپیش ہیں ان کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ان کا سبب دراصل اس بنیادی خامی تک جاتا ہے کہ مدارس میں جو سوچ دی جاتی ہے وہ بجائے خود درست نہیں۔ اسی فکری خامی کے نتیجہ میں وہ تمام چیزیں پیدا ہوئی ہیں جن کو مسائل کا نام دیا جاتا ہے۔ مسائل کا لفظ بظاہر خارجی اسباب کی طرف اشارہ کرتا ہے، حالانکہ ہمارے مسائل تمام تر داخلی اسباب کا نتیجہ ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ملّت کے موضوع پر ہزاروں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ عرب دنیا کے امیر شکیب ارسلان کی کتاب ”لِمَاذَا تَأَخَّرَ الْمُسْلِمُونَ وَتَقَدَّمَ غَيْرُهُمْ“ اور برصغیر ہند کے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ”مَاذَا خَسِرَ الْعَالَمُ بِانْحِطَاطِ الْمُسْلِمِينَ“ جیسی بے شمار کتابیں مختلف زبانوں میں چھپی ہیں۔ ان سب کا مشترک انداز یہ ہے کہ ان میں مسلمانوں کے مسئلہ کا مطالعہ عروج اور زوال کی اصطلاحوں میں کیا گیا ہے۔

مطالعہ کا یہ طریقہ بلاشبہ غیر قرآنی ہے۔ قرآن کے مطابق، عروج اور زوال دونوں اضافی ہیں۔ قرآن کے نزدیک دونوں حالتیں ابتلاء کی حالتیں ہیں۔ یہ دونوں ہی کسی قوم کے لیے امتحان (test) کے پرچے ہیں۔ خدا کبھی کسی قوم کو غالب کرتا ہے اور کبھی اُس کو مغلوب کردیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ دیکھنا مقصود ہوتا ہے کہ قوم جب کسی حالت میں مبتلا ہوئی تو اُس نے کس قسم کا رسپانس (response) پیش کیا۔ (الرسالہ، جون 2004)

سوال

ہندستان کی کئی یونیورسٹیوں میں اور باہر کی کچھ یونیورسٹیوں میں بھی اسلامک اسٹڈیز کے نام سے شعبے قائم ہیں۔ ہمارے مدارس میں بھی اسلام کے مطالعہ کا انتظام ہے۔ یہ دونوں ایک

ہیں یا ان میں کوئی فرق ہے۔ سیکولر یونیورسٹیوں میں اور دینی مدارس میں اس اعتبار سے اگر کوئی فرق ہے تو وہ کیا ہے؟ (ندیم احمد سنابلی، دہلی)

جواب

سیکولر یونیورسٹیوں میں اسلام کے مطالعہ کا تصور اس سے مختلف ہے جو ہمارے دینی مدارس میں پایا جاتا ہے۔ دینی مدارس میں اسلام کا مطالعہ ایک مقدس الہامی مذہب کے طور پر کیا جاتا ہے۔ جب کہ سیکولر یونیورسٹی میں اسلام یا کسی اور مذہب کا مطالعہ صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ ایک تاریخی ظاہرہ یا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اصحاب مدارس کے مطالعہ کا طریقہ داخلی (subjective) ہے، اور اصحاب یونیورسٹی کا طریقہ خارجی (objective) ہے۔ اس کو ایک عملی مثال سے سمجھئے۔ مثلاً اسلام کے دورِ اول میں حسین ابن علی اور یزید ابن معاویہ کی فوجوں کے درمیان مسلح ٹکراؤ ہوا۔ یزید ابن معاویہ کی فوج نے حسین ابن علی کو شہید کر دیا۔ اس واقعہ کو اہل مدرسہ اس نظر سے دیکھیں گے کہ حسین ابن علی پیغمبر اسلام کے نواسے تھے اور پھر اسی جذباتی وابستگی کے تحت اپنی رائے قائم کریں گے۔ اس کے برعکس سیکولر ذہن کے لوگ اس کو سادہ طور پر صرف ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے لیں گے اور بے لاگ خارجی معلومات کی روشنی میں اس کا اندازہ (assessment) کریں گے۔

اس فرق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صاحب مدرسہ سارے معاملہ کو حسین کی معصومیت اور یزید کے ظلم کے نقطۂ نظر سے دیکھیں گے۔ اس کے برعکس، یونیورسٹی کے لوگ خالص خارجی حقائق کی روشنی میں اس پر رائے قائم کریں گے۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اہل مدرسہ یہ کہیں گے کہ "یزید پلید کی فوجوں نے نواسۂ رسول کو مظلومانہ طور پر شہید کیا" اس کے برعکس، دوسرا فریق یہ کہے گا کہ حسین ابن علی کے اقدام کی حیثیت دمشق کی خلافت کے نزدیک بغاوت کی تھی، اس لیے خلافتِ دمشق کی فوجوں نے حسین ابن علی کے خلاف جو اقدام کیا وہ وہی تھا جو ہر قائم شدہ حکومت کرتی ہے۔ (الرسالہ، اپریل 2002)

سوال

میرا خیال ہے کہ مدرسے کے بچوں کو دینی تعلیم، اللہ اور اس کے رسول کی پیروی کی تربیت کے ساتھ ساتھ انھیں ذریعۂ معاش میں خود کفیل بنانے کی بھی فکر کی جائے۔ بچوں کو مدرسے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُنھیں ہُنر بھی سکھائے جائیں۔ مدرسے میں دینی تعلیم کے ساتھ ان لڑکوں کو سلائی کی تربیت، ٹوپی بنانے کا ہنر، جائے نماز، لکڑی کے سامان تیار کرنے، لکڑی اور لوہے کے پائپ کے فرنیچر تیار کرنے کے ہنر اور کشیدہ کاری کے کام بھی سکھائے جائیں، تا کہ جب یہ لڑکے مدرسے کی تعلیم سے فراغت پا کر دنیاوی زندگی میں قدم رکھیں تو اس لائق ہو سکیں کہ دینی زندگی کے ساتھ ساتھ دنیاوی زندگی بھی سنوارنے میں کامیابی حاصل کر سکیں۔

عام اسکول اور کالجوں میں بھی لڑکوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ بھی job oriented یعنی روزگار سے منسلک نہیں ہوتی ہے۔ لیکن ان کی تعلیم چونکہ دنیاوی زندگی کے تقاضوں پر مبنی ہوتی ہے۔ یعنی ان کے courses of studies میں ایسے ایسے سبجیکٹ پڑھائے جاتے ہیں کہ وہ ملازمت کے ممکنہ امتحانات میں بیٹھ کر ملازمت حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس کے برعکس، مدرسے کی تعلیمات میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ (محمد ابوالکلام، پھلواری شریف، پٹنہ)

جواب

اِس تجویز سے مجھے اصولی طور پر اتفاق ہے۔ آج کل عام مزاج یہ ہے کہ مدرسے کی تعلیم کے ساتھ کسی ہنر کو شامل کرنے کی بات کی جائے تو لوگ اُس کو پسند نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ اِس طرح کی پیوندکاری سے دینی تعلیم کو نقصان ہوگا۔ مگر یہ بات سراسر غلط ہے۔ اس کا ایک تجرباتی ثبوت یہ ہے کہ قدیم روایتی دَور میں مدارس کے تعلیمی نظام کے ساتھ عام طور پر خطّاطی یا جلد بندی اور طِب جیسے پروفیشنل کام کا شعبہ بھی موجود رہتا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا کہ اِس

کی بنا پر تعلیم میں نقصان واقع ہوجائے۔ بلکہ تجربہ برعکس طور پر بتاتا ہے کہ پچھلے دَور میں مدارس سے بڑے بڑے علما نکلے۔ جب کہ موجودہ زمانے میں مدارس سے اُس طرح کے بڑے بڑے علما کی پیدائش تقریباً بند ہوگئی ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں کم ازکم دو چیزوں کی تعلیم وتربیت کو ہر مدرسے میں ضرور شامل کیا جائے۔ ایک ہے انگریزی زبان اور دوسری چیز ہے کمپیوٹر۔ مجھے یقین ہے کہ مروّجہ تعلیم میں کسی بھی قسم کا نقصان کیے بغیر ان دونوں چیزوں کو مدرسے کے تعلیمی نظام میں شامل کیا جاسکتا ہے۔(الرسالہ، جولائی 2006)

سوال

الرسالہ دسمبر 2005 کے شمارے میں ثانیہ مرزا کے لباس کے بارے میں خبر نامے کے تحت صفحہ 47 پر آپ کا تبصرہ پڑھنے کو ملا تو اس مسئلے پر دوسرے علما کے فتوے بے وزن و بے معنی محسوس ہوئے۔

آپ نے ثانیہ مرزا کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ بلا شبہ درست ہے، اوراس طرح کے سوالات کا اس کے سوا کوئی اور جواب نہیں ہوتا ہے۔لیکن بد قسمتی سے دوسرے علما اور اہل دانش اس طرح کے نت نئے مسائل کے بارے میں مثبت اور تعمیری وفکری جواب دینے سے ہمیشہ قاصر اور ناکام رہتے ہیں اور نتیجتاً ان کے غیر متعلق جوابات سے ہمیشہ فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ اوراس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی سوال کا جواب سرے سے دینا جانتے ہی نہیں ہیں۔(غلام نبی کشافی، کشمیر)

جواب

ہمارے مدارس میں افتاء نویسی کا باقاعدہ شعبہ ہوتا ہے اوراس کے تحت،فتووں کا جواب دینے کی تربیت دی جاتی ہے۔مگر افتاء نویسی کے اس شعبے میں ایک بنیادی کمی ہے۔وہ یہ کہ اِس شعبے کے تحت، مسائلِ فتویٰ تو بتائے جاتے ہیں مگر حکمتِ فتویٰ نہیں بتائی جاتی۔

حکمتِ فتویٰ سے میری مراد یہ ہے کہ مفتی کو یہ بتایا جائے کہ اس کو کب فتویٰ دینا ہے اور کب فتوے کی زبان استعمال نہیں کرنا ہے۔ مثلاً ایک شخص اگر خود اپنے لباس کے بارے میں فتویٰ پوچھے تو مفتی کو چاہیے کہ وہ اس کا جواب دے۔ لیکن اگر کوئی شخص ثانیہ مرزا کے بارے میں فتویٰ پوچھے، یا کسی امام کے وضع قطع کو لے کر فتویٰ پوچھے تو ایسے معاملے میں مفتی کو یہ جواب دینا چاہیے کہ تم جس کے بارے میں فتویٰ مانگ رہے ہو اس سے جا کر ملو اور اس کو تیار کرو کہ وہ خود اپنے بارے میں فتویٰ پوچھے۔ موجودہ شکل میں تمہارا طریقہ درست نہیں۔

اسی طرح ایک کیس اگر ملکی قانون کے تحت، فوج داری کا کیس ہو اور کوئی شخص اس کے بارے میں فتویٰ پوچھے تو مفتی کو یہ کہنا چاہیے کہ یہ ایک عدالتی معاملہ ہے۔ تم اِس بارے میں ہم سے فتویٰ مت پوچھو بلکہ اس معاملے میں عدالت سے رجوع کرو۔ اِسی طرح اگر کوئی شخص ایک ایسے معاملے میں فتویٰ پوچھے جس میں یقینی ہو کہ مفتی کا فتویٰ مؤثر نہیں ہوگا۔ مثلاً کوکا کولا کو پینے یا نہ پینے کا مسئلہ، تو ایسے معاملے میں بھی مفتی کو فتویٰ نہیں دینا چاہیے۔ بلکہ مفتی کو مولانا عبد الحق حقانی کی زبان میں یہ کہنا چاہیے کہ — میرا فتویٰ نہیں چلے گا ”کوکا کولا“ چل جائے گا۔

میری قطعی رائے ہے کہ جو شخص قدیم فقہی کتابوں میں لکھے ہوئے مسائل کو جانے اور حالاتِ زمانہ کو نہ جانے، اس کے لیے فتویٰ دینا جائز نہیں۔ (الرسالہ، جولائی 2006)

سوال

میں ماہ نامہ الرسالہ پچھلے دس برسوں سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ مجھے اس مشن نے بہت اندر تک متاثر کیا ہے، اور مجھے بالکل بدل دیا۔ ایک مرتبہ میں نے آپ سے ملاقات اور انٹرایکشن کیا تھا۔ اس وقت آپ نے مجھ سے الرسالہ کے متعلق فیڈ بیک مانگا تھا۔ لیکن میں اس وقت کچھ بول نہ پایا تھا۔ اب اس خط کے ذریعہ میں اسے لکھ رہا ہوں کہ میرے اندر الرسالہ کی وجہ

سے کیا کیا تبدیلیاں آئی ہیں۔ میری پیدائش 1989 میں ہوئی۔ نو سے پندرہ برس کی عمر تک میں نے گھر سے دورہ کر مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد کالج سے گریجویشن اور ایم اے کیا۔ الرسالہ مشن سے جو فائدہ ہوا، ان میں سے چند یہ ہیں۔

(1) پہلا فائدہ جو الرسالہ نے دیا، وہ ہے اسلام کی روح سے متعارف کرانا۔ میں ایک تعلیم یافتہ گھر میں پیدا ہوا، دینی ماحول میں رہا، مدرسے میں وقت بِتایا، مگر دین کو دریافت نہ کر پایا تھا۔ دین کے نام پر جو چیز پایا تھا وہ ہے منفی ذہن، شکایتیں، مسلک پرستی، اور قوم پرستی، وغیرہ۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ صبر وشکر جیسی فنڈامنٹل چیز بھی مَیں نہیں جان پایا تھا۔ یہ ماہ نامہ الرسالہ نے مجھے سکھایا۔ ماہ نامہ الرسالہ کی بات کو تحقیق کرنے کے لیے میں نے پورے قرآن کو پڑھا، اور ہزاروں احادیث پڑھی، تب جا کر مجھے یقین کے درجے میں صحیح اسلام حاصل ہوا۔

(2) دوسرا زبردست فائدہ یہ ہوا کہ میں نے دین کی سیاسی تعبیر کے انحراف کو سمجھا، اور نام نہاد مجاہد بن کر اپنی زندگی کو ہلاکت میں نہ ڈالا۔ ورنہ بچپن ہی سے مجھے جہاد کو اس طرح بتایا گیا تھا کہ گویا وہی اسلام کا اصل مشن ہے، اور وہی مسلمانوں اور اسلام کے مسئلہ کا حل ہے۔

(3) تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ آج آپ کی تعلیمات کی وجہ سے میں یقین (conviction) میں جیتا ہوں۔ جب میں مدرسہ سے نکلا تھا، نئے زمانے کی تبدیلیوں کو دیکھتا تھا، سمجھ نہیں پاتا تھا کہ سچائی کیا ہے۔ دل میں خدا، رسول اور آخرت کا یقین تو تھا، مگر ماڈرن ایج سے مَیں انھیں ریلیٹ (relate) نہیں کر پاتا تھا۔ اس کی وجہ سے میں کنفیوزن اور اسٹریس میں جیتا تھا۔ اس طرح میں نے پانچ برس تک گزار دیے۔ بڑی مشکل کا دور تھا یہ۔ کیوں کہ میں ہر ٹھاٹ اور ہر ڈسپلن کو پڑھتا، مگر اس میں یقین نہیں پاتا تھا۔ لیکن خدا کے فضل سے میں نے ماہ نامہ الرسالہ کے ذریعہ ماڈرن ایج کو اسلام کے ریفرنس میں صحیح طور پر دریافت کیا۔ مجھے اندھیرے سے روشنی ملی۔ مندرجہ بالا تبدیلیاں صرف علاماتی تبدیلیاں ہیں۔ ورنہ الرسالہ نے تو مجھے پوری طرح

بدل دیا، سب کچھ بدل دیا۔ آئندہ ان شاء اللہ میں اپنا وقت اور پونجی دین کے کام میں صرف کروں گا۔ دعا کیجیے کہ میں دعوت کے کام کو اپنا مشن بنا پاؤں، خدا مجھے معاف کرے، میرا تزکیہ کرے، اور مجھے جنت نصیب کرے۔ آخر میں میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے صحیح معنوں میں دین کا احیا کیا ہے۔ اللہ آپ کی اس عظیم ترین کوشش کو قبول کرے، اور آپ کو اس کا اعلیٰ ترین صلہ دے۔ آمین۔ (محمد اظہر مبارک، بھاگل پور)

جواب

میرا تجربہ ہے کہ صرف فارمل تعلیم، علم کے حصول کے لیے کافی نہیں۔ خواہ وہ سیکولر تعلیم ہو یا دینی مدرسے کی تعلیم۔ فارمل تعلیم جو اداروں میں ہوتی ہے، اس میں آدمی کسی دوسرے کی بتائی ہوئی باتوں کا علم حاصل کرتا ہے۔ مگر علم کا خزانہ اس سے بہت زیادہ ہے، جتنا کہ کسی بتانے والے نے آپ کو بتایا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی فارمل ایجوکیشن کے بعد خود مطالعہ کرے۔ خود مطالعے سے آدمی، خود دریافت کردہ علم کو حاصل کرے گا۔ اور خود دریافت کردہ علم ہی سے آدمی کو حقیقی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

ایجوکیشن کی دو قسمیں ہیں، فارمل ایجوکیشن اور انفارمل ایجوکیشن۔ الرسالہ مشن کی حیثیت انفارمل ایجوکیشن کی ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ فارمل ایجوکیشن پائے ہوئے لوگوں کو انفارمل ایجوکیشن مہیا کی جائے، تاکہ ان کی علمی کمی پوری ہو۔ دونوں طریقوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ دونوں تعلیمی طریقے ایک دوسرے کے لیے تکمیلی حصہ (complementary part) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں طریقوں کو ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً مدرسے کی تعلیم سے اگر دین کا روایتی علم حاصل ہوتا ہے تو انفارمل ایجوکیشن کے ذریعہ آدمی دور جدید سے واقفیت حاصل کرتا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ کسی انسان کے لیے دونوں ہی ضروری ہے۔ (الرسالہ، فروری 2017)

سوال

آج کا عالم اس کو کہا جاتا ہے جس کے نام کے ساتھ قاسمی، ندوی، مظاہری وغیرہ نسبتی لفظ لگا ہوا ہو۔ کیا عالم کی یہ تعریف درست ہے (مفتی محمد ظہیر قاسمی، ناندیڑ)

جواب

عالم ہونے کے لیے مدرسہ سے تحصیل علم کی شرط درست ہے۔ مگر یہ شرط درست نہیں کہ نام کے ساتھ قاسمی یا ندوی جیسا کوئی لفظ لگا ہوا ہو۔ نام کے ساتھ اس قسم کا لاحقہ لگانا اکابر علما کی روایت نہیں۔ مثال کے طور پر مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا شبلی نعمانی جیسے افراد جو مسلمہ طور پر عالم تھے مگر انہوں نے اپنے نام کے ساتھ ایسا کوئی لاحقہ نہیں لگایا۔ (الرسالہ، اکتوبر 1999)

سوال

میں جامعہ دارالسلام عمرآباد کا ایک طالب علم ہوں میں آپ کی تحریروں اور مضامین سے زیادہ متاثر ہوں اور میں بھی آپ جیسا ایک مشہور محرّر اور مصنف بننا چاہتا ہوں تو میں اس کے لیے کیا کروں؟ میں آپ کے پرچہ "الرسالہ" سے بہت متاثر ہوں۔ (شیخ اسماعیل بن شیخ افضل، حیدرآبادی)

جواب

ہر چیز کی ایک قیمت ہے۔ اسی طرح اچھا عالم اور اچھا مصنف بننے کی بھی ایک قیمت ہے۔ آپ وہ قیمت ادا کیجیے اور پھر آپ اچھے مصنف بن جائیں گے۔

سوال

حکمت یا وزڈم (wisdom) کیا ہے؟ حکیم (wise man) کس کو کہا جاسکتا ہے؟ میرا احساس یہ ہے کہ لوگوں میں اس کا واضح تصور نہیں ہے۔ اکثر لوگ محض خوش فہمی کی بنا پر کسی کو حکیم الاسلام اور کسی کو حکیم الامت کہنے لگتے ہیں۔ اس معاملہ کی وضاحت فرمائیں۔ (عبد السلام اکبانی، ناگپور)

جواب

حکمت یا وزڈم ایک اعلیٰ ترین ذہنی صفت ہے۔ میرے علم کے مطابق، انسانی تاریخ میں سب سے کم پائی جانے والی صفت یہی ہے۔ عام زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ حکمت ایک ایسی ذہنی صلاحیت ہے جو گہری بصیرت کے نتیجہ میں کسی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ برٹش کلرجی مین اور مصنف ولیم رالف انگ (William Ralph Inge 1860-1954) 1954 اس نے نہایت درست طور پر حکیم یا دانا شخص کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ دانا انسان وہ ہے جو چیزوں کی اضافی قدر کو جانے:

The wise man is he who knows the relative value of things.

اضافی قدر یا ریلیٹیو ویلو (relative value) کیا ہے انگریزی ڈکشنری میں اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے — کسی اور چیز کی نسبت سے اہمیت و معنویت ہونا:

Having significance in relation to something else

اس حکمت یا دانائی کی ایک تاریخی مثال حدیبیہ کا معاملہ ہے۔ اس موقع پر پیغمبر اسلام اور آپ کے مخالفوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا، اس کا ایک پہلو وہ تھا جو بظاہر سب کو دکھائی دیتا تھا۔ یعنی پیغمبر اسلام کا مخالفین کی شرائط کو یک طرفہ طور پر مان لینا۔ بظاہر یہ طریقہ اتنا نازیبا تھا کہ حضرت عمر نے اس کو دَنِیَّۃ قرار دیا یعنی ذلت کو اختیار کرنا (البدایۃ والنہایۃ، جلد 4، صفحہ

168)۔مگر اسی کے ساتھ اس معاملہ کا ایک اور پہلو تھا جو بظاہر معاہدہ کے وقت دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ یہ کہ کسی بھی طرح اگر ایسا ہو کہ باہمی ٹکراؤ ختم ہو جائے اور دونوں فریقوں کے درمیان معتدل فضا میں انٹرایکشن (interaction) ہونے لگے، تو لوگوں کے اندر اسلام کا مثبت تعارف عام ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے گا جب کہ بظاہر دشمنی پر آمادہ لوگ بھی اسلام کے قریبی مددگار بن جائیں گے (فصلت، 41:34)۔ جیسا کہ صلح حدیبیہ کے بعد عملاً پیش آیا۔

گویا حدیبیہ کے معاہدہ کا ایک پہلو وہ تھا جس کو ہر صاحبِ بصارت دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کا ایک اور اہم تر پہلو وہ تھا جس کو صرف صاحبِ بصیرت ہی دیکھ سکتا تھا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا (48:27)۔ یعنی، اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہیں جانی۔ اضافی قدر یا ریلیٹیو ویلو (relative value) کو جاننے کی اہمیت یہ ہے کہ اکثر حالات میں یہی پہلو عملی اعتبار سے فیصلہ کُن بن جاتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلم مفکرین کی سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ وہ اس حکیمانہ بصیرت سے خالی تھے۔ وہ سامنے کی چیزوں کو دیکھ کر اقدامات کرتے رہے۔ وہ ان دوسرے پہلوؤں کو دیکھنے سے قاصر رہے جو آخر کار فیصلہ کُن بننے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام اقدامات نہ صرف بے نتیجہ رہے بلکہ وہ الٹا نتیجہ پیدا کرنے والے (counter productive) ثابت ہوئے۔ مثال کے طور پر مصر اور پاکستان اور ایران میں اسلام پسندوں کا یہ سمجھ لینا کہ ان کی معاصر حکومت تمام خرابیوں کی جڑ (source of all evils) ہے۔ اگر وہ کسی طرح موجودہ حکمرانوں کو اقتدار سے ہٹا دیں تو وہاں شاندار طور پر اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ اسی طرح برصغیر ہند میں مسلم رہنماؤں نے یہ سمجھ لیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جغرافی تقسیم مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل ہے۔

ان تمام رہنماؤں کی مشترک کوتاہی یہ تھی کہ وہ صرف سامنے کی باتوں کو دیکھ سکے، وہ ان اضافی اسباب (relative factors) کو دیکھنے سے عاجز رہے جو آخر کار فیصلہ کُن بن کر ان کی تمام خوش فہمیوں کو تہ وبالا کردینے والے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان تمام رہنماؤں کی ہنگامہ خیز تحریکیں مسلمانوں کی تباہی میں اضافہ کے سوا کوئی اور نتیجہ پیدا نہ کرسکیں۔ اسی حقیقت کو حضرت عمر فاروق نے ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے کہ عقل مند وہ نہیں ہے جو شر کے مقابلہ میں خیر کو جانے۔ عقل مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے کم تر شر کون سا ہے: لَيْسَ الْعَاقِلُ مَنْ يَعْرِفُ الْخَيْرَ مِنَ الشَّرِّ وَلَكِنَّهُ الَّذِي يَعْرِفُ خَيْرَ الشَّرَّيْنِ (ذم الهوىٰ لابن الجوزي، صفحہ 8)۔

(الرسالہ، جنوری 2000)

خاتمہ

جدید انسان کی تلاش

زین فرانسس ریویل (Jean-Francois Revel, 1924-2006) کی کتاب مارکس یا مسیح کے بغیر (Without Marx or Jesus) فرانس میں 1970 میں شائع ہوئی۔ کتاب میں مصنف نے فرنچ شاعر اور نقاد بوڈیلیئر (Charles-Pierre Baudelaire, 1821-1867) کا قول نقل کیا ہے جس نے تجویز کیا تھا کہ انسانی حقوق کے اعلان میں دو مزید حقوق شامل کیے جائیں۔ ایک، آپ اپنی تردید کرنے کا حق۔ دوسرے کنارہ کشی کا حق۔

> The right to contradict oneself, and the right to walk away. (p. 209)

امریکی نوجوان آج اسی انقلاب کی طرف جا رہا ہے۔ ایک طرف وہ ایک ایسے سماج کو ردّ کر رہا ہے جس کا محرک صرف منافع ہو اور جس پر صرف اقتصادی امور کا غلبہ ہو۔ دوسری طرف اسے روایتی مذاہب پر بھی اطمینان نہیں۔ کیوں کہ اس کے نزدیک بہترین مذہب وہ ہے جسے آدمی خود دریافت کرے۔

امریکی نوجوانوں میں ابھرنے والے رجحانات کے چند نمایاں پہلو یہ ہیں: اخلاقی قدروں کی طرف واپسی کا رجحان، محض اقتصادی اور تکنیکی سماجی مقاصد کو رد کرنا، اور قدرتی ماحول کو تجارتی مفاد سے زیادہ اہمیت دینا۔ مصنف کے مطابق، ”آج امریکا میں ایک نیا انقلاب جنم لے رہا ہے، جو انسانیت کے لیے نجات کی راہ پیش کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مبنی بر ٹیکنالوجی تہذیب کو منزل سمجھنے کے بجائے اسے ایک ذریعہ کے طور پر لیا جائے۔ اور چونکہ نہ تو اس تہذیب کو مکمل طور پر ترک کرنا ہمارے لیے فائدہ مند ہے، اور نہ ہی اس کا جوں کا توں برقرار رکھنا مفید، اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کریں جس سے ہم اس تہذیب کو مکمل طور پر ترک کرنے کے بجائے اسے ایک نئی اور بہتر صورت دے سکیں۔“

Today in America a new revolution is rising. It is the revolution of our time. It is the only revolution that involves radical, moral, and practical opposition to the spirit of nationalism. It is the only revolution that, to that opposition, joins culture, economic and technological power, and a total affirmation of liberty for all in place of archaic prohibitions. It, therefore, offers the only possible escape for mankind today: the acceptance of technological civilization as a means and not as an end, and—since we cannot be saved either by the destruction of the civilization or by its continuation—the development of the ability to reshape that civilization without annihilating it. (p. 242)

یہ ذہن جس کی نمائندگی اس کتاب میں کی گئی ہے، ایک ایسے آدمی کی بے چینی کی طرح ہے جسے خود اپنی بے چینی کا سبب معلوم نہ ہو۔ امریکی نوجوان مادی تہذیب سے، جس کی آخری نمائندگی مارکس نے کی، مکمل طور پر غیر مطمئن ہو چکا ہے۔ وہ دوبارہ اس "ماضی" کو دیکھنے لگا ہے جس کو اس کے باپ دادا نے چھوڑ دیا تھا۔ مگر یہاں "ماضی" کی نمائندگی کرنے والی جو چیز ملتی ہے وہ عیسائیت ہے۔

عیسائیت اپنے موجودہ ڈھانچے کے ساتھ خالص علمی و عقلی ذہن کو اپیل نہیں کرتی۔ اس لیے وہ "مارکس" کے ساتھ "مسیح" کا بھی باغی ہو جاتا ہے۔ تاہم جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بغاوت کے بعد وہ جس چیز کا طالب ہے، وہ اس کے اپنے الفاظ میں وہی چیز ہے جس کا جواب صرف مذہب کے اندر ہے تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ اپنے مجہول احساس کے ساتھ اسی چیز کی تلاش میں ہے جس کو مذہب کہتے ہیں۔ مصنف نے اپنی کتاب کا نام "نہ مارکس نہ مسیح" رکھا ہے۔ مگر باعتبارِ حقیقت اس کا نام ہونا چاہیے تھا "نہ مارکس نہ مروجہ عیسائیت"۔

میڈالین ایم اوہیئر (Madalyn Murray O'Hair, 1919-1995) امریکہ کی مشہور ترین ملحد خاتون ہیں۔ وہ کھلم کھلا اپنے الحاد کی تبلیغ کرتی ہیں۔ پکے خدا پرست والدین کی یہ بیٹی اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے:

”مجھے ان کے اعتقادات کا علم تھا اور احترام بھی کرتی تھی۔ مگر 13 سال کی عمر میں اتوار کا پورا دن انجیل پڑھتے رہنے کے بعد میں اس کی یکسر خلافِ عقل باتوں سے متنفر ہوگئی۔“

انسان مذہب کی طرف لوٹنا چاہتا ہے مگر مذہب کی غلط نمائندگی اس کو دوبارہ مذہب سے دور لے جا رہی ہے۔ یہ ہے دور جدید کا سب سے بڑا المیہ۔ (الرسالہ، مئی جون 2025)

اصل کام

سلمان رشدی (پیدائش 1947) کی ایک ناول ہے جس کا نام ہے — آدھی رات کے بچّے:

“Midnight's Children”

اس کتاب میں سلمان رشدی نے ناول کے کردار کے حوالے سے کہا ہے کہ وہ عقیدہ اور بے عقیدگی کے درمیان جھول رہا تھا:

“He was…trapped between belief and disbelief.”

رشدی کا یہ بیان حقیقت میں اس کے اپنے دل کی آواز ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں مذہب کے معاملے میں یقین اور بے یقینی کے درمیان لٹکا ہوا ہوں۔ یہ صرف ایک شخص کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک پوری نسل کا معاملہ ہے۔ سلمان رشدی نے جو بات کہی ہے، وہی بے شمار مسلمانوں کی بات ہے۔ مسلمانوں کی نئی نسل جس کی تعلیم جدید ماحول میں ہوئی ہے اس کا کم از کم 75 فیصد حصہ اسی قسم کی بے یقینی میں مبتلا ہے۔

دسمبر 1988ء میں جب کہ میں امریکا میں تھا، مجھے وہاں کے ایک اسلامی مرکز میں لے جایا گیا۔ یہ مرکز جس خطہ میں واقع ہے وہاں تادم تحریر تقریباً ایک لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ میں

نے منتظمین سے پوچھا کہ اس علاقہ کے ایک لاکھ مسلمانوں میں سے کتنے لوگ ہیں جو اسلامی مرکز سے جڑے ہوئے ہوں۔ ایک ذمہ دار نے جواب دیا کہ دس فیصد مسلمان ہے۔ حاضرین میں سے دوسرا شخص بولا کہ آپ مبالغہ کر رہے ہیں، بمشکل 5 فیصد تعداد ہوگی جو اس مرکز سے جڑی ہوئی ہو۔

مجھے بتایا گیا کہ جو مسلمان امریکا میں آباد ہیں ان کی نئی نسلوں کی بیشتر تعداد اسلام سے بالکل ناواقف ہو چکی ہے۔ ان کو نماز، روزے سے کوئی مطلب نہیں، جنس اور شراب اور غذا کے معاملہ میں ان کے طریقے وہی ہیں جو دوسرے آزاد خیال امریکیوں کے ہیں۔ وہ بس برائے نام مسلمان ہیں۔

یہ کوئی انکشاف کی بات نہیں۔ ہر وہ شخص جو مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل سے واقف ہے، وہ اس بات کو بخوبی جانتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ”رشدی“ ہمارے درمیان ایک نہیں، بلکہ بے شمار تعداد میں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کی ”رشدیت“ یعنی مذہب بیزاری ظاہر ہو چکی ہے، اور کسی کی اب تک چھپی ہوئی ہے۔

مسلم نسل کی یہ صورتِ حال موجودہ زمانہ کے مسلم دینی رہنماؤں کے لیے ایک زبردست چیلنج ہے۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کی ترقی یافتہ زبانوں میں اعلیٰ معیار کا اسلامی لٹریچر تیار کر کے شائع کیا جائے تاکہ ”ارتداد ذہنی“ میں مبتلا ہونے والے ان بے شمار مسلمانوں کی بے یقینی کو دوبارہ یقین میں تبدیل کیا جا سکے۔ ان کو بے عقیدگی کے دلدل سے نکال کر دوبارہ عقیدہ کی صالح زمین پر کھڑا کیا جائے۔

راقم الحروف نے الرسالہ جولائی 1987ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا ”دور جدید کی تحریکیں“۔ اس مضمون میں جدید لٹریچر کی اہمیت کو بتاتے ہوئے کہا گیا تھا کہ جدید لٹریچر دورِ جدید میں اسلام کے احیا کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ مگر کتابوں کے ان گنت انبار کے باوجود، یہ ضرورت ابھی غیر تکمیل شدہ حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ حتی کہ لوگوں کے اندر اس کا حقیقی شعور بھی موجود نہیں۔

میں نے مزید لکھا تھا کہ میں اُردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دینی رہنما کوئی ایک بھی ایسی قابل ذکر کتاب وجود میں نہ لا سکے جو جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو۔

موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کا اولین اور اہم ترین کام یہ ہے کہ وہ جدید علوم کو پڑھیں۔ وقت کی زبانوں کو سیکھیں۔ آج کے طریقِ استدلال اور اسلوبِ تحریر میں مہارت پیدا کریں۔ اور اس کے بعد اسلام کی ابدی تعلیمات کو موثر اور طاقتور انداز میں پیش کریں تاکہ آج کا انسان اور جدید مسلم نسل اس کو پڑھے اور اس کے ذریعہ سے اپنے کھوئے ہوئے عقیدہ کو دوبارہ حاصل کرے۔ مگر جدید اسلوب میں طاقتور لٹریچر وجود میں لانا تو درکنار، موجودہ مسلم رہنما قرآن کا ایک صحیح انگریزی ترجمہ بھی تیار کرکے شائع نہ کر سکے۔

ایسی حالت میں مسلم رہنماؤں کا سلمان رشدی جیسے لوگوں کے خلاف ہنگامہ کرنا حقیقتاً خود اپنی بے عملی پر پردہ ڈالنے کے ہم معنی ہے۔ یہ اس کام کا کریڈٹ لینے کی کوشش کرنا ہے جس کو انہوں نے سرے سے انجام ہی نہیں دیا اور قرآن کا فیصلہ ہے کہ جو لوگ کچھ کیے بغیر کریڈٹ لینا چاہیں ان کے لیے خدا کے یہاں عذاب ہے، نہ کہ انعام (3:188)۔

ہمارے لکھنے والوں نے موجودہ زمانہ میں جو اسلامی کتابیں تیار کی ہیں وہ غیر منحرف ذہن کے لیے مفید ہوسکتی ہیں۔ مگر منحرف ذہن کے لیے وہ سراسر غیر مفید ہیں۔ کیونکہ وہ منحرف ذہن کے تقاضے کو بالکل پورا نہیں کرتیں۔

ان تمام کتابوں کا یکساں حال یہ ہے کہ ان میں یہ فرق نہیں کیا گیا کہ اعتقادی یا روایتی استدلال کیا ہے اور عقلی یا سائنسی استدلال کیا ہے۔ جو لوگ ان دونوں کے فرق کو نہیں جانتے، وہ جدید نسل کے لیے اسلامی لٹریچر کیسے فراہم کرسکتے ہیں؟

یہ کتابیں تقریباً سب کی سب اعتقادی استدلال کے اصول پر لکھی گئی ہیں۔ اعتقادی استدلال صرف وہاں کارآمد ہوتا ہے جہاں زیر بحث مسئلہ میں دونوں فریق بنیادِ استدلال کے

بارے میں ایک رائے رکھتے ہوں۔ مگر جہاں اس بارے میں دونوں فریق کی سوچ الگ الگ ہو، وہاں اعتقادی طریق استدلال بالکل بے اثر اور بے قیمت ہوجاتا ہے۔

جدید نسل جو جدید افکار سے متاثر ہے، اس کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی پیشگی مسلّمہ پر یقین نہیں رکھتی۔ اس کا تصور یہ ہے کہ جو دعویٰ کیا جائے اس کو سائنس اور تاریخ کے معلوم حقائق کی بنیاد پر ثابت ہونا چاہیے۔ گویا پہلے طریق استدلال کی بنیاد اگر اعتقادی مسلّمات پر قائم ہے تو دوسرے طریق استدلال کی بنیاد عقلی مسلّمات پر۔ مگر موجودہ زمانہ میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں ہمارے لکھنے والوں نے جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں اسلام کو حقیقی معنوں میں جدید انسان کے اپنے مسلمات کی بنیاد پر پیش کیا گیا ہو۔

دوسری کمزوری جو ان تمام کتابوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کتابیں افضلیت اور برتری کی اصطلاحوں میں لکھی گئی ہیں۔ ان کا مقصد براہ راست یا بالواسطہ طور پر یہ ہوتا ہے کہ اسلام یا مسلمانوں کی برتری ثابت کریں۔ اس قسم کا لٹریچر کچھ مسلمانوں کو خوش کر سکتا ہے مگر وہ جدید ذہن کے لیے ہرگز مؤثر نہیں ہوسکتا۔

جدید ذہن کو اپیل کرنے والا لٹریچر صرف وہ ہوگا جس میں یہ دکھایا گیا ہو کہ اسلام کی تعلیمات عین فطرت کے مطابق ہیں۔ اسلام اور انسانی فطرت دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ (counter part) ہیں۔

تیسری کمزوری جو جدید پیدا شدہ لٹریچر میں بہت زیادہ عام ہے، وہ یہ کہ یہ کتابیں دعوت کی زبان میں نہیں لکھی گئیں، بلکہ عداوت کی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے لکھنے والے تقریباً سب کے سب اپنے سینہ میں یہ احساس لیے ہوتے ہیں کہ موجودہ دنیا اسلام کی دشمن ہو گئی ہے۔ ہر طرف اسلام کے خلاف سازشیں کی جارہی ہیں۔ ہر قوم اسلام کو مٹانے پر تلی ہوئی ہے۔ اس نفسیات کے تحت جو لٹریچر تیار کیا جائے وہ عداوتی لٹریچر ہوگا، نہ کہ دعوتی لٹریچر۔

جو شخص اپنے سینہ میں مدعو کے خلاف نفرت لیے ہوئے ہو وہ پہلے مرحلہ ہی میں اس کام کے

لیے اپنے آپ کو نااہل ثابت کر رہا ہے۔ دعوتی کلام کے لیے مدعو کے حق میں محبت کی نفسیات درکار ہے، نہ کہ نفرت کی نفسیات۔ اس لیے ہمارے لکھنے والے جب تک اپنے سینہ کو منفی نفسیات سے خالی نہ کریں، ان کا دعوتی لٹریچر تیار کرنا ایک جرم ہے، نہ کہ کوئی واقعی اسلامی خدمت۔

سلمان رشدی جیسے واقعات کے مقابلہ میں مسلم رہنماؤں کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ اس کو مرتد قرار دے کر ان کے اوپر اسلامی سزا کے نفاذ کا اعلان کریں۔ اس کے برعکس، ان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ان کے کیس کو سمجھیں۔ ان کے ذہنی کنفیوزن کا مطالعہ کریں۔ ان کے فکر ونظریہ سے پوری واقفیت حاصل کریں۔

اس طرح کے گہرے مطالعہ کے بعد ان کا فرض ہے کہ وہ اسلام پر ایسی کتابیں تیار کریں جو اس قسم کے لوگوں کو مطمئن کرنے والی ہوں۔ جو ان کی سوئی ہوئی فطرت کو جگا کر انھیں ان کے رب کے قریب کر سکیں۔

موجودہ زمانہ کے منحرف ذہنوں میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو امکانی طور پر اس کے لیے تیار ہیں کہ وہ اسلام کو اپنے دل کی آواز پا کر اسے قبول کر لیں۔ مگر یہ امکان صرف اس وقت واقعہ بن سکتا ہے جب کہ دین حق کو اس کی مانوس زبان اور ان کے قابل قبول اسلوب میں ان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

ایک پیاسا آدمی پانی کا گلاس صرف اس وقت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے جب کہ اسے یقین ہو کہ اس گلاس کے اندر جو چیز ہے وہ پانی ہے۔ اسی طرح ہر پیدا ہونے والا بلا شبہ حق کا طالب ہے۔ مگر جو تحفہ اس کے سامنے پیش کیا جائے اس کی بابت پہلے اس کو اس کی مانوس زبان میں یہ یقین دلانا ہوگا کہ یہ وہی مطلوب چیز ہے جس کو تم اپنی فطرت کے زیر اثر تلاش کر رہے تھے۔
(شتم رسول کا مسئلہ)

اعلائے کلمۃ الاسلام

اسلامی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلام کے آغاز کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک کم وبیش دنیا کے بڑے حصے پر مسلمانوں کی سلطنت قائم رہی۔ اس زمانے میں مسلمان واحد سپر پاور کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر نشاۃ ثانیہ کے بعد مغربی قوموں کا عروج ہوا اور مسلمانوں کی تمام سلطنتیں ختم ہوگئیں۔ مثلاً اسپین میں دولت غرناطہ، ترکی میں عثمانی خلافت، انڈیا میں مغل سلطنت، وغیرہ۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد مسلم ملکوں کو سیاسی آزادی ملی مگر یہ آزادی دوبارہ اقتصادی غلامی کے ہم معنی بن گئی۔

دور جدید میں مسلم سلطنتوں کا خاتمہ مسلمانوں کی اس غلط فکری کا آغاز تھا۔ مزید غلطی یہ ہوئی کہ مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں کے سیاسی زوال کو اسلام کے کلمے کے زوال کے ہم معنی سمجھ لیا۔ حالانکہ دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔

دور جدید میں مسلم سلطنتوں کا زوال دراصل کچھ مسلم حکمراں خاندانوں (dynasties) کا زوال تھا۔ وہ ہرگز اسلام کا زوال نہ تھا۔ دور جدید میں اسلام کا زوال دراصل یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات جدید سماج میں بے جوڑ (misfit) ہوکر رہ گئی ہیں۔ یہ واقعہ بلاشبہ مغربی تہذیب کے عروج کے بعد پیش آیا۔ تاہم اس کا کوئی تعلق مسلم سیاست کے زوال سے نہ تھا۔ اگر اس کا تعلق مسلم سیاست کے زوال سے ہوتا تو اب تک وہ ختم ہو چکا ہوتا۔ کیوں کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد دوبارہ مسلمانوں کی آزاد سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی 57 آزاد سلطنتیں ہیں، مگر وہ اسلام کے نظریاتی زوال کے عمل کو روک نہ سکیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کے نظریاتی زوال کا سبب اس سے زیادہ گہرا ہے جو کہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کا سبب بنا۔ اس معاملے کو درست طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں پچھلی تاریخ کی ایک تصویر سامنے رکھنی ہوگی۔ اسی کے بعد ہی اس معاملے کی نوعیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اسلام کا آغاز 610 عیسوی میں ہوا۔ اسلام توحید کا مذہب تھا۔ جب کہ اُس وقت تقریباً

ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ مشرکانہ کلچر ہر ملک میں چھایا ہوا تھا، جس کو وقت کے حکمرانوں کی سیاسی سپورٹ حاصل تھی۔ اُس وقت اسلام کا مقابلہ توحید ورسس شرک کی حیثیت رکھتا تھا۔ دورِ اول کے مسلمانوں نے شرک کے مقابلے میں ہر قسم کی قربانیاں دیں۔ یہاں تک کے شرک کا دَور عملاً ختم ہو گیا اور توحید کا دَور شروع ہو گیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ دور تقریباً ایک ہزار سال تک چلتا رہا۔ دوبارہ ایسا نہیں ہوا کہ شرک طاقتور ہو کر مذہبِ توحید کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے۔ مگر قرونِ وسطیٰ میں مغرب کا وہ انقلاب، جس کو نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے، ایک نئے طاقت ور حریف کی حیثیت سے سامنے آیا۔ اس کا واضح آغاز سولھویں صدی میں ہوا۔ اور چند صدیوں کے عمل کے بعد اس نے انتہائی طاقت ور حیثیت حاصل کرلی۔

اسلام کا یہ نیا طاقت ور حریف وہ تھا جس کو ایک لفظ میں سائنٹفک الحاد کہا جا سکتا ہے۔ سائنس علمِ فطرت کی حیثیت سے نہ مذہبی تھی اور نہ غیر مذہبی۔ مگر جدید سائنسی دَور میں یورپ میں ایسے مفکرین اٹھے جنھوں نے سائنس کی دریافتوں کو بطور خود الحاد کے حق میں استعمال کیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے یہ اعلان کردیا کہ جدید سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ تمام مذاہب، بشمول اسلام، صرف توہم پرستی کی پیداوار تھے۔ اس موضوع پر پچھلے دوسو سالوں میں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا ٹائٹل اس نوعیت کی تمام کتابوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ ٹائٹل تھا:

God is dead.

سائنٹفک الحاد نہایت تیزی سے پھیلا۔ یہاں تک کہ وہ علم کے تمام شعبوں پر چھا گیا۔ اس سائنٹفک الحاد نے بظاہر جدید دلائل کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ خدا کا کوئی وجود نہیں، وحی کی کوئی حقیقت نہیں، کوئی کتاب مقدس کتاب نہیں، جنت اور جہنم سب محض فرضی کہانیاں ہیں۔

اس جدید فکر کا آغاز سر آئزک نیوٹن (وفات 1727) سے ہوا۔ پھر ایک کے بعد ایک ایسے سائنس داں پیدا ہوئے جن کی تحقیقات جدید الحاد کو تقویت دیتی رہیں۔ اگر چہ ان سائنس

دانوں میں سے کوئی بھی سائنس دان معروف معنوں میں، منکرِ خدا یا منکرِ مذہب نہیں تھا، مگر ان کی تحقیقات نے بالواسطہ طور پر جو فکر پیدا کیا وہ یہی تھا۔

مثال کے طور پر نیوٹن اور دوسرے سائنس دانوں نے یہ دکھایا کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ایک پرنسپل آف کازیشن کام کر رہا ہے۔ قدیم تو ہماتی زمانے میں انسان نیچر کو پُراسرار سمجھتا تھا۔ فطرت کے ہر واقعے کے بارے میں وہ یہ گمان کرتا تھا کہ جو ہوا ہے وہ پُراسرار طور پر ہو گیا ہے۔ مگر سائنس نے جب واقعات کے پیچھے اس کا ایک مادّی سبب دریافت کیا تو شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ مان لیا گیا کہ ان کا خالق خدا نہیں ہے بلکہ کچھ اسباب ہیں جو واقعات کی تخلیق کر رہے ہیں۔ چنانچہ جدید ملحد مفکرین کی طرف سے یہ دعویٰ کر دیا گیا:

> If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes. (*Religion without Revelation* by J. Huxley, 1929, p. 46)

یہ الحاد جو علم کے زور پر اٹھا، یہی وہ چیز تھی جس کے بعد وہ صورتِ حال پیدا ہو گئی جس کو کلمۂ اسلام کی مغلوبیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ خدا کے وجود پَر شک کرنے لگے۔ مذہب کی صداقت ان کے نزدیک مشتبہ ہو گئی۔ اسلام ان کو دَورِ سائنس سے پہلے کا مذہب دکھائی دینے لگا۔

یہ ایک coincidence تھا کہ جس زمانے میں مسلم سلطنتوں کو زوال ہوا تقریباً اسی زمانے میں اسلام کی نظریاتی صداقت کو بھی مشتبہ سمجھا جانے لگا۔ تاہم یہ ایک زمانی اتفاق تھا، ورنہ ایسا ہرگز نہ تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کی بنا پر اسلام کا نظریاتی زوال پیش آ گیا ہو۔ مگر اس دَور کے تقریباً تمام مسلم مفکرین اس غلط فہمی کا شکار رہے۔ انہوں نے معاملے کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیے بغیر یہ سمجھ لیا کہ مسلمانوں کے سیاسی زوال ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام کو نظریاتی زوال پیش آ رہا ہے۔ اس غلط اندازے کی بنا پَر انہوں نے ساری دنیا میں سیاسی جہاد شروع کر دیا۔ مسلم ملکوں اور غیر مسلم ملکوں دونوں جگہ پر کوشش کی جانے لگی کہ مسلمان کے سیاسی اقتدار کا دَور دوبارہ

واپس لایا جائے۔ ان کا مشترک طور پر یہ خیال تھا کہ جب تک ایسا نہ ہو، اسلام کا کلمہ دوبارہ غالب نہ ہو سکے گا۔ حالاں کہ کلمۂ اسلام کے غلبے سے مراد حق کا نظریاتی غلبہ تھا، جب کہ مسلم اقتدار کا مطلب صرف یہ تھا کہ ایک کمیونٹی یا ایک خاندان کی سیاسی حکومت قائم ہو جائے۔

مگر یہ سوچ سرتاسر بے بنیاد ہے، اور اس کے بے بنیاد ہونے کے لیے یہ ثبوت کافی ہے کہ دو سو سالہ سیاسی جہاد کے باوجود کلمۂ اسلام کا غلبہ ممکن نہ ہو سکا۔ میسور کے سلطان ٹیپو (وفات 1799) سے لے کر فلسطین کے یاسر عرفات (وفات 2004) تک دو سو سال کا طویل زمانہ ہے۔ اس مدت میں مسلمانوں نے اپنے خیال کے مطابق غلبۂ اسلام کے لیے اپنے جان و مال کی اتنی زیادہ قربانیاں دی ہیں جو پچھلے چودہ سو سال کی مجموعی قربانیوں سے بھی زیادہ ہیں، مگر یہ ساری قربانیاں سرتاسر بے سود ہو گئیں۔ یہاں تک کہ دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں مسلمانوں کو یہ فائدہ ملا کہ ان کی پچاس سے زیادہ آزاد سلطنتیں بن گئیں، مگر جہاں تک غلبۂ اسلام کا سوال ہے، وہ بدستور ایک بے تعبیر خواب بنا ہوا ہے۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں اسلام کی مغلوبیت کا معاملہ، اسلام کی نظریاتی مغلوبیت کا معاملہ ہے۔ یہ مغلوبیت اس لیے پیش آئی کہ اسلام کو موجودہ زمانے کی علمی اور نظریاتی تائید حاصل نہ ہو سکی۔ اب دوبارہ یہ غلبہ صرف اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ زمانۂ جدید کے معیار کے لحاظ سے وقت کی علمی اور نظریاتی تائید اسلام کے حق میں فراہم کی جائے۔

اسلام کے ابتدائی ظہور کے بعد اسلام کو جو غلبہ حاصل ہوا، وہ بھی حقیقتاً مسلمانوں کے سیاسی غلبے کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ وہ بھی اسلام کے نظریاتی غلبہ کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، خلافتِ عباسیہ کے دَور میں مسلمانوں نے اس زمانے کے علوم کا مطالعہ کیا۔ اس زمانے تک علمِ انسانی نے جو لٹریچر تیار کیا تھا، ان کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا، اور پھر بہت بڑے پیمانے پر اُن کا جائزہ لیا گیا۔ ان علوم کی تعلیم کے لیے تاریخ کے سب سے بڑے ادارے قائم کیے گئے۔ اسی

کی ایک علامتی مثال یہ ہے کہ راجر بیکن (وفات 1292) جس نے انگلینڈ میں سب سے پہلی یونیورسٹی (کیمبرج یونیورسٹی) قائم کی، وہ قُرطبہ کی مسلم یونیورسٹی کا پڑھا ہوا تھا۔

یہ ایک لمبی تاریخ ہے اوراس پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر پروفیسر ہٹی کی کتاب ہسٹری آف دی عربس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس دَور کے مسلمانوں نے اپنے زمانے کے علوم پڑھ کر اسلام کی علمی تشریح کی اور اسلام کی علمی بالادستی کو دلائل کی زبان میں ثابت کیا۔ حتی کہ اہلِ علم کے لیے اسلام کا نظریہ ایک ایسا نظریہ بن گیا جو پوری طرح ایک علمی مسلّمہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسلام کو ماننا علم کو ماننا تھا، اور اسلام کا انکار کرنا، علم کا انکار کرنا تھا۔

قدیم زمانے میں جن علوم کو ترقی حاصل ہوئی وہ زیادہ تر فلسفیانہ حیثیت رکھتے تھے۔ ان علوم کی بنیاد قدیم یونانی منطق پر قائم تھی۔ جس کو قیاسی منطق (syllogism) کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے اس یونانی منطق کو استعمال کر کے اس کو بھر پور طور پر اسلام کا مؤید بنا دیا۔ یہاں تک کہ خالص علمی طور پر کسی کے لیے یہ گنجایش باقی نہ رہی کہ وہ علمی بنیاد پر اسلام کی صداقت کا انکار کر سکے۔

مگر موجودہ زمانے میں جدید سائنس کے ظہور کے بعد پوری صورتِ حال بالکل بدل گئی۔ جدید سائنس نے قدیم سیاسی منطق کو ڈھا دیا۔ اب ایک نئی منطق ظہور میں آئی، جس کو سائنسی منطق (scientific logic) کہا جاتا ہے۔ قدیم یونانی منطق قیاسات پر قائم تھی، اس کے مقابلے میں جدید سائنسی منطق حقائق پر قائم ہوتی ہے۔ اس فرق نے قدیم دَور کو ختم کر دیا۔ اسی کے ساتھ وہ دَور بھی ختم ہو گیا جو اسلامی نظریات کے لیے علمی بنیاد بنا ہوا تھا۔ گویا کہ کلمۂ اسلام کی مغلوبیت کا سبب اس کے حق میں نظریاتی بنیاد (base) کا خاتمہ تھا، نہ کہ کسی سیاسی بنیاد کا خاتمہ۔

دَورِ جدید میں جب یہ علمی انقلاب آیا تو ضرورت تھی کہ مسلمانوں میں دوبارہ وہی علمی سرگرمیاں جاری ہوں جو عباسی خلافت کے دَور میں جاری ہوئی تھیں۔ اب ضرورت تھی کہ مسلم علماء جدید افکار کو پڑھ کر ان کو گہرائی کے ساتھ سمجھیں اور اسلام کی نظریاتی بنیاد کو ازسرِ نو جدید علمی مسلَّمات پر قائم کریں، جیسا کہ دورِ قدیم کے مسلم علماء نے اپنے زمانے میں کیا تھا۔ مگر بَروقت

ایسا نہ ہوسکا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اِس زمانے کے تقریباً تمام علماء نظریاتی اسلام اور مسلم اقتدار کو الگ کرکے نہ دیکھ سکے:

They failed to differentiate between Muslim rule and Islamic ideology.

اسی بے خبری کی بنا پر انہوں نے یہ سمجھا کہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام کو نظریاتی زوال پیش آ گیا۔ چنانچہ وہ مغربی قوموں کے خلاف سیاسی لڑائی میں مشغول ہو گئے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک یہی قومیں مسلمانوں کے سیاسی زوال کا سبب تھیں۔ مگر یہ ایک بھیانک قسم کا غلط اندازہ تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے ایک شخص جو تعلیم حاصل نہ کرنے کی وجہ سے جاہل رہ گیا ہو، اس کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے جسمانی طاقت کا انجکشن دیا جانے لگے۔ حالاں کہ یہ معلوم ہے کہ کوئی شخص صرف جسمانی تندرستی کی بنا پر تعلیم یافتہ نہیں بن سکتا۔

اس معاملے میں مزید غلطی یہ ہوئی کہ مغربی قوموں سے سیاسی نفرت کی وجہ سے مسلم علماء اور رہنما مغرب کی زبان اور مغرب کی سائنس سے بھی نفرت کرنے لگے۔ انہوں نے کوشش کی کہ ان کی نسلیں مغربی تعلیم سے دور رہیں تاکہ ان کا ایمان اور اسلام محفوظ رہے۔ حالاں کہ یہ معاملہ سادہ طور پر تحفظِ اسلام کا مسئلہ نہ تھا بلکہ وہ اسلام کو دوبارہ نئی علمی بنیاد فراہم کرنے کا مسئلہ تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے یہ دہرا غلط اندازہ تھا۔ جس نے مسلمانوں کو اس شعور سے محروم کردیا کہ وہ دوبارہ اسلام کے لیے مضبوط علمی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کرسکیں۔

اسلام عین اسی عالمی قانون کا ایک مظہر ہے، جس کے تحت ساری کائنات چل رہی ہے۔ اسلام فطرت کا دین ہے۔ اس لیے اسلام اسی طرح ہمیشہ زندہ رہتا ہے جس طرح سورج ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ کوئی بدلی وقتی طور پر روشن سورج کو ڈھانپ سکتی ہے۔ لیکن بدلی کے ہٹتے ہی دوبارہ سورج کا روشن چہرہ اسی طرح سامنے آجاتا ہے جس طرح وہ پہلے تھا۔

سورج کے چہرے سے بدلی کے چھٹنے کا یہ واقعہ خود سائنس میں، اس کے بعد کے دَور میں، پیش آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس اعتبار سے سائنس کے دو دَور ہیں۔ ایک دَور البرٹ آئن

سٹائن (وفات 1955) سے پہلے کا ہے اور دوسرا، البرٹ آئن سٹائن کے بعد کا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نیوٹن سے لے کر آئن سٹائن تک سائنس کی تحقیق اُس دنیا تک محدود تھی جس کو عالمِ کبیر (macroworld) کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا کی تمام چیزیں اپنے آخری تجزیے میں ایٹم کا مجموعہ ہیں۔ اور ایٹم ایک ایسی چیز ہے جس کو تولا اور ناپا جا سکتا ہے۔

اس بنا پر اُس دَور میں یہ نظریہ بنا کہ حقیقی وجود صرف اسی چیز کا ہے جو تَولی اور ناپی جا سکے۔ جو چیز تَول اور ناپ میں نہ آئے اس کا کوئی حقیقی وجود بھی نہیں۔

مگر آئن سٹائن کے زمانے میں ایک انقلابی واقعہ پیش آیا۔ اس زمانے میں یہ ہوا کہ انسانی علم میکرو ورلڈ (macroworld) سے گزر کر مائکرو ورلڈ (microworld) تک پہنچ گیا۔ اب معلوم ہوا کہ ایٹم ہماری دنیا کا آخری ذرہ نہیں۔ خود ایٹم بھی ایک مجموعہ ہے، جو الکٹران اور پروٹان کے ملنے سے بنا ہے۔ مگر تحقیق نے بتایا کہ الکٹران، ایٹم کی طرح کوئی مادّی ذرّہ نہیں، بلکہ الکٹران غیر مرئی لہروں (waves) کا نام ہے۔ ان لہروں کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ ان کے بارے میں صرف یہ ممکن ہے کہ بالواسطہ اثرات کے ذریعے اُن کے وجود کے بارے میں کچھ اندازے قائم کیے جا سکیں۔

ایٹم کا لہروں میں تبدیل ہو جانا، سائنس میں ایک بے حد اہم واقعہ تھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ استنباط (inference) کو ایک ٹھوس علمی بنیاد حاصل ہوگئی۔ اب یہ مان لیا گیا:

Inferential argument is as valid as direct argument.

منطق میں اس تبدیلی نے سائنس کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ آئن سٹائن سے پہلے تک یہ کہا جاتا تھا کہ مذہب میں صرف سکنڈری آرگومنٹ (secondary argument) ممکن ہے۔ مذہب میں پرائمری آرگومنٹ (primary argument) ممکن نہیں۔ چوں کہ مذہب یا اسلام کے عقائد پر تمام استدلالات استنباطی نوعیت کے ہوتے ہیں، اور مذکورہ تقسیم میں استنباط ایک سکنڈری استدلال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے مذہب کو ان علوم میں شامل کر لیا گیا تھا جن کو (speculative) سائنسیز کہا جاتا ہے۔

مگر ایٹم کے ٹوٹنے کے بعد جب منطق میں تبدیلی آئی اور استنباطی استدلال کو عین سائنسی استدلال کا درجہ مل گیا تو اس کے بعد مذہب یا اسلام کی علمی بنیاد میں بھی تبدیلی آ گئی۔ اب مذہبی یا استنباطی استدلال کے طریقے کو پرائمری استدلال کا درجہ حاصل ہو گیا، جب کہ اس سے پہلے اس کو صرف سکنڈری استدلال کا درجہ ملا ہوا تھا۔

اب خود علمِ انسانی میں نئے واقعات پیش آنے لگے۔ مثال کے طور پر سائنس کے دورِ اوّل کے ذہن کو لے کر برطانیہ کے جولین ہکسلے (وفات 1975) نے ایک کتاب لکھی، جس میں دکھایا گیا تھا کہ اب انسان کو خدا کی ضرورت نہیں، اب انسان خود ہی اپنا سب کچھ بَن سکتا ہے۔ اس کتاب کا ٹائٹل یہ تھا:

Man Stands Alone by Julian Huxley (1941)

اس کے بعد امریکا کے ڈاکٹر کریسی ماریسن (وفات 1951) نے ایک اور کتاب چھاپی، جس میں سائنسی حقائق کی روشنی میں دکھایا گیا تھا کہ انسان صرف مخلوق ہے، وہ خدا کا درجہ نہیں لے سکتا۔ اس دوسری کتاب کا ٹائٹل یہ تھا:

Man Does Not Stand Alone by A. Cressy Morrison (1944)

اسی طرح برٹرینڈ رسل (وفات 1975) نے اپنی کتاب: Why I am not a Christian میں لکھا کہ آرگومنٹ فرام ڈزائن (argument from design) خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے ایک سائنٹفک استدلال ہے۔ مگر ڈارونزم نے اس استدلال کو ڈیسٹرائے کر دیا ہے۔ اس کے جواب میں پروفیسر لُن (Arnold Henry Moore Lunn, 1888-1974) نے ایک کتاب لکھی، جس کا نام تھا: The Revolt Against Reason۔ اِس کتاب میں دکھایا گیا تھا کہ ڈارونزم خود ایک غیر ثابت شدہ نظریہ ہے۔ پھر وہ آرگومنٹ فرام ڈزائن کے ثابت شدہ نظریے کو کیسے ڈیسٹرائے کر سکتا ہے۔

علمِ انسانی میں اس تبدیلی کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ اب مذہب اور سائنس کی دوری ختم

ہو رہی ہے۔ دونوں ہی علم کے یکساں پہلو ہیں۔ سائنس کے اس دوسرے دَور میں بہت سے اعلیٰ ذہن اُبھرے، جنہوں نے جدید حقائق کو لے کر بتایا کہ مذہبی صداقتیں اتنی ہی حقیقی ہیں، جتنا کہ مادّی صداقتیں۔

قدیم نیوٹانین دَور کو پہلا دھکّا اس وقت لگا جب کہ یہ ثابت ہوا کہ روشنی کے بارے میں نیوٹن کی مادی تعبیر (corpuscular theory of light) درست نہ تھی۔ نیوٹن کے نظریے کی غلطی پہلی بار اس وقت ظاہر ہوئی جب علماء نے روشنی کی مادّی تشریح کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش انہیں ایتھر (ether) کے عقیدے تک لے گئی، جو بالکل مجہول اور غیر ثابت شدہ عنصر تھا۔ کچھ نسلوں تک یہ عجیب وغریب عقیدہ چلتا رہا۔ روشنی کی مادّی تعبیر ثابت کرنے کے لیے زبردست کوششیں کی گئیں۔

لیکن میکسویل (Maxwell) کے تجربات کی اشاعت کے بعد یہ مشکل ناقابل عبور نظر آنے لگی۔ کیوں کہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ روشنی ایک برقی مقناطیسی مظہر (electromagnetic phenomenon) ہے۔ یہ خلا بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ دن آیا جب علمائے سائنس پر واضح ہوا کہ نیوٹن کے نظریات میں کوئی چیز مقدس نہیں۔ بہت دنوں کے تذبذب اور بجلی کو مادی (mechanical) ثابت کرنے کی آخری کوششوں کے بعد بالآخر بجلی کو ناقابل تحویل عناصر (irreducible elements) کی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے۔ مگر در حقیقت یہ بہت معنی خیز فیصلہ ہے۔ نیوٹن کے تصور میں ہم کو سب کچھ اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کے مطابق ایک جسم کی کمیت اس کی مقدار مادہ تھی، طاقت کا مسئلہ حرکت سے سمجھ میں آجاتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح یقین کرلیا گیا تھا کہ ہم اس فطرت کو جانتے ہیں جس کے متعلق ہم کلام کر رہے ہیں۔ مگر بجلی کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس کی فطرت (nature) ایسی ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ اس کو معلوم اصطلاحوں میں تعبیر کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں۔ وہ سب کچھ جو ہم بجلی کے متعلق جانتے ہیں وہ

صرف وہ طریقہ ہے جس سے وہ ہمارے پیمائشی آلات کو متاثر کرتی ہے — اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات کس قدر اہم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے وجود (entity) کو طبیعیات میں تسلیم کرلیا گیا جس کے متعلق ہم اس کے ریاضیاتی ڈھانچے کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔

اس کے بعد اس نہج پر اس قسم کے اور بھی وجود تسلیم کئے گئے۔ اور یہ مان لیا گیا کہ یہ لامعلوم ہستیاں بھی سائنسی نظریات کے بنانے میں وہی حصہ ادا کرتی ہیں جو قدیم معلوم مادہ ادا کرتا تھا۔ یہ حقیقت قرار پا گیا کہ جہاں تک علم طبیعات کا تعلق ہے، ہم کسی چیز کے اصلی وجود کو نہیں جان سکتے۔ بلکہ صرف اس کے ریاضیاتی ڈھانچے (mathematical structure) کو جاننے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اب اعلیٰ ترین سطح پر یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ ہمارا یہ خیال کہ ہم اشیاء کو ان کی آخری صورت میں دیکھ سکتے ہیں، محض فریب تھا۔ نہ صرف یہ کہ ہم نے دیکھا نہیں ہے بلکہ ہم اسے دیکھ بھی نہیں سکتے۔

پروفیسر اڈنگٹن (Eddington) کے نزدیک ریاضیاتی ڈھانچہ کا علم ہی وہ واحد علم ہے جو طبیعیاتی سائنس ہمیں دے سکتی ہے۔

> ”جمالیاتی، اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے قطع نظر، کمیت مادہ، جوہر، وسعت اور مدت وغیرہ، جو خالص طبیعیات کے دائرے کی چیزیں سمجھی جاتی ہیں، ان کی کیفیت کو جاننا بھی ہمارے لیے ویسا ہی مشکل ہو گیا ہے جیسے غیر مادی چیزوں کی حقیقت کو جاننا۔ موجودہ طبیعیات اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں سے براہ راست واقف ہو سکے۔ ان کی حقیقت ادراک سے باہر ہے۔ ہم ذہنی خاکوں کی مدد سے اندازہ کرتے ہیں۔ مگر ذہن کا کوئی عکس ایک ایسی چیز کی بعینہٖ نقل نہیں ہو سکتا جو خود ذہن کے اندر موجود نہ ہو۔ اس طرح اپنے حقیقی طریق مطالعہ کے اعتبار سے طبیعیات ان خارج از ادراک خصوصیتوں کا مطالعہ نہیں کرتی بلکہ وہ صرف مطالعہ برآلہ (pointer-reading) ہے جو ہمارے علم میں آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ مطالعہ عمل کائنات کی بعض خصوصیات کو منعکس کرتا ہے، مگر ہماری اصل معلومات آلاتی مطالعہ سے متعلق ہیں نہ کہ وہ خصوصیات

کے بارے میں ہیں۔ آلاتی مطالعہ کو اشیاء کی حقیقی خصوصیات سے وہی نسبت ہے جو ٹیلی فون نمبر کو اس شخص سے جس کا وہ فون نمبر ہے"۔

The Domain of Physical Science - *Essay in Science, Religion and Reality.*

یہ واقعہ کہ سائنس صرف ڈھانچہ کی معلومات تک محدود ہے، بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت ابھی پورے طور پر معلوم شدہ نہیں ہے۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہمارے احساسات یا خدا سے اتصال کا عارفانہ تجربہ اپنا کوئی خارجی جواب (objective counterpart) نہیں رکھتا۔ یہ قطعی ممکن ہے کہ ایسا کوئی جواب خارج میں موجود ہو۔ ہمارے مذہبی اور جمالیاتی احساسات اب محض مظاہر فریب (illusory phenomenon) نہیں کہے جاسکتے جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا تھا۔ نئی سائنسی دنیا میں مذہبی عارف بھی ایک حقیقت کے طور پر رہ سکتا ہے۔

The Limitations of Science, pp. 138-42

سائنٹفک فلاسفہ نے اس قسم کی تشریحات شروع کردی ہیں۔ مارٹن وائٹ (Morton White) کے الفاظ میں — بیسویں صدی میں فلسفیانہ ذہن رکھنے والے سائنس دانوں نے ایک نئی جنگ (Crusade) کا آغاز کردیا ہے۔ جس میں وہائٹ ہیڈ، ایڈنگٹن اور جینز کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "ان علماء کا فکر صریح طور پر کائنات کی مادی تعبیر کی نفی کرتا ہے۔ مگر ان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے خود جدید طبیعیات اور ریاضیات کے نتائج کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں وہی الفاظ صحیح ہیں جو مارٹن وائٹ نے وائٹ ہیڈ کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ ایک بلند ہمت مفکر ہے جس نے مادہ پرستی کے شیروں کو عین ان کے بھٹ میں للکارا ہے۔

He is a heroic thinker who tries to beard the lions of intellectualism, materialism, and positivism in their own bristling den. (*The Age of Analysis*, 1970, pp. 84)

یہ ایک عظیم تبدیلی ہے جو پچھلی نصف صدی کے دوران میں سائنس کے اندر ہوئی ہے۔ اس تبدیلی کا اہم ترین پہلو، جے. ڈبلیو. این. سولیون کے الفاظ میں یہ نہیں ہے کہ تمدنی ترقی کے لیے زیادہ طاقت حاصل ہوگئی ہے۔ بلکہ یہ تبدیلی وہ ہے جو اس کی مابعدالطبیعیاتی بنیادوں (Metaphysical Foundation) میں واقع ہوتی ہے۔

The Limitations of Science, pp. 138-50

برطانیہ کے مشہور ماہر فلکیات اور ریاضی داں سر جیمز جینز (Sir James Jeans) کی کتاب "پراسرار کائنات" غالباً اس پہلو سے موجودہ زمانے کا سب سے زیادہ قیمتی مواد ہے۔ اس کتاب میں موصوف خالص سائنسی بحث کے ذریعہ اس نتیجے تک پہنچتے ہیں:

"جدید طبیعیات کی روشنی میں کائنات مادی تشریح (material representation) کو قبول نہیں کرتی۔ اور اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اب وہ محض ایک ذہنی تصور (mental concept) ہو کر رہ گئی ہے۔"

The Mysterious Universe, 1948, p. 123

جینز کے الفاظ میں:

> If the universe is a universe of thought, then its creation must have been an act of thought. (pp. 133-34)

یعنی جب کائنات ایک تصوراتی کائنات ہے تو اس کی تخلیق بھی ایک تصوراتی عمل سے ہونی چاہئے۔ وہ کہتا ہے کہ مادہ کو امواج برق سے تعبیر کرنے کا جدید نظریہ انسانی تخیل کے لیے بالکل ناقابل ادراک ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ لہریں محض امکان کی لہریں (waves of probability) ہوں جن کا کوئی وجود نہ ہو— یہ اور اس طرح کے دوسرے وجود سے سر جیمز جینز اس نتیجے تک پہنچا ہے کہ کائنات کی حقیقت مادہ نہیں، بلکہ تصور ہے۔ یہ تصور کہاں واقع ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایک عظیم کائناتی ریاضی داں (mathematical thinker) کے ذہن میں ہے۔ کیونکہ اس کا ڈھانچہ، جو ہمارے علم میں

آتا ہے، وہ مکمل طور پر ریاضیاتی ڈھانچہ ہے۔ یہاں میں اس کا ایک اقتباس نقل کروں گا:

”یہ کہنا صحیح ہوگا کہ علم کا دریا پچھلے چند سالوں میں ایک نئے رخ پر مڑا ہے۔ تیس سال پہلے ہم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہم ایک ایسی حقیقت کے سامنے ہیں جو اپنی نوعیت میں مشینی (mechanical) قسم کی ہے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ کائنات ایٹموں کے ایک ایسے بے ترتیب انبار پر مشتمل ہے جو اتفاقی طور پر اکٹھا ہو گئے ہیں اور جن کا کام یہ ہے کہ بے مقصد اور اندھی طاقتوں کے عمل کے تحت، جو کوئی شعور نہیں رکھتیں، کچھ زمانے کے لیے بے معنی رقص کریں جس کے ختم ہونے پر محض ایک مردہ کائنات باقی رہ جائے۔ اس خالص میکانکی دنیا میں، مذکورہ بالا اندھی طاقتوں کے عمل کے دوران میں، زندگی محض اتفاق سے وجود میں آ گئی۔ کائنات کا ایک بہت ہی چھوٹا گوشہ یا امکان کے طور پر اس طرح کے کئی گوشے کچھ عرصے کے لیے اتفاقی طور پر ذی شعور ہو گئے ہیں اور یہ بھی ایک بے روح دنیا کو چھوڑ کر بالآخر ایک روز ختم ہو جائیں گے۔ آج ایسے قوی دلائل موجود ہیں جو طبیعی سائنس کو یہ ماننے پر مجبور کرتے ہیں کہ علم کا دریا ایک غیر مشینی حقیقت (non-mechanical reality) کی طرف چلا جا رہا ہے۔ کائنات ایک بہت بڑی مشین کے بجائے ایک بہت بڑے خیال (great thought) سے زیادہ مشابہ معلوم ہوتی ہے۔ ذہن (mind) اتفاقاً محض اجنبی کی حیثیت سے اس مادی دنیا میں وارد نہیں ہو گیا ہے۔ اب ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ رہے ہیں کہ ذہن کا عالم مادی کے خالق اور حکمراں کی حیثیت سے استقبال کریں۔ یہ ذہن بلاشبہ ہمارے شخصی ذہن کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ ایسا ذہن ہے جس نے مادی ایٹم سے انسانی دماغ کی تخلیق کی۔ اور یہ سب کچھ ایک اسکیم کی شکل میں پہلے سے اس کے ذہن میں موجود تھا۔ جدید علم ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم دنیا کے بارے میں اپنے خیالات پر نظر ثانی کریں جو ہم نے جلدی میں قائم کر لیے تھے — ہم نے دریافت کر لیا ہے کہ کائنات ایک منصوبہ ساز یا حکمراں (designing or controlling power) کی شہادت دے رہی ہے جو ہمارے شخصی ذہن سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ جذبات و

احساسات کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس طرز پر سوچنے کے اعتبار سے جس کو ہم ریاضیاتی ذہن (Mathematical Mind) کے الفاظ میں ادا کرسکتے ہیں"۔

The Mysterious Universe, pp. 136-38

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں مذکورہ کام جو ہو رہا تھا، اس کو ایک لفظ میں، spiritualization of science کہا جا سکتا ہے۔ یہ کام اس وقت اعلیٰ ترین سائنسی دماغ کررہے تھے۔ مثلاً وائٹ ہیڈ، سر آرتھر اڈنگٹن اور سر جیمز جینز، وغیرہ۔ مگر بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے اعلیٰ دماغ دوبارہ اِس علمی تحریک کو نہ مل سکے، جس کو ہم نے اسپریچولائزیشن آف سائنس کا نام دیا ہے۔

اس کا سبب غالباً عالمی سماج میں وہ نیا ظاہرہ تھا جس کو کنزیومرزم کہا جاتا ہے۔ کنزیومرزم کی غیر معمولی مقبولیت نے صرف ان چیزوں کو اہمیت دے دی جو تجارتی اہمیت رکھتی (marketable) تھیں۔ مذکورہ عمل تھیرٹیکل سائنس سے تعلق رکھتا تھا۔ اور تھیوریٹکل سائنس میں کمرشیل ویلوز یادہ نہیں ہوتی۔ اس لیے تمام اعلیٰ دماغ ٹکنکل سائنس کے شعبوں میں کام کرنے لگے۔ کیوں کے تمام بڑے بڑے اقتصادی فائدے سائنس کے ٹکنکل شعبوں سے متعلق ہو گئے تھے۔ اس طرح تھیریٹکل سائنس میں ریسرچ کا کام اپنی آخری تکمیل تک پہونچنے سے پہلے رُک گیا۔ اب ضرورت تھی کے بڑے بڑے مذہبی دماغ اس کام میں لگیں اور اس کو اس کی آخری تکمیل تک پہونچائیں۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا۔ مذہبی حلقے میں اعلیٰ دماغ موجود تھے۔ مگر وہ اِس اصل کام کو چھوڑ کر دوسرے کاموں میں لگ گئے۔

جدید تہذیب کے ظہور کے بعد اہلِ مذاہب کے لیے یہ نیا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا کہ لوگ جدید تعلیم اور جدید افکار سے متاثر ہو کر مذہب کے روایتی عقیدے پر شک کرنے لگے تھے۔ چنانچہ تمام بڑے بڑے مذہبی دماغ اس کے دفاع میں لگ گئے۔ ہندوؤں میں اس زمانے میں بڑے بڑے دماغ پیدا ہوئے مثلاً ڈاکٹر رادھا کرشنن (وفات 1975)، وغیرہ۔ مگر یہ لوگ

ہندو مذہب کی مائتھالوجی کے حق میں بطور خود ریشنل پروف فراہم کرنے میں مصروف ہوگئے۔ اسی طرح عیسائیوں میں بڑے بڑے دماغ پیدا ہوئے۔ مثلاً ڈاکٹر بلی گراہم، وغیرہ۔ ان لوگوں نے بھی یہی کیا کہ عیسائیت کے روایتی عقائد، تثلیث اور کفّارہ وغیرہ کو بطور خود عقلی بنیاد فراہم کرنے میں مصروف ہوگئے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے یہاں بھی اسی زمانے میں بڑے بڑے دماغ پیدا ہوئے مثلاً سید جمال الدین افغانی، وغیرہ۔ مگر مسلم اہلِ دماغ ایک اور غلطی میں مبتلا ہو گئے۔ عین اسی زمانے میں یہ ہوا کہ مسلمانوں کو سیاسی زوال پیش آ گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کے تمام اعلیٰ دماغ پولیٹیکل محاذ پر مصروف ہوگئے۔ کچھ افراد نے پولیٹیکل لڑائی کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ کچھ اور افراد نے اسلام کو پولیٹیکل انٹرپریٹیشن دینے کو سب سے بڑا کام سمجھ لیا۔ اس طرح یہ ہوا کہ مسلم اہلِ دماغ سیاست کے جنگل میں کھو گئے۔ وہ مذکورہ عمل کو آگے بڑھانے میں ناکام رہے۔

یہ حقیقت ہے کہ موجودہ زمانے میں سب سے بڑا کام اعلائے کلمۂ اسلام کا ہے۔ مگر اس کام کے لیے نہ تو مسلّح جہاد کی ضرورت ہے اور نہ اسلام کو پولیٹیکل ثابت کرنے سے اسلام میں کوئی پیش رفت ہوسکتی ہے۔ اس قسم کی تدبیروں کے غلط ہونے کے لیے یہی کافی ثبوت ہے کہ دوسو سال تک مسلمانوں کی کئی جنریشن ان راہوں میں قربانی دیتی رہی مگر اصل مطلوب مقصد ایک فیصد بھی حاصل نہ ہوسکا۔

اِس پہلو سے موجودہ زمانے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسلام نے اپنے حق میں انسانی علم کی بنیاد کھودی ہے۔ یہ علمی بنیاد دوبارہ اس طرح فراہم ہوسکتی ہے کہ اُس عمل کو آخری تکمیل تک پہنچایا جائے، جس کو ہم نے اسپریچویلائزیشن آف سائنس کہا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے اعلیٰ دماغ اس کام میں اپنے آپ کو وقف کریں۔ آج اصل ضرورت یہ ہے کہ مثبت تعمیر کا کام کیا جائے۔ خاص طور پر علمی اور سائنسی تعمیر۔

قرآن میں یہ خبر دی گئی ہے کہ خدا نے انسان کو دنیا کی تمام چیزوں کا علم دے دیا: وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (البقرۃ، 2:31)۔ انسانی برین کے بارے میں جدید دریافت گویا اس آیت کی تفسیر ہے۔ جدید دریافت بتاتی ہے کہ ہر انسانی برین میں بے شمار پارٹکلس ہوتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ایک سو میلین، بلین بلین سے زیادہ پارٹکل۔ یہ کوئی سَینڈ پارٹکل کے مانند نہیں، بلکہ وہ انفارمیشن پارٹکل ہیں۔ ان پارٹکل کے ذریعے گویا خدا نے ہر قسم کی معلومات کو انسانی دماغ میں فیڈ کر دیا ہے۔ ان پارٹکل میں فزکل معلومات بھی ہیں اور اسپریچول معلومات بھی۔

موجودہ زمانے میں سائنس دانوں نے کائنات کو دریافت کر کے بے شمار چیزیں بنائی ہیں۔ یہ دریافتیں دراصل دریافتیں نہیں ہیں بلکہ وہ انسانی دماغ میں پہلے سے موجود انھیں انفارمیشن پارٹکلس کی اَن فولڈنگ ہیں۔ اس طرح انسان نے بہت بڑی مقدار میں اپنے دماغ میں فیڈ کی ہوئی فزیکل معلومات کو ان فولڈ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

مگر جہاں تک دماغ میں فیڈ کی ہوئی اسپریچول انفارمیشن کا تعلق ہے اس کا بڑا حصہ ابھی تک اَن فولڈ نہ ہوسکا۔ دماغ میں فیڈ کی ہوئی اسپریچول انفارمیشن کو اَن فولڈ کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلم اہلِ دماغ کو یہی کام کرنا ہے۔ یہی وہ کام ہے جس کو انجام دینے پر اعلائے کلمۂ اسلام کا دروازہ ان کے لیے کھُلے گا۔ (الرسالہ، اگست 2016)

علما اور دینی مدارِس

دورِ اول کے مسلمان جب دنیا میں پھیلے تو ہر جگہ انھوں نے علمی مراکز اور مدارس قائم کیے۔ یہ مزاج انہیں اپنے دین سے ملا تھا۔ مسلمانوں نے اس کلچر کو روایتی دور میں بھی پروان چڑھایا اور جدید دور میں بھی وہ اسے آگے بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ماضی میں یہ کوششیں کامیاب تھیں، مگر آج جدید سائنسی ترقی کی وجہ سے پرانا نظام غیر مؤثر ہو چکا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیمات کو عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ زیرِ نظر کتاب مدارس اور علما کو انہی جدید چیلنجز کو سمجھنے کی دعوت دیتی ہے۔

PDF

BUY

ISBN 978-9347638-26-8

9 789347 638268

Goodword Books
CPS International